تعلیم و تہذیب

مجموعۂ خطبات و مقالات

از

پروفیسر حمید احمد خاں

☆

مجلسِ ترقیِ ادب ۰ لاہور

تعلیم و تہذیب

مجموعۂ خطبات و مقالات

از

پروفیسر حمید احمد خاں

☆

مجلسِ ترقیِ ادب ۔ لاہور

طبع اول : مارچ ۱۹۷۵ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ - ریلوے روڈ ، لاہور

قیمت : ۲۰ روپے

اپنے ہزاروں عزیز طلبہ کے نام

جن کی محبّت و رفاقت نے میرے زمانۂ تدریس کو ایک انعامِ عظیم بنا دیا

ان میں سے بعض مجھ سے پہلے اِس خاکداں سے نکل گئے، اُن پر سلام

مگر اکثر بفضلِ خدا زندہ و سلامت اور خدمتِ مُلک و قوم میں مصروف ہیں، اُن کو بھی سلام

پیش لفظ

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے خود نوشت دیباچے کا یہ آخری فقرہ، زندگی کے المیے کا کتنا کرب ناک اظہار بن گیا ہے کہ:

"... کیا خبر تھی کہ اِس مجموعے کی تالیف کے ساتھ
اِس کی اشاعت بھی میرے ہی لیے مقدّر ہو چکی ہے۔"

اور آج جب یہ مجموعہ اشاعت پذیر ہو رہا ہے، خاں صاحب مرحوم اِس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اِس کتاب کی اشاعت کا کام اُنھی کے ہاتھوں تکمیل پاتا مگر قدرت کے فیصلے کتنے اٹل ہوتے ہیں اور انسان، اپنی ترقّی یافتگی کے باوجود، موت کے سامنے ابھی تک کتنا بے بس ہے!

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے ہمہ جہت علمی و ادبی کارناموں کے بلند معیار، اُن کی کد و کاوش اور اِس سلسلے میں اُن کی حیرت انگیز استقامت کی ایک دنیا معترف ہے۔ اس کا بنیادی سبب، بظاہر، یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادیب کے علاوہ معلّم بھی تھے اور اپنے معلّم ہونے پر اُنھیں بجا طور پر فخر بھی تھا۔ چنانچہ اِس مجموعے کے تمام مضامین، مرحوم کی اِن دونوں اہم حیثیتوں کے گہرے اشتراک کا نتیجہ ہیں

ہمارے ہاں، شاید سالہا سال کے غیر ملکی اثرات کے تحت، نظامِ تعلیم کو عملاً مجرّد حیثیت دی جاتی رہی ہے، حالانکہ کسی ملک کے نظامِ تعلیم کا جو مضبوط رشتہ اُس ملک کے نظامِ تہذیب سے ہوتا ہے، اُسے وہی لوگ نظرانداز کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں جو یا تو تعلیم کے منصب کو نہیں سمجھتے، اور یا وہ اپنے نظامِ تہذیب سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے اور یوں اپنے ملک کے تعلیمی نظام کو دوسرے ملکوں کے تہذیبی نظاموں کا محکوم بنا کر تعلیم کی افادیت

کی نفی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ اِن مضامین میں خاں صاحب مرحوم نے نظامِ تعلیم اور نظامِ تہذیب کے اِنھی رشتوں کی وضاحت فرمائی ہے اور اپنے حقیقت پسندانہ طرزِ استدلال سے ثابت کر دیا ہے کہ جب تک ہم اپنا نظامِ تعلیم، اپنے نظامِ تہذیب کے پس منظر میں مرتّب نہیں کرتے، تعلیم کے سلسلے میں ہمارے سب دعوے ہوائی ثابت ہوتے رہیں گے۔

یہ مضامین بیشتر خطبات کی صورت میں ہیں اور ان خطبات میں مصنّف کے مخاطبین، تعلیم و تہذیب کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے عناصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تنّوع ہے، بوقلمونی ہے اور وہ سب کچھ ہے جو اس نوعیّت کی سنجیدہ علمی نگارشات کو قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔ انھوں نے تعلیم سے متعلق ہر ممکن مسئلے پر اظہارِ رائے کیا ہے۔ طلبہ و اساتذہ کے باہمی روابط سے لے کر نوکر شاہی ذہنیّت کی مذمّت تک ـــ کتنے ہی موضوعات اِن صفحات میں سمٹ آئے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہماری تعلیم و تہذیب پر غیر ملکی سامراج کی سفّاک گرفت تک کو نہیں بخشا گیا۔ اِس ضمن میں یاد رہے کہ اس برطانوی گرفت کے خلاف دیانت دارانہ احتجاج برطانوی عہدِ حکومت ہی میں کیا گیا ہے۔ خاں صاحب مرحوم کی حوصلہ مندی اور اصول پرستی کی متعدّد مثالوں میں یہ ایک اہم مثال ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے اِن مضامین و خطبات کو مجموعے کی صورت میں پیش کرنا مجلسِ ترقّیٔ ادب کا اعزاز ہے اور ہم پورے فخر کے ساتھ یہ کتاب پاکستان کے تعلیمی و تہذیبی مستقبل کی نذر کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

ناظم، مجلسِ ترقّیٔ ادب

۳۱ مارچ ۱۹۷۵ع

فہرست

☆ ☆ ☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

میری زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تدریس سے متعلّقہ مشاغل میں گزرا ہے۔ چنانچہ گزشتہ پینتیس برس میں مجھے تحریر و تقریر کے ذریعے سے اُن متفرّق مسائل پر اظہارِ خیال کا موقع ملتا رہا جو اِس دوران میں ہمارے اساتذہ و طلبہ کے لیے وقتاً فوقتاً مرکزِ توجّہ بنے۔ یہ کتاب اِسی زمانے کی دستیاب تحریروں اور تقریروں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ تعلیمی مسائل پر میں نے بہ اقتضاے حالات اُردو کے علاوہ بارہا انگریزی میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا لیکن انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین اِس مجموعے میں شامل نہیں کیے گئے۔

ایک صورت یوں ہو سکتی تھی کہ یہ خطبات و مقالات موضوعِ کلام کا لحاظ کر کے مرتّب کیے جاتے۔ میں نے اس کے بجائے اِن کی ترتیبِ زمانی کو ملحوظ رکھّا ہے۔ چنانچہ تقریباً ہر عنوان کے نیچے مختصر تمہیدی اشارات اِس وضاحت کے لیے دے دیے ہیں کہ زیرِ نظر مضمون کب اور کس تقریب کے لیے لکّھا گیا۔ اس طریقِ کار سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری تہذیبی تاریخ کے گزشتہ ہنگامہ خیز پینتیس برس کے مسائل و معاملات اپنی وقتی خصوصیّات کی روشنی میں دیکھے جا سکیں گے۔ استقلالِ وطن سے پہلے اور بعد کے خیالات اِس طرح خود بخود ممیّز ہو گئے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس میں نے زمانۂ تقریر کی مناسبت سے اُس خاص وقت کا اندازِ کلام بھی برقرار رکّھا ہے، مثلاً

۱۹۴۴ میں دہلی سے ریڈیو کی تقریر میں گاندھی کو "مسٹر گاندھی" کہنے کا تکلّف برتا ہے، کہ وہ ابھی زندہ تھے، گو اِسی تقریر میں ٹیگور اور اقبال کا ذکر، دستورِ عام کے مطابق، کسی تعظیمی لقب کے بغیر ہوُا ہے۔

ظاہر ہے کہ ترتیبِ زمانی کے ملحوظ رہنے کی وجہ سے موضوعاتِ بحث الگ الگ مرتّب نہیں ہو سکے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی اس مجموعے کا ایک ہی باب ہماری تعلیمی یا تہذیبی زندگی کے متعدّد پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ ایسے ابواب کو خاص خاص موضوعات کے ماتحت تقسیم کرنا دشوار ہو جاتا۔ تاہم یہ پوری کتاب مصنّف کے متحد اور مربوط سلسلۂ افکار کی ترجمان ہے، اس لیے ضروری ہے کہ حوالے کے لیے قارئین کو ایک صحیح طور پر مرتّب فہرستِ موضوعات میسّر رہے۔ یہ ضرورت کتاب کے آخر میں ایک مفصّل اشاریے کے ذریعے سے پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تعلیم کے تمام متعلّقہ مباحث (نصابِ درس، طریقِ تدریس، ذریعۂ تعلیم، طریقِ امتحان، طالب علم اور اُستاد کا تعلّق وغیرہ) متن میں جہاں جہاں چھیڑے گئے ہیں، اُن کی صفحہ وار تفصیلات قارئین کو کتاب کے اشاریے میں ملیں گی۔ یہی پابندی تہذیب کے متضمنہ کوائف (تمدن سے امتیاز، دین یا سائنس سے تعلّق، زبان پر انحصار، نظامِ تعلیم کی ساخت سے رشتہ، وغیرہ) کو اشاریے میں صفحہ وار درج کرنے کے متعلّق ملحوظ رہی ہے۔ اس قسم کے مباحث کے علاوہ کہیں کہیں اشخاص (سقراط یا اقبال)، مقامات (ملتان یا ٹھٹّہ) اور درس گاہوں (جامعۂ عثمانیہ یا پنجاب یونیورسٹی) کے نام حسبِ موقع اشاریے میں درج ملیں گے۔

ممکن ہے کتاب کے بعض قارئین کو پینتیس برس کی اُس مدّت سے متعلّق، جس میں وقتاً فوقتاً یہ مضامین لکھے گئے، مصنّف کے

بارے میں کچھ سوانحی معلومات کی ضرورت محسوس ہو ۔ یہ معلومات ایک خاکے میں فراہم کر دی گئی ہیں جو اس دیباچے کے معاً بعد آتا ہے ۔

اس مجموعے کے مشمولہ مضامین میں سے تقریباً ہر ایک دراصل تقریر کی حیثیت سے قلم‌بند ہوا اِس لیے اندازِ خطاب موقع کی مناسبت سے سامعین کے کوائفِ ذہنی کے پیمانے میں ڈھلتا رہا ۔ مثلاً تقریر "مہذّب اور وحشی آدمی کا فرق" سادہ لفظوں میں لکھّی گئی ہے مگر سائنٹفک سوسائٹی کا خطبۂ صدارت قدرۃً ویسا ہلکا پُھلکا نہیں ہے جیسا تہذیب اور بربریّت کے فرق کا بیان ۔ پہلے مقالے میں عام سامعین سے خطاب تھا مگر دوسرے میں ملک کے اہلِ علم اور بالخصوص سائنس‌داں مخاطَب تھے ۔ زبان و بیان کے اِس ہنگامی آثار چڑھاؤ سے قطعِ نظر ، یہ بنیادی حقیقت کہ کسی قوم کا نظامِ تعلیم اُس کے نظامِ تہذیب سے منفصل نہیں ہوتا ، کتاب کے ہر باب کی روح و رواں ہے ۔

میں نے اِن ابواب میں شروع سے آخر تک اِس دعوے پر اصرار کیا ہے کہ کسی صحت مند نظامِ تعلیم میں قومی زبان کے سوا اور کوئی زبان ذریعۂ تدریس و امتحان نہیں ہو سکتی ۔ میرے اِس اصرار میں میرا یہ دعویٰ بھی ایک اصولِ موضوعہ کے طور پر شامل ہے کہ ہر قوم کا نظامِ تہذیب و تمدّن ایک ترقیّ یافتہ قومی زبان کے سہارے قائم ہوتا اور زندہ رہتا ہے ۔ دراصل تعلیم ، تہذیب اور تمدّن کا شجرۂ نسب ایک ہے اور اِن تینوں میں (علاوہ دوسرے ارکان کے) زبان ایک قدرِ مشترک کی حیثیّت رکھتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قومی تعلیم ، قومی تہذیب اور قومی تمدّن کی تعمیر کسی قومی زبان ہی کی بنیاد پر ممکن ہوتی ہے ۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ زبان کا واسطہ صرف تخلیقِ شعر و ادب

سے ہے - اس لیے بعض حضرات کبھی کبھی یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ قومی زبان کو معاشرتی علوم کی تدریس کا ذریعہ تو ہونا چاہیے مگر جدید سائنس کے لیے اس کا ذریعۂ تعلیم ہونا ضروری نہیں - ذرا سا غور کیجیے تو صاف ظاہر ہوگا کہ زبان کا تعلّق ادب سے بھی ہے اور سائنس سے بھی - ہم الفاظ کی مدد سے متخیّلہ کے تصوّرات ہی نہیں بُنتے ، اپنے فکرِ طبیعی کے تعقّلات بھی لفظوں ہی کی بنیاد پر قائم کرتے ہیں ، گو اِس کوشش میں جزوی طور پر اعداد و علامات سے بھی کام لیا جاتا ہے - لیکن یاد رہے کہ یہ اعداد و علامات اصلاً لفظوں ہی کی نمایندگی کرتے ہیں - یوں دیکھیے تو واضح ہو جائے گا کہ تعلیم کا پورا عمل زبان کے سہارے سر انجام پاتا ہے ، اور اِس قید سے نہ سائنس آزاد ہے نہ ادب -

اِس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ادب اور سائنس دونوں کو قوموں کی تہذیب و تمدّن سے گہرا تعلّق ہے - ادب سے تہذیب و تمدن دونوں کا (بالخصوص تہذیب کا) مزاج مقرّر ہوتا ہے - علیٰ ھذا القیاس سائنس پر بھی تہذیب و تمدّن دونوں کی (مگر بالخصوص تمدّن کی) وضع قطع منحصر ہوتی ہے - یہ کیفیّت اگر پیشِ نظر ہو تو تعلیم ، تہذیب اور تمدّن کا باہمی تعلّق اور زبان پر اِن تینوں کی ہیئت و طبیعت کا انحصار خود بخود ظاہر ہو جائے گا - میرے اِن خیالات کو محض نظریہ سازی قرار دینا صحیح نہ ہوگا - یہ تاریخِ بنی نوعِ انسان کے حقائقِ بیّنہ ہیں -

خاتمۂ کلام پر میں اپنے مرحوم دوست اور پیش رَو سیّد امتیاز علی تاج کو دلی تشکّر کے ساتھ یاد کرنا چاہتا ہوں - انھوں نے غالباً ۱۹۶۶ میں یہ تحریک کی تھی کہ میں اپنے تعلیمی خطبات مجلس ترقیٔ ادب کے لیے مرتّب کروں - جب میں نے عذر کیا کہ اِن خطبات میں کہیں کہیں ''دفتر شاہی'' سلسلے پر کڑی نکتہ چینی بھی کی

گئی ہے تو اُنھوں نے برجستہ کہا : ''مضائقہ نہیں ، ہم وہ سب کچھ شائع کریں گے !'' افسوس کہ اُس وقت یونیورسٹی میں میری شبانہ روز مصروفیت نے مجھے سیّدِ مرحوم کی فرمائش پوری کرنے کی مہلت نہ دی ۔ اب مجلسِ ترقیٔ ادب کے ایک فیصلے کے ماتحت یہ کتاب مجلس ہی کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہی ہے ، مگر کیا خبر تھی کہ اِس مجموعے کی تالیف کے ساتھ اس کی اشاعت بھی میرے ہی لیے مقدّر ہو چکی ہے ۔

حمید احمد خاں

لاہور

۱۸- اپریل ۱۹۷۲

مصنّف کے بارے میں متعلقہ سوانحی تفصیلات

- جنوری ۱۹۳۴ – اکتوبر ۱۹۴۴ :

لکچرار انگریزی ، اسلامیہ کالج ، لاہور

- اکتوبر ۱۹۴۴ – ۱۳ – اگست ۱۹۴۷ :

لکچرار انگریزی ، گورنمنٹ آف انڈیا دہلی پالی ٹکنک

- اکتوبر ۱۹۴۷ – جنوری ۱۹۴۸ :

لکچرار منسلک بہ وزارتِ تعلیمات ، حکومتِ پاکستان ، کراچی

- فروری ۱۹۴۸ – اگست ۱۹۶۳ :

پروفیسر و صدر شعبۂ انگریزی ، اسلامیہ کالج ، لاہور

- مئی ۱۹۵۸ – اگست ۱۹۶۳ :

پرنسپل ، اسلامیہ کالج ، لاہور

- ستمبر ۱۹۶۳ – فروری ۱۹۶۹ :

وائس چانسلر ، پنجاب یونیورسٹی

- جولائی ۱۹۶۹ – جولائی ۱۹۷۰ :

ایڈیشنل ڈائرکٹر ، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر ، لاہور

- جولائی ۱۹۷۰ – مارچ ۱۹۷۴ :

ناظمِ مجلسِ ترقّیٔ ادب ، لاہور

عثمانیہ یونیورسٹی

۱۹۳۵–۱۹۳۶ کے دوران میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی، نے برعظیم پاکستان و ہند کے مروّجہ طریقہ ہائے تعلیم پر تبصروں کا ایک سلسلہ نشر کیا۔ اس سلسلے میں ایک تبصرہ جامعۂ عثمانیہ پر تھا۔ مجھ سے فرمائش کی گئی کہ "عثمانیہ یونیورسٹی" کے موضوع پر اپنے خیالات قلم بند کروں اور دہلی آ کر مذکورہ سلسلۂ تقاریر میں حصہ لوں۔ لاہور میں اس وقت تک ریڈیو اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا۔

دہلی ریڈیو کے لیے "عثمانیہ یونیورسٹی" کے عنوان سے جو مضمون میں نے لکھا، اُس کا مسودہ سوء اتفاق سے میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ اصل مسودے میں قیامِ پاکستان کے بعد مختلف موقعوں پر حسبِ ضرورت اضافہ و ترمیم ہوتا رہا تھا۔ اب دست یاب متن میں قطع و برید کرکے اسے وہی صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے جس میں یہ دہلی ریڈیو سے نشر ہوا۔

میں خوش ہوں کہ آج شام مجھے عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق کچھ کہنے کا موقع دیا گیا ہے۔

آج سے پندرہ سال قبل جامعۂ عثمانیہ کا قیام ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں ایک مہتم بالشان واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُنیسویں صدی سے پہلے اہلِ ہند صدیوں تک اپنے علوم کی تحصیل اپنی زبانوں میں

کرتے رہے تھے - برطانوی تسلّط نے یہ صورتِ حال کلّیۃً بدل دی ، یعنی نہ صرف علوم کی نوعیّت بدلی بلکہ تحصیلِ علم کے ذرائع میں بھی ایک بنیادی انقلاب پیدا ہوا - اس میں کسی کو شاید ہی کلام ہو کہ علم کی دنیا میں نئے مضامین کا ظہور مجموعی طور پر ایک ترقی پسندانہ قدم تھا - لیکن برطانیہ کے لائے ہوئے تعلیمی انقلاب کا دوسرا حصہ ، یعنی جدید علوم کی تحصیل کے لیے تنہا انگریزی زبان کا استعمال ، طرح طرح کی ذہنی اُلجھنوں اور قومی پریشانیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا -

مکالے کی رسوائے عالم تعلیمی روداد سے پہلے بھی اور بعد بھی مغربی علوم کو اُردو میں منتقل کرنے کی چند کوششیں دہلی ، حیدر آباد اور لاہور میں متفرّق طور پر عمل میں آئیں - لیکن ان کوششوں کو تعلیم کی ابتدائی منزل سے آگے بڑھنے کا موقع نہ ملا - یہ شرف صرف حکومتِ حیدر آباد کے حصے میں آیا کہ اُس نے قومی زبان کو نہ صرف مدرسے میں بلکہ اعلیٰ ترین منازل پر بھی ذریعۂ تعلیم قرار دے کر وہ کام کر دکھایا جس کی تکمیل کے لیے اہلِ ہند ایک سو برس سے مضطرب تھے - عثمانیہ یونیورسٹی نے بی - ایس سی - اور ایم - ایس سی - کے علاوہ بی - ای - اور ایم - بی - بی - ایس - نیز ایل ایل - بی - اور ایل ایل - ایم - جیسی ڈگریوں کے لیے اُردو کو تدریس اور امتحان کا ذریعہ مقرّر کیا -

رائج الوقت نظامِ تعلیم میں یہ شرط کہ انگریزی زبان پر عبور حاصل کیے بغیر علم کی کتاب (پہلے باب کے بعد) ہمارے لیے بند رہے گی ، ایسی کڑی ہے کہ ہماری قوم کے بے شمار نوجوان اس پر پورے نہیں اُترتے - یہی وجہ ہے کہ علم سے اپنے دماغ روشن کرنے کے بجائے وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں - ڈرائنگ روم کی خوش آئند مگر بے معنی رسمیّات اور سکریٹریٹ کے

سکّہ بند ، خواہ بامعنی ، معاملات پر انگریزی میں گِٹ پِٹ کر لینا اور بات ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب علم کی منزل میں قدم رکھیں ، یعنی اُس منزل میں جہاں دل کی کُرید سے باریک نکتے پیدا ہوں اور دماغ کی چھان بین سے گہرے راز عقل کو ہاتھ آئیں ، اُس وقت اپنے مطلب کو صحیح لفظوں میں ادا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے -

ہمارے کالجوں میں طلبہ کو اپنے سبق رٹ لینے کی جو بُری ، مگر بحالاتِ موجودہ ضروری ، عادت ہے ، اُس میں انگریزی کے ذریعۂ تعلیم ہونے کو بڑا دخل ہے - ہمارے طلبہ کو لفظ نظر آتا ہے مگر لفظ کے پیچھے کوئی مفہوم نظر نہیں آتا اور اگر نظر آئے بھی تو دھندلا اور مسخ شدہ نظر آتا ہے - وہ اوّل تو انگریزی میں لکّھی ہوئی کتابوں کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکتے اور اگر کچھ سمجھ بھی جاتے ہیں تو اُنھیں یہ گھبراہٹ ضرور ہوتی ہے کہ خدا جانے امتحان کے موقع پر اظہارِ مطلب کے لیے اُن کے پاس صحیح الفاظ ہوں گے بھی یا نہیں - اِسی لیے اُن کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح درسی کتابوں کے الفاظ کو محفوظ کر لیں - تعلیم اگر اس مصنوعی طریقے سے نہ دی جائے تو طالب علم کے حافظے کے بجائے اس کے ذہن کو حرکت ہوتی ہے - وہ انگریزی الفاظ کو رٹنے کے بجائے اصل مضمون کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اُسے اِس بات میں کوئی حجاب نہیں ہوتا کہ اُستاد سے بار بار سوال کر کے مضمون کے ہر پہلو پر حاوی ہو جائے -

تعلیم اگر قومی زبان میں ہو تو اس سے ایک اور مفید نتیجہ بھی نکلتا ہے - بہترین تعلیم وہ ہے جس میں استاد صرف کتابوں میں لکّھی ہوئی معلومات شاگرد کے حوالے نہ کر دے ، بلکہ اپنی شخصیّت کے اُن پہلوؤں سے بھی ، جو قدر و قیمت رکھتے ہوں ، طالب علم کے دل و دماغ

کو متاثر کرے - جہاں غیر زبان کا پردہ استاد اور شاگرد کے درمیان حائل ہو ، وہاں یہ مقصد پوری طرح کبھی حاصل نہیں ہوتا - لیکن جہاں دونوں اپنی قومی زبان میں ایک دوسرے سے بات کر سکیں ، وہاں دوئی کا یہ گہرا پردہ درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور استاد کا فیض براہِ راست شاگرد تک پہنچتا ہے - جب تک دونوں اپنی زبان میں بات نہ کریں وہ ذاتی تعلّق ، جس کے ذریعے سے ایک روح دوسری روح کو دیکھتی ہے ، پیدا نہیں ہو سکتا - میں نے طالبِ علم کی حیثیت سے زندگی کے کچھ سال جامعۂ عثمانیہ میں بھی گزارے اور بی - اے - کی سند وہیں سے لی - میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ فلسفے کے مضمون میں میرے استاد مولانا عبد الباری صاحب ندوی اس روحانی تصرّف کا بہترین نمونہ تھے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے -

ہمارے موجودہ مصنوعی طریقِ تعلیم کی خرابیوں کو جانتے ہوئے بھی ہمارے ماہرانِ تعلیم سالہا سال تک ڈرتے رہے کہ قومی زبان میں تعلیم دینے کا "تجربہ" شاید کامیاب نہ ہو ، حالانکہ یہ وہ عمل ہے جسے ، بجز محکوم قوموں کے ، دنیا میں اور کسی نے کبھی "تجربے" کا نام دینے کا خیال تک نہیں کیا - سچ تو یہ ہے کہ ذہنی غلامی کے عالم میں قومی زبان کا استعمال ایک خطرناک مہم معلوم ہونے لگتا ہے - گزشتہ ساٹھ ستّر برس میں ہماری یونیورسٹیوں کی مصنوعی فضا میں تربیت پانے والوں کی مثال غیر فطری طور پر پالے ہوئے چھوٹے مینڈکوں کی تھی جو صرف غیر زبان کے بنے بنائے کوئیں میں چکّر کاٹ کر اپنے آپ کو محفوظ پاتے تھے ، لیکن قومی زبان کے بحرِ بے کراں کی زندگی بخش موجوں پر تیرنے اور ذہنی آزادی کی لامتناہی فضا میں سانس لینے کے تصوّر ہی سے ان کے ننھے ننھے دل کانپ جاتے تھے - کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے ۱۹۱۷ء میں اس عام تباہی کے خلاف فریاد کی جو رائج الوقت مصنوعی نظامِ تعلیم نے برپا کر رکھی تھی -

کمیشن کی رپورٹ میں سوال کیا گیا کہ آخر ہمارے طالب علم مدرسوں میں چھبیس گھنٹے فی ہفتہ کے حساب سے انگریزی زبان کیوں سیکھتے ہیں اور اِس عمل سے انہیں انجامِ کار کیا حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ممکن تھا جو کمیشن نے سُجھا تو دیا مگر اس جواب سے جو نتائج نکلنے چاہئیں تھے وہ برطانوی ہند میں کہیں بھی رونما نہ ہوئے۔

اِسی زمانے میں حسنِ اتفاق سے ریاست حیدر آباد کے اربابِ حل و عقد میں ایک چھوٹی سی تعداد ایسے لوگوں کی جمع ہو گئی جو صاحبِ اختیار ہونے کے ساتھ صاحبِ تدبیر بھی تھے۔ ان میں نواب حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) اور نواب مسعود جنگ (مسٹر راس مسعود) خاص طور پر ممتاز تھے۔ اِن اصحاب کو یقین تھا کہ اعلیٰ تعلیم کو ریاست میں عام کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انگریزی کے ناکام تجربے سے سبق سیکھ کر اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ میں سرکارِ نظام نے سر اکبر حیدری کی تاریخی عرضداشت کے جواب میں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیتے ہوئے جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے لیے باضابطہ فرمان جاری کردیا۔ یہ واضح رہے کہ ۱۹۱۷ تک اردو میں نہ تو جدید علوم و فنون پر کتابیں موجود تھیں اور نہ وہ اصطلاحات ہی دستیاب تھیں جن کی مدد سے مغربی علوم اعلیٰ سطح پر اردو زبان میں منتقل ہو سکتے۔ اِس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرکارِ نظام نے ایک سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جسے ابتدا ہی سے نہ صرف حیدر آباد دکن بلکہ پورے ملک کے منتخب اہلِ علم و فضل کی خدمات میسّر آ گئیں۔ دارالترجمہ نے ۱۹۱۸ میں کام شروع کر دیا اور ایک ہی برس گزرا تھا کہ اگست ۱۹۱۹ میں جامعۂ عثمانیہ کی سالِ اوّل کی جماعت کا داخلہ ہوا۔ ۱۹۲۳ میں جامعۂ عثمانیہ نے پہلی مرتبہ بی۔ اے۔ کی ڈگری عطا کی اور جامعہ

کے پہلے گریجویٹ جب مزید تعلیم کے لیے ہندوستان ، جرمنی اور انگلستان گئے تو انھوں نے ان سب ممالک کی یونیورسٹیوں سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ۔

جامعۂ عثمانیہ کی عظیم الشان کامیابی اتنی تھوڑی مدت میں کس طرح ممکن ہوسکی ؟

اوّل : انگریزی کو ایک لازمی مضمون (نہ کہ ذریعۂ تعلیم) رکھ کر جامعۂ عثمانیہ نے اپنی بہت سی ابتدائی مشکلات فوری طور پر حل کر لیں ۔ شروع میں چند سال تک تقریباً سبھی مضامین میں انگریزی کی درسی کتب حسبِ ضرورت استعمال کی گئیں ، لیکن پہلے دن سے تدریس کی زبان اردو تھی اور امتحان کی بھی ۔

دوم : بین الاقوامی اصطلاحات کو وسیع پیمانے پر اردو درس میں استعمال کیا گیا ۔ اردو میں ترجمہ صرف ان اصطلاحات کا کیا گیا جن سے ہر قوم اور ہر زبان بجا طور پر اپنے اپنے رنگ میں کام لے رہی ہے (مثلاً استقرا[۱] ، عالمِ مثال[۲] ، معادل[۳] ، وزنِ مخصوص[۴] ، برقیہ[۵]) ۔ بین الاقوامی علامات و اشارات بجنسہ قائم رہے اور ان کا استعمال اردو تحریر کے ٹکڑوں کے درمیان لاطینی رسم الخط میں جائز قرار دیا گیا ۔

اس قسم کے اصولی امور سے قطعِ نظر ، کاروباری معاملات کا اہتمام بڑے سلیقے کے ساتھ کیا گیا ۔ شروع کے چند سال یونیورسٹی نے کرایے کی عمارتوں میں گزارے ، مگر دس برس نہیں گزرے تھے کہ نامور برطانوی عالم اور ماہرِ فنِ تعمیر سر پیٹرک گیڈس کی مدد سے جامعہ کی اپنی عمارت کے لیے شہرِ حیدر آباد سے باہر چند میل دور ایک

۱- Induction
۲- The World of Ideas
۳- Equivalent
۴- Specific gravity
۵- Electron

نہایت اچھا موقع تلاش کیا گیا۔ سر پیٹرک گیڈس اس سے پہلے فرانس کے شہر مون پیلیئے کی یونیورسٹی تعمیر کر چکے تھے۔ جامعۂ عثمانیہ کے لیے جو قطعۂ زمین انتخاب ہوا، اس کے متعلق سر پیٹرک گیڈس نے کہا کہ یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے اس سے بہتر موقع انھوں نے دنیا بھر میں اور کہیں نہیں دیکھا۔ یہ جگہ جو پندرہ سو ایکڑ کا ایک وسیع اور دل کشا میدان ہے، دو ہزار فٹ کے قریب بلند ہے۔ اس موقع پر یونیورسٹی کی عمارات کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپے کے صرف کا اندازہ کیا گیا۔ تین سو طلبہ کے لیے دو فراخ اور دو منزلہ اقامت خانے اور آرٹس کالج کی شاندار عمارت سب سے پہلے تعمیر ہوئی۔ اسی طرح سائنس کے شعبہ جات کی عمارتوں کو بھی اوّلیت دی گئی۔ سائنس کالج، لا کالج، انجینیئرنگ کالج، یونیورسٹی لائبریری، یونیورسٹی یونین ہال، یونیورسٹی میوزیم وغیرہ کے لیے بھی مناسب نقشے تیار کیے گئے۔ لیکن چونکہ ان منصوبوں کی تکمیل نسبۃً طویل مدت کی متقاضی تھی اس لیے دس لاکھ روپے کے خرچ سے ایک سلسلۂ عمارات عارضی طور پر کھڑا کر لیا گیا۔

سر رشتۂ تالیف و ترجمہ [''دارالترجمہ''] کے قیام کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ پہلے ناظم دارالترجمہ مولوی عبد الحق صاحب تھے اور جب وہ کسی دوسری خدمت پر منتقل ہوئے تو ان کی جگہ مولوی عنایت اللہ دہلوی نے لی۔ دارالترجمہ کے ارکان میں مولوی ظفر علی خاں، مولوی سید ہاشمی، مولوی عبد الماجد، چوہدری برکت علی اور قاضی محمد حسین جیسے بزرگانِ علم و ادب کے نام آتے ہیں۔ اس سر رشتۂ تالیف و ترجمہ کے زیرِ اہتمام متعدد مجالسِ وضعِ اصطلاحات کام کرتی ہیں۔ ان کے اجلاس مہینے میں کئی بار منعقد ہوتے ہیں۔ ہر مجلس، مضمون کی نوعیّت کے لحاظ سے، مختلف الارکان ہے۔ یہ ارکان تین حیثیتوں سے اپنی اپنی مجالس کے لیے منتخب ہوتے

ہیں - سب سے پہلے ماہرینِ مضمون ہیں - پھر اُن مضمونوں کے ماہرین جن کے حدود متعلقہ مضمون سے ملتے ہیں اور آخر میں ، مگر بنیادی طور پر اہم ، ماہرینِ زبان ہیں جنھیں ہر مجلسِ وضعِ اصطلاحات میں لازماً جگہ ملتی ہے - ان تفصیلات سے یہ خود بخود ظاہر ہوگا کہ یونیورسٹی کے تقریباً سبھی اساتذہ ان مجالس میں حسبِ موقع شرکت کرتے ہیں -

ہندوستان میں اب بھی بعض ناواقف لوگ دل میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ ایک عجیب و غریب قسم کا قدامت پسندانہ مکتب ہے - یہ خیال ہرگز درست نہیں ہے - عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر اُسی طرح ہندوستان اور یورپ ، ایران اور مصر کی تعلیم گاہوں کے سند یافتہ ہیں جس طرح ہندوستانی یونیورسٹیوں کے پروفیسر - وہ اپنی جماعتوں کو اُردو زبان میں اُسی طرح لکچر دیتے ہیں جس طرح ہندوستان کے پروفیسر انگریزی زبان میں - عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ اُسی طرح امتحان کی تیاری کرکے اپنی ڈگریاں لیتے ہیں جس طرح ہندوستانی یونیورسٹیوں کے طلبہ - بڑا فرق یہ ہے ، اور عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق دل چسپ اور حیرت انگیز بات بھی یہی ہے ، کہ جدید علوم کی تدریس اُونچی جماعتوں تک اُردو کے ذریعے سے ہوتی ہے - صرف ایک مضمون ، انگریزی زبان و ادب ، انگریزی میں پڑھایا جاتا ہے - اس سے قطع نظر ، میڈیسن اور انجنیئرنگ اور قانون ، نیز سائنس کے سبھی مضامین ، اُردو میں پڑھائے جاتے ہیں -

شروع شروع میں کیفیت یہ رہی کہ خود دکن میں ایسے لوگ موجود تھے جنھیں شبہہ تھا کہ دیکھیے ، اُردو میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ بظاہر نیا طریقہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں - لیکن تھوڑی ہی مدت میں اس نئی تنظیم سے ایسے حوصلہ افزا نتائج پیدا ہوئے کہ شبہہ اور خوف کا کوئی موقع نہ رہا - ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کے مقرّر شدہ بیرونی ممتحنوں

کی طرف سے جامعۂ عثمانیہ کے زیرِ امتحان طلبہ کی فراست اور اُپج کی تعریف موصول ہوئی۔ جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجے گئے، اُنھوں نے وہاں امتیاز حاصل کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے کام کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جنھوں نے یونیورسٹی کی شائع کردہ درسی کتابوں میں سے صرف ایک آدھ پر چھچھلتی ہوئی نظر ڈالنا کافی سمجھ لیا ہو۔ جن ماہرین تعلیم نے حیدر آباد جا کر اس کام کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، اُنھیں عثمانیہ یونیورسٹی کی حیرت انگیز کامیابی کا صحیح تصوّر نہیں ہو سکتا۔ اس یونیورسٹی نے دکن کی نوجوان نسل میں ایک عظیم الشان بیداری پیدا کر دی ہے۔ یہ ذہنی انقلاب اتنا حیات انگیز، اتنا گہرا ہے کہ ایک چھوٹے پیمانے پر اسے یورپ کی تحریکِ احیائے علم سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

مغرب کا اثر ہندوستان کی تعلیم پر

یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو ، نئی دہلی ،
سے ۲۷ نومبر ۱۹۴۴ کو نشر ہوا ۔

ہندوستان سے مغربی قوموں کا تعلّق اگرچہ اکبر کے وقت سے شروع ہو چکا تھا لیکن پورے دو سو برس تک ہندوستانی تعلیم نے مغرب سے کوئی اثر قبول نہ کیا ۔ ہماری تعلیم میں مغربی اثرات پہلے پہل اٹھارھویں صدی کے آخر میں نمودار ہوئے ۔ وجہ یہ ہے کہ حکومت یا مذہب کی طاقت کے بغیر کسی پوری قوم کے لیے نئے تعلیمی سانچے بنانا ممکن نہیں ہوتا اور اٹھارھویں صدی کا آخری زمانہ ہی وہ زمانہ تھا جب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے دوسری مغربی قوموں کی تجارتی کمپنیوں کو میدان سے اس طرح باہر نکال دیا کہ اسے ہندوستان کا تختِ حکومت سامنے نظر آنے لگا ۔ اس زمانے کو اب ڈیڑھ سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور انگریزی عہد کے نظامِ تعلیم کے اچھے اور برے اثرات اِس حد تک اُبھر چکے ہیں کہ گزشتہ بیس پچیس سال سے ہندوستانی اور انگریز ماہرینِ تعلیم اس معاملے کے دونوں پہلوؤں سے بحث کر رہے ہیں ۔

ہماری تعلیم پر مغربی اثر کی تاریخ کے تین بڑے دور ہیں : انگریزی حکومت کی طرف سے سب سے پہلا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا فخر وارن ہیسٹنگز کو حاصل ہے جس نے ۱۷۸۱ میں فارسی اور عربی علم و ادب کی تعلیم کے لیے کلکتے کے مدرسے کی بنیاد رکھی ۔ سنسکرت

کے انگریز عالم سر ولیم جونز کی کوششوں نے مشرقی علوم سے جو عام دلچسپی پیدا کر دی تھی اُس کے باعث تین سال بعد Asiatic Society of Bengal کا قیام عمل میں آیا - ۱۷۹۱ میں جانتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا جسے حکومت کی طرف سے کافی مالی مدد ملی - غرض انگریزی عہدِ حکومت کی تعلیمی تاریخ کا یہ پہلا دَور اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ کسی نئی حکمتِ عملی پر کاربند ہونے کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی نے وہی روش اختیار کی جو اس سے پہلے کے عہدِ حکومت میں قائم تھی - اورنگ زیب کی وفات کے بعد ملک میں جو ابتری پھیلی اُس نے قومی پیمانے پر علمی و ادبی سرگرمیوں کا خاتمہ کر دیا تھا - ستّر اسّی برس بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو سیاسی عروج حاصل ہوا تو مغلیہ حکومت کی تعلیمی حکمتِ عملی از سرِ نو زندہ کی گئی - اِس حکمتِ عملی کا مقصد یہ تھا کہ عربی اور سنسکرتی علوم کی قدر افزائی کے ذریعے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اُسی ذہنی شائستگی تک پہنچنے کا موقع دیا جائے جس سے اٹھارھویں صدی کی بد امنی اور افرا تفری نے انھیں محروم کر دیا تھا - مغربی اثر کے ماتحت ہندوستان کے اِس پہلے تعلیمی دَور میں لطف کی بات یہ تھی کہ انگریزوں کی ایک جماعت اُسی شوق سے سنسکرت، عربی اور فارسی کی تحصیل کرتی تھی جس سے بعد میں ہم نے انگریزی پڑھنی شروع کی - اُنیسویں صدی کے آغاز تک یہی کیفیت قائم رہی، بلکہ ۱۸۱۳ میں پارلیمنٹ کے دباؤ سے کمپنی نے ایک لاکھ روپے کا سالانہ بجٹ ہندوستان کی تعلیم کے لیے منظور کیا - یہ رقم عربی، فارسی اور سنسکرت کی کتابیں چھاپنے اور تعلیمی وظیفے دینے پر خرچ کرنے کی تجویز تھی - اس دَور میں خود حکومت کے حلقوں کی فضا ایسی تھی جو ہندو مسلم تہذیبوں اور ان کے متعلقہ رسم و رواج کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کے لیے سازگار تھی - ولسن، پرنسپ اور کول بروک جیسے مانے ہوئے عالم اس

تحریک کی سربراہی کر رہے تھے - یہ لوگ Orientalists یعنی مستشرقین کہلاتے تھے اور ان کی کوششوں کا مقصد ہندوستانی اور یورپی علم کا ملاپ تھا - انھیں ہندو اور مسلم علوم کی بنیادی حیثیت تسلیم تھی - ان کی خواہش یہ تھی کہ اس پودے کو احتیاط سے سینچیں اور بالآخر اس میں یورپی علم کا پیوند لگائیں - چنانچہ ۱۸۲۱ میں یہ تجویز زیر غور تھی کہ کلکتے میں ایک سنسکرت کالج قائم کیا جائے جس میں ذریعۂ تعلیم تو سنسکرت ہو لیکن ہندو قوم کے اعلیٰ طبقوں میں اِسی ذریعے سے انگریزی ادبیات اور سائنس کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے -

مگر اس تحریک کا عمل میں آنا تو درکنار، اس کے لیے ابھی کوئی مفصّل پروگرام تک تیار نہ ہو سکا تھا کہ ہوا کا رخ بدلا اور ہماری تعلیم پر مغربی اثر کا یہ پہلا دَور، جو ۱۷۸۱ میں وارن ہیسٹنگز کے ہاتھوں شروع ہوا تھا، ۱۸۳۵ میں مکالے کے ہاتھوں ختم ہو گیا - انگریز حکّام میں اب ایک ایسی جماعت بھی ظاہر ہو چکی تھی جسے مستشرقین کی تعلیمی حکمتِ عملی سے بنیادی اختلاف تھا - اِس جماعت کو ہندو اور مسلم علم و ادب کی قدر و قیمت تسلیم نہیں تھی، بلکہ اسے اندیشہ تھا کہ ہندوستانی تعلیم میں اگر مشرقیّت کا عنصر غالب رہا تو تہذیب و شائستگی کو فروغ ہونے کے بجائے ہندوستان کی جہالت، تعصّب اور وہم پرستی میں اضافہ ہوگا - چنانچہ ۱۸۲۴ کے ایک مراسلے میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے صاف صاف یہ کہا کہ شاعری کی تعلیم دینا یوں بھی بے کار ہے مگر ہندو اور اسلامی ذخیرۂ ادب میں تو شاید ہی کوئی کام کی چیز ملے جس کی تعلیم مفید کہلا سکتی ہو - دنیا کے بڑے سیاسی انقلابات کی طرح اس تعلیمی انقلاب کی تہ میں بھی معاملہ روپے پیسے کا تھا - واقعہ یہ ہے کہ ایک لاکھ روپے کی جو سالانہ رقم کمپنی نے ہندوستان کی تعلیم کے لیے منظور کی تھی

اسے خرچ کرنے کا مناسب ڈھنگ سوچنے کے لیے ۱۸۲۳ میں ایک سرکاری تعلیمی کمیٹی قائم ہوئی۔ اس تعلیمی کمیٹی میں مستشرقین کو غلبہ حاصل تھا۔ لیکن مکالے کے ہندوستان آتے آتے حالات اس حد تک پلٹا کھا چکے تھے کہ کمیٹی میں انگریزی تعلیم کے طرف داروں کی تعداد مستشرقین کے برابر ہو گئی تھی۔ کمیٹی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ایک لاکھ روپے کے منظور شدہ بجٹ کا صحیح مصرف کیا ہے۔ اسلامی اور ہندو علوم کا فروغ یا مغربی علوم کی ترویج و اشاعت؟ کمیٹی کے پانچ رکن عربی اور سنسکرت کو بنیادی حیثیت دینا چاہتے تھے اور پانچ کو اصرار تھا کہ یہ حیثیت انگریزی علم و ادب کو ملنی چاہیے۔ تعلیمی کمیٹی کا یہ جھگڑا بالآخر گورنر جنرل بہ اجلاسِ کونسل تک پہنچا اور مکالے نے بحیثیت کونسل کے ایک رکن کے اپنی وہ مشہور یادداشت قلم بند کی جس کے باعث انگریزی تعلیم کے اختیار کر لیے جانے کی ساری ذمہ داری عام طور پر مکالے کے سر رکھی جاتی ہے۔ لیکن دراصل خود لارڈ ولیم بنٹنک کا میلان اِسی طرف تھا اور کچھ غیر سرکاری حلقے بھی مکالے کے حق میں تھے۔ ان میں قابلِ ذکر انگریز مشنریوں کی جماعت ہے جنھوں نے آنیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ ان کوششوں کے ماتحت مدراس، کلکتے اور بمبئی میں انگریزی کی تعلیم کے لیے کالج قائم ہو چکے تھے۔ مشنری جماعت کو قدرۃً اپنے مذہب، تہذیب اور علوم کی برتری پر ایمان تھا۔ یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ان کو یہ بھی یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی، اخلاقی اور سماجی طور پر گمراہی اور تاریکی میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مشنری جماعت کی بالکل مخلصانہ خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کو انگریزی تعلیم دے کر سچے مذہب کی روشنی پہنچائی جائے۔ مشنری جماعت کے اِس خلوص کے باوجود

یہ ظاہر ہے کہ اگر صرف مسیحیت کی تبلیغ کا خیال ہی عام انگریزی تعلیم کے حق میں ہوتا تو اس تحریک کو تعلیمی پہلو سے وہ فروغ نصیب نہ ہوتا جو بعد میں ہوا ۔ لیکن اس موقع پر خود اہلِ ہند کا ایک طبقہ بھی انگریزی تعلیم کا پُر زور مطالبہ کرنے لگا ۔ روشن خیال ہندوؤں کے ایک گروہ نے ، جس میں راجہ رام موہن رائے سب سے آگے تھے ، بڑے جوش اور مستعدی سے انگریزی تعلیم کے حق میں کام کرنا شروع کیا ۔[1]

حکومت کے سامنے اگرچہ اور مصلحتیں بھی تھیں لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ حالات کے اِس رخ سے غیر متأثر رہتی ۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کے حق میں قطعی فیصلہ ہو جانے کے بعد ۱۸۳۵ میں مکالے نے جو الفاظ لکھے وہ اس سلسلے میں سننے کے قابل ہیں : ''کوئی ہندو جس نے انگریزی تعلیم حاصل کر لی ہو ، کبھی سچّے دل سے اپنے مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں رہ سکتا ۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر ہماری تعلیمی تجویزوں پر عمل کیا گیا تو آج سے ۳۰ سال بعد بنگال کے معزز طبقے میں ایک بھی بت پرست باقی نہیں رہے گا'' ۔ (مکالے کی اس تحریر کے پورے سو سال بعد انگریزی تعلیم کے دو پختہ ہندوستانی ثمر ، ٹیگور اور مسٹر گاندھی کی شکل میں ، اگر مکالے کو پیش کیے جاتے تو حیرت کے پہلے لمحے میں اس کا منہ یقیناً دیکھنے کے قابل ہوتا) ۔ مسلمانوں نے اوّل اوّل تعلیم میں مغربی اثر کی بڑی سختی سے مزاحمت کی ، اور یہ واقعہ ہے کہ اگر سرسید احمد خاں جیسا بیدار مغز اور صاحبِ ایثار

---

۱ ۔ اس ہندو تحریک کی بنیاد محض طلبِ علم کے جذبے پر نہ تھی ۔ ہندو قوم مغربی علم و تمدّن کو قبول کر کے مسلمانوں کے تمدّنی اثر کا جؤا اُتار پھینکنا چاہتی تھی ۔ اِس لحاظ سے یہ ہندو تحریک ، جو بظاہر ایک تعلیمی تحریک تھی ، در اصل ہندوؤں کے قومی احیا کی بھی تحریک تھی ۔ (مصنّف)

قائد بیچ میں نہ ہوتا تو مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے دائرے میں آتے آتے بیسویں صدی ضرور شروع ہو جاتی - اسے سید احمد خاں مرحوم کی کرامت سمجھیے کہ صرف آدھی صدی کی تاخیر سے مسلمان بھی ہندوؤں کے پیچھے پیچھے مغربی تعلیم کی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے ، مگر ہندوستان کے اِس دوسرے پودے میں جو پھل آیا وہ بھی کم از کم مکالے کی توقعات کے بالکل خلاف تھا - ہندوستانی مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا اقبال سے زیادہ گہرا مطالعہ کسی نے نہیں کیا ہوگا - لیکن جب یہ عمل پورا ہو چکا تو اقبال نے بھی اپنی روح کی پوری قوّت سے اسلام اور مشرقیّت کی طرف رجوع کیا - مگر یہ بعد کی باتیں ہیں - ۱۸۳۵ میں انگریزی تعلیم کے حامیوں کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ جو چیز مغرب کے لیے مفید ثابت ہو چکی ہے وہ مشرق کے لیے کیوں مفید ثابت نہ ہوگی - مکالے اور اس کے ہم خیال حکّام کو پورا بھروسا تھا کہ مغربی اثرات کی بدیہی خوبیاں ہندوستان کے جسم و روح کو خود بخود تسخیر کرتی چلی جائیں گی - چنانچہ ۱۸۳۵ میں جس نئے تعلیمی دور کا آغاز ہوا ، اس کے نصب العین کی تشریح مکالے نے بڑی بے تکلفی سے یوں کی کہ انگریزی تعلیم کے ذریعے سے ہندوستان میں ایک نیا طبقہ پیدا کرنا مقصود ہے :

> ایک ایسا طبقہ (یہ مکالے کے الفاظ ہیں) جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان ، جس پر ہم حکمران ہیں ، ترجمان بن جائے ، ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے مذاق ، اخلاق ، خیالات اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہوں -

انگریزی عہد کی تعلیمی حکمتِ عملی کی تاریخ میں اس فیصلے کو بجا طور پر بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے - اس کے بعد ہمارے

ملک میں تعلیمی پہلو سے جو کچھ ہوتا رہا وہ اس فیصلے کی تعمیل، توسیع یا ترمیم کے طور پر ہوا - ۱۸۴۴ میں لارڈ ہارڈنگ کی حکومت نے قرار دیا کہ سرکاری ملازمت کے لیے وہ لوگ چنے جائیں جنھوں نے انگریزی تعلیم پائی ہو - اس قرارداد نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لیے جو کام کیا وہ سب پر ظاہر ہے - دس سال بعد (۱۸۵۴ میں) ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کا وہ تاریخی مراسلہ آیا جو ۱۸۳۵ کے فیصلے کی تشریح میں ہندوستان کے لیے ایک تعلیمی منشور کا مرتبہ رکھتا ہے - اس مراسلے میں تعلیمات کے محکموں کا قائم ہونا طے پایا اور یونیورسٹیوں کے قیام کی اُمید دلائی گئی - صرف یہی نہیں بلکہ مدرسے سے لے کر یونیورسٹی تک کی ہر منزل کے لیے ایک مفصّل اور مربوط تعلیمی نظام پورے ہندوستان کے لیے مرتّب کیا گیا - اپریل ۱۸۵۷ میں کلکتہ یونیورسٹی نے انٹرنس کا پہلا امتحان لیا جو ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا پہلا امتحان تھا - اسی سال جولائی اور ستمبر میں بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں - یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی تمام آبادی کے لیے ایک ہی قسم کی تعلیم مناسب سمجھی گئی - لیکن بہت جلد ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ درسگاہوں کی ضرورت محسوس کی - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ہندو یونیورسٹی بنارس اِسی احساس کا نتیجہ ہیں - لیکن اِن یونیورسٹیوں کے قیام سے پہلے بھی مختلف اسلامی اور ہندو کالج قائم ہو چکے تھے - اِن کالجوں کو قائم کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک برائے نام قومی تسلّی حاصل کی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں قوموں کی کثرت رائے ان اسلامی اور ہندو درس گاہوں کو مذہبی اور قومی ضروریات کے لحاظ سے نا قابلِ اطمینان سمجھتی ہے، کیونکہ یہ درس گاہیں بھی ۱۸۳۵ کے فیصلے اور ۱۸۵۴ کے مراسلے کے مطابق انگریزی زبان اور مغربی علوم کو بنیادی اہمیت

دیتی ہیں۔

اس بے اطمینانی کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے اثر سے پہلے مذہب اور تعلیم کا کام ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تعلیم کی اشاعت کا ذریعہ مذہبی پیشوا تھے۔ علم پھیلانا ہندو اُستاد یا گُرو کا دھرم تھا، صرف ذریعۂ معاش نہ تھا۔ مسلمان علماء بھی اسی طرح بیک وقت مذہب کے مبلّغ اور دنیوی علوم کے اُستاد تھے۔ انگریزی عہدِ حکومت میں یہ روایت قائم نہ رہ سکی۔ چونکہ ہندو مسلمان کے لیے ایک ہی نظامِ تعلیم تیار ہوا تھا اس لیے دونوں کے لیے مذہبی تعلیم کی گنجائش اس میں قدرۃً نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تعلیم مذہب سے بالکل الگ کر دی گئی۔ یہ انتظام ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی روایات کے خلاف تھا اور اس کا نتیجہ مختلف قسم کی پیچیدگیوں کی شکل میں رونما ہوا۔ سال ہا سال تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ہمارے نوجوان اپنی قومی تہذیب سے ناواقف رہے اور اس طرح اپنے ہی ملک میں اُن کی حالت اجنبیوں کی سی ہو گئی۔ اس کے علاوہ جب پڑھنے پڑھانے میں مذہبی احترام کا جذبہ شامل نہ رہا تو اس کا اثر اُستاد اور شاگرد کے روحانی تعلق پر بھی پڑا۔ اب نہ اُستاد گُرو تھا نہ شاگرد چیلا۔ جب اُستاد اور شاگرد کے درمیان گُرو اور چیلے کا تعلق ختم ہو جائے تو تعلیم کا سطحی اور بے آب و رنگ ہو جانا یقینی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا مشرق اور کیا مغرب، سب جگہ مذہب کو انسان کی اخلاقی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ یونیورسٹی کی منزل میں یا اس منزل کے کسی خاص حصے میں مذہب اور تعلیم کی علیحدگی شاید نامناسب نہ ہوتی، لیکن مدرسے میں بھی مذہبی تعلیم کے غائب ہو جانے سے اخلاق زندگی کی بنیاد مفقود ہو گئی اور سچ پوچھیے تو کسی مدرسے میں مذہبی تعلیم کے لیے ایک گھنٹے کا وقت مقرّر کر دینے سے یہ کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ

تعلیم کے پورے نظام میں احترام کا وہ جذبہ کام کر رہا ہو جو عبادت (یا زندگی کا کوئی بڑا کام) کرتے وقت انسان کے دل پر طاری ہوتا ہے۔ سرسیّد احمد خاں کی تمام تعلیمی خدمات کی تہہ میں یہی جذبہ کام کر رہا تھا، ٹیگور کے شانتی نکیتن کے پیچھے اسی جذبے کی تحریک تھی اور مسٹر گاندھی نے بھی کانگرسی وزارتوں کے زمانے میں بچوں کی تعلیم کے لیے اسی جذبے کے ماتحت اپنی ''ودّیا مندر'' سکیم پیش کی۔ ان سب کوششوں کے نتائج سے ہم مطمئن ہوئے یا غیر مطمئن، یہ ظاہر ہے کہ ان کا رخ ہماری اجتماعی زندگی کی ایک ایسی بنیادی ضرورت کی طرف ہے جو مکالے کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ ایک ایسے نظامِ تعلیم کا تصوّر کیجیے جس میں نہ تو کوئی مذہبی تعلیم ہے نہ کوئی بلند نصب العین جو تعلیم کو بھی ایک عبادت بنا دے، نہ اُستاد میں گُرو بننے کی صفات ہیں، نہ شاگرد میں چیلا بننے کی صلاحیت۔ ایسے نظامِ تعلیم میں کوئی مذہبی یا غیر مذہبی طاقت ایسی موجود نہیں جو انسان کی اخلاقی زندگی کی بنیاد بن سکے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو ہنگامے اور خلفشار کبھی کبھی نظر آنے لگے ہیں اُن کا ایک سبب ہمارے نظامِ تعلیم کی یہی کمی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مغربی طریقِ تعلیم کی بعض خاص خاص خوبیاں بھی نتائج کے لحاظ سے ہمارے لیے مضر ثابت ہوئی ہیں۔ مثلاً مغرب کا نظامِ تعلیم اپنی بنیاد کے لحاظ سے جمہوری ہے۔ اگرچہ ابھی تک انگلستان میں بھی آبادی کے ہر طبقے کے لیے تعلیمی مواقع کی برابری عملی طور پر پیدا نہیں ہو سکی، لیکن وہاں تعلیم کا نظریہ بالکل جمہوری ہے۔ ہر انگریز شہری کو تعلیم پر ایک ہی قسم کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان کے سیاسی اور تعلیمی نظام میں مغربی اثر سے پہلے جمہوریت کا کوئی واضح وجود نہ تھا۔ کیا ہندو ہندوستان اور کیا مغلیہ ہندوستان دونوں میں سوسائٹی کی بنیاد غیر جمہوری تھی۔ بچے کی

تعلیم اور تربیت اُس کی سماجی حیثیت کے مطابق کی جاتی تھی ؛ یعنی تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ اس بات پر ہوتا تھا کہ بچے کے پیدائشی حالات کیا ہیں - یہ روایت ابھی تک پوری طرح ٹوٹ نہیں سکی - کئی برس گزرے جب میں خود عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا ، میرے ایک ہم جماعت نے ، جو حیدر آباد دکن کے ایک معزّز خاندان سے تھے ، ایک دن بڑی حسرت کے لہجے میں مجھ سے کہا : ”خدا کی شان دیکھیے ، اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ ہر چمار کا بیٹا اُٹھتا ہے اور یونیورسٹی میں داخل ہو کر وہی کچھ پڑھنے لگتا ہے جو ہم پڑھتے ہیں“ - میرے نو عمر ہم جماعت نے جو الفاظ بڑی حسرت سے کہے ، وہی دراصل انگریزی تعلیم کے لیے فخر کا موقع پیدا کرتے ہیں - مغربی اثر کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ علم پر راجا کا بیٹا اور چمار کا بیٹا یکساں حق رکھتے ہیں - لیکن اس خوبی میں بھی ایک خرابی کا پہلو نکل آیا ہے ، ہماری اقتصادی اور عام سماجی زندگی جمہوریت کی برکات سے اب بھی اتنی ہی دور ہے جتنی پہلے تھی - دوسری طرف ہماری جمہوری تعلیم نے ہمیں ایک ایسے ذہنی انقلاب سے دو چار کر دیا ہے جس سے ہمارے حالات مطابقت نہیں رکھتے - چنانچہ ہماری تعلیم یافتہ نسل جس بے اطمینانی کا شکار نظر آتی ہے اس کی تہہ میں ذہنی اور واقعی زندگی کی یہی چپقلش ہے - اس کے علاوہ چونکہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہے اس لیے انگریزی جاننے والوں کی محدود جماعت اور انگریزی نہ جاننے والوں کی کثیر تعداد میں ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے جس کا پاٹنا دشوار ہے - دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یوں سمجھیے کہ تعلیم کے جمہوری نظریے کو عملی صورت دینے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے ہیں جنھوں نے اسے نتائج کے لحاظ سے غیر جمہوری بنا دیا ہے -

کسی غیر زبان میں علم کی تحصیل ممکن ہے بھی یا نہیں ، یہ ایک الگ مسئلہ ہے - ماہرین تعلیم کا تقریباً متفقہ فیصلہ مکالے کی رائے

کے خلاف رہا ہے اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تعلیم کا بہترین ذریعہ کسی ملک کی اپنی زبان ہوتی ہے - اس سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جو ہمیں مکالے سے بہت دور مگر وارن ہیسٹنگز کی تعلیمی حکمتِ عملی کے بہت قریب لے آیا ہے - گویا چکّر کاٹ کر ہم نے پھر اُسی رخ چلنا شروع کیا ہے جدھر سے پہلے پیٹھ پھیر لی تھی - اس کے ساتھ ہی گزشتہ سو سال کے تجربے نے ہمیں جو کچھ سکھایا ہے ہم اُس سے بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں - تعلیم میں قومی رنگ پیدا کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اُس کا اشارہ اسی طرف ہے کہ مکالے نے وارن ہیسٹنگز کے بعد جس دوسرے تعلیمی َدور کا آغاز کیا تھا، وہ اپنی مہلت پوری کر چکا اور اب ہماری تعلیمی حکمتِ عملی مغربی اثر کے ماتحت ایک تیسرے َدور میں داخل ہو رہی ہے - اب زیادہ گہری واقفیت اور زیادہ وسیع نظر کے ساتھ ہم یہ جائزہ لے رہے ہیں کہ کس قسم کا نظامِ تعلیم ہماری قومی ضروریات اور حالات کے لیے سازگار ہے - واضح رہے کہ کسی نئے نظامِ تعلیم کی کامیابی صرف اِس بات پر منحصر نہیں ہوتی کہ وہ طالب علموں کو معلومات کا وافر سرمایہ بہم پہنچاتا ہے بلکہ اِس بات پر بھی کہ معلومات کا یہ سرمایہ زندگی کی حقیقی قدروں سے واقعی کوئی رشتہ رکھتا ہے یا نہیں - ہماری بڑی کوشش اب یہ ہے اور ہونی چاہیے، کہ جو تعلیمیٔ نصب العین ہم قائم کریں اس کو وہ لوگ بھی اچھی طرح سمجھیں جو پڑھنے اور پڑھانے میں مصروف ہوں - بچہ جب مدرسے میں داخل ہو تو اسے یہ احساس ہو کہ مدرسہ محض ذہنی تیزی کے مقابلوں کا اکھاڑا ہی نہیں بلکہ اُس جگہ کا نام ہے جہاں (زندگی کے وسیع ترین معنوں میں) زندگی بسر کرنے کا فن سیکھا اور سکھایا جاتا ہے -

☆ ☆ ☆

مہذّب اور وحشی آدمی کا فرق

یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی،
سے فروری ۱۹۴۵ میں نشر ہوا

تہذیب کس طرح شروع ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ کبھی بنتی، کبھی بگڑتی، اور اس پر بھی سنورتی ہوئی، کس طرح ہمارے زمانے تک پہنچی؟ یہ کہانی بہت دلچسپ مگر بہت طویل ہے۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ تہذیب ایک صاف ستھرا گھر ہے جسے ہم نے اور پہلے لوگوں نے مل جل کر بنایا اور سجایا ہے۔ کبھی کبھی بھونچال بھی آئے اور ہمارے اِس گھر کے بعض حصے ڈھے گئے، لیکن پیچھے آنے والوں نے ان کی جگہ نئے خوبصورت کمرے بنوا دیے اور اس طرح گھر کی صفائی اور خوبصورتی میں فرق نہ آیا۔ لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ گھروں کے بنانے میں وقت لگتا ہے، ان کو خراب کرنے اور ڈھانے میں وقت نہیں لگتا؟ معمار کے لیے ایک ایک اینٹ کا گھڑنا اور لگانا مشکل ہے مگر ڈھانے والے کے لیے یہ آسان ہے کہ پانچ سات اینٹیں اِدھر اُدھر سے کھینچ لیں اور بنی بنائی دیوار کو دھڑام سے گرا دیا۔ یہی حال ہمارے تہذیب کے گھر کا ہے۔ بنا ہوا گھر خوبصورت اور مضبوط دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے بگڑنے اور لٹنے کی نوبت آئے تو دیکھتے دیکھتے سماں بدل جائے۔

آپ حیران ہو کر پوچھیں گے کہ آخر اِس دور میں کون وحشی ہوگا جو ہمارے اس گھر کو بگاڑنے اور لوٹنے کا خیال کرے گا؟ لیکن

حقیقت یہ ہے کہ وحشی انسانوں کا زمانہ گزر نہیں گیا اور شاید ہزاروں برس آگے چل کر بھی مہذّب آدمیوں کے ساتھ وحشی اُسی طرح مل جل کر رہیں گے جس طرح آج کل رہتے ہیں - ہمارے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے زمانے کے وحشی ہیں اُن کو پہچانیں اور اپنی تہذیب کو اُن سے بچانے کی فکر کریں -

مہذّب اور وحشی آدمی میں کیا فرق ہے ؟ کیا وحشی کی پہچان یہ ہے کہ وہ میلے کپڑے پہنتا ہے ، گلی سڑی چیزیں کھاتا ہے اور اُسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہوتی ؟ اگر مہذّب اور وحشی آدمی میں یہی فرق ہوتا تو بڑی آسانی ہو جاتی - ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوتا کہ کون شخص کیا کھاتا پیتا اور پہنتا اوڑھتا ہے اور ہم پہچان لیتے کہ وہ مہذّب ہے یا نہیں - لیکن دراصل مہذّب اور وحشی آدمی میں فرق کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے - اچھے کپڑوں اور سُلجھی ہوئی بات چیت سے مہذّب اور وحشی آدمی کی پہچان نہیں ہو سکتی ، اس لیے کہ اگرچہ مہذّب لوگوں میں یہ باتیں عموماً پائی جاتی ہیں لیکن صرف اِنھی چیزوں کا نام تہذیب نہیں ہے - کوئی شخص وحشی ہونے پر بھی اُجلی پوشاک پہن سکتا اور میٹھی میٹھی باتیں کر سکتا ہے - اِس طرح تہذیب کا دشمن ہونے پر بھی وہ مہذّب لوگوں کے درمیان پہچانا نہیں جا سکتا - یہ وہ شخص ہے جسے ہم ”مہذّب وحشی“ کہہ سکتے ہیں ، یعنی ظاہر میں مہذّب اور باطن میں وحشی -

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مہذّب اور وحشی آدمی میں فرق یہ ہے کہ مہذّب آدمی کے اخلاق پسندیدہ ہوتے ہیں اور وحشی کے نا پسندیدہ ، تو یہ بھی کئی لحاظ سے درست نہ ہوگا - مثلاً لنکا کی جنگلی وڈّا قوم سچ بولنے میں اپنی مثال آپ ہے - جزیرۂ انڈیمان کے وحشی قبیلوں میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے - اِسی طرح اور وحشی قومیں ہیں جن مین وعدہ پورا کرنے ، مہمان کی خدمت

یا عورتوں کی حفاظت کرنے پر بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم ان قوموں کو مہذّب نہیں مانتے۔ دوسری طرف مہذّب لوگوں میں بھی ہمیں بعض برائیاں نظر آتی ہیں اور اس کے باوجود ہم نہیں کہتے کہ یہ لوگ تہذیب کے دائرے سے باہر ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مہذّب اور وحشی آدمی کا فرق اِس بات سے پہچان لینا ممکن نہیں ہے کہ اس کے اخلاق اچھے یا برے ہیں۔ جو باتیں مہذّب اور وحشی دونوں قسم کے لوگوں میں پائی جاتی ہیں، انھیں ہم تہذیب کی بنیاد نہیں مان سکتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی اچھی باتیں ہیں جو صرف مہذّب لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور وحشی لوگ ان سے محروم ہیں۔ اگر ہمیں اِن باتوں کا پتا چل جائے تو مہذّب اور وحشی آدمی کا فرق خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

کسی مہذّب قوم میں جو بڑی خصوصیت پائی جاتی ہے اور کسی وحشی قبیلے میں نہیں پائی جاتی، وہ ہے ہر موقع پر اور ہر بات میں عقل برتنے کی کوشش۔ وحشی آدمی کے اکثر کام جوش، جذبے، وہم یا خوف کا نتیجہ ہوتے ہیں یا پچھلے لوگوں سے سنی سنائی باتوں کی نقل۔ مہذّب آدمی کے لیے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا یہ بات عقل میں آتی ہے؟ اور اگر یہ بات عقل کے خلاف ہے تو کون سی بات عقل کے مطابق ہے؟ وحشی آدمی اگر اس طرح سوچ بچار کرنے لگے اور یہ کہنے لگے کہ میرے قبیلے کی فلاں رسم عقل کے خلاف ہے تو وہ یا تو فوراً مار دیا جائے اور یا بچ جائے پر وحشی نہ رہے، مہذّب ہو جائے۔ مہذّب قوموں میں کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جسے عقل سے پرکھنے کی اجازت نہ ہو۔

ایک اور خصوصیّت ہے جو مہذّب آدمی میں پائی جاتی ہے اور وحشی آدمی میں نہیں پائی جاتی۔ مہذّب آدمی کو یہ پہچان ہوتی ہے کہ اچھی چیزیں اس وجہ سے کم یا زیادہ قیمت کی نہیں ہوتیں کہ ہمیں

کسی خاص وقت میں ان کی کتنی ضرورت ہے، مگر وحشی آدمی صرف اپنی وقتی ضرورت کو دیکھتا ہے۔ دراصل اچھی بری چیزوں کی جانچ کے لیے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ ہم کسی خاص حالت کا خیال کر کے ان کی قیمت لگائیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر مہذّب اور وحشی آدمی دونوں کو زور کی بھوک لگی ہو تو مہذّب آدمی بھوکا ہونے پر بھی یہ نہیں سمجھے گا کہ روٹی کے سوا دنیا کی کسی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن وحشی کے لیے روٹی کے ایک ٹکڑے کے سامنے تاج محل یا رامائن کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ بنیادی طور پر یہی دو خصوصیتیں تہذیب کی علامت ہیں تو پھر یہ ماننے میں کوئی مشکل نہیں رہتی کہ مہذّب سماج وہ ہے جس میں اوّل، عقل کو ہر قسم کے سوال کرنے اور جواب دینے میں روک ٹوک نہ ہو۔ دوسرے، خواہ سب کو نہیں مگر اکثر لوگوں کو گھٹیا اور بڑھیا چیز میں فرق کرنے کی تمیز ہو۔

ظاہر میں یہ دونوں شرطیں ایسی ہیں جن کا پورا ہونا کچھ زیادہ دشوار نظر نہیں آتا، لیکن اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ دیکھنے میں یہ راہ سیدھی ہے لیکن بیچ میں بہت سے پیچ اور رکاوٹیں نکل آتی ہیں۔ عقل کی بات کا ماننا اور منوانا اُس وقت تک ٹھیک معلوم ہوتا ہے جب تک اُس کی ٹکّر ہماری کسی خود غرضی یا ہماری پسند کی کسی خاص جہالت سے نہ ہوتی ہو۔ لیکن جہاں اپنا نقصان ہوتا نظر آیا وہاں کیا عقل اور کیا بے عقلی، غیر مہذّب آدمی کے لیے اِس موقع پر گھٹیا اور بڑھیا چیز میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو چیز میرے لیے ضروری ہے وہی بڑھیا ہے اور جو کچھ میرے دل نے طے کر لیا ہے وہی درست ہے۔ مثلاً جو ملک آج کل سب سے زیادہ مہذّب ہیں یا سمجھے جاتے ہیں اُنھی میں سے بعض میں وطن اور قوم کی اندھا دھند پرستش کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ

ایسے بھی ہیں جو قوم پرستی کو تہذیب کی نشانی سمجھتے ہیں - لیکن قوم پرستی اگر واقعی تہذیب کا نشان ہے تو شمالی امریکا، مغربی افریقہ اور فیجی کے اُن وحشی قبیلوں کو بہت مہذّب ماننا پڑتا ہے جن میں اپنے قبیلے سے اندھا دھند محبت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے - یاد رکھیے کہ تہذیب کے ہر زمانے میں قوم پرستی کے متعلق یہ خیال نہیں رہا - قدیم ہندو دور کی مشہور کتاب ''پنچ تنتر'' میں ذکر ہے : ''یہ خیال کرنا چھوٹے دل والوں کی عادت ہے کہ یہ شخص ہم میں سے ہے اور وہ باہر کا ہے'' - اِسی طرح بائیس تئیس صدیاں پہلے کے یونانی فلسفیوں نے وطن پرستی کے جذبے کی ہنسی اُڑائی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اندھی وطن پرستی اور وفاداری اور اس قسم کا ہر اندھا جذبہ تہذیب کا دشمن ہے - اپنے وطن سے محبت کرنا تو ہر انسان کی فطرت میں ہے لیکن اگر وطن کی پرستش اس طرح شروع کر دی جائے کہ جھوٹ اور سچ، اچھائی اور برائی میں کوئی تمیز نہ رہے تو پھر وہ دونوں چیزیں، جنھیں ہم نے تہذیب کی بنیاد مانا ہے، غائب ہو جاتی ہیں - اکثر ذی فہم لوگوں کا خیال ہے کہ دو ہزار سال پہلے کی رومی جمہوریت اِسی اندھی قوم پرستی کے باعث تہذیب سے کوری رہی - ہمارے زمانے میں یورپ تہذیب کا گھر ہے، لیکن یورپی تہذیب کے لیے بھی ایک بڑا خطرہ یہی اندھی قوم پرستی ہے - ہر بیس پچیس برس کے بعد یورپ کی قوموں میں ایک خوفناک جنگ ہوتی ہے اور سوچنے سمجھنے والے پوچھتے ہیں کہ وطن اور قوم کی اس اندھی پرستش کے ہوتے ہوئے یورپ کی تہذیب باقی رہ بھی سکتی ہے یا نہیں؟ قوم پرستی کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں اپنی قوم کی محبت کی لَے اتنی بڑھائی جاتی ہے کہ دوسروں کے لیے زندگی دشوار ہو جاتی ہے - مثلاً پچھلے سوا سو برس سے جرمنی میں بالخصوص ایک فلسفہ پیدا ہو رہا تھا جس کی تعلیم یہ تھی کہ سفید فام قومیں دنیا کی تمام قوموں کی

سرتاج ہیں ، اِس لیے دنیا کی تمام قوموں کو اگر جرمن قوم کے سامنے جھکنا پڑے تو اس میں کوئی عیب نہیں - بسمارک ، قیصر ولیم اور ہٹلر کو اِسی فلسفے نے جنم دیا - جب تک یورپ میں قوم پرستی کا یہ فلسفہ موجود ہے ، یورپی تہذیب رہ رہ کر تباہی کے قریب آتی رہے گی -

قوم پرستی ہی کی طرح ایک اور مرض ہے جو یورپ کی تہذیب کو گُھن کی طرح کھا رہا ہے - اِس مرض کی جڑیں بھی در اصل قوم پرستی تک پہنچتی ہیں - یہ نو آبادیاں قائم کرنے کی خواہش ہے جس کی وبا دو ڈھائی سو برس پہلے یورپ میں پھیلی تھی لیکن جس کی خرابیاں کہیں اب ہمارے زمانے میں آ کر ظاہر ہو رہی ہیں - نو آبادیاں قائم کرنے کی تہہ میں خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے لیے تجارت کا ایسا میدان پیدا کیا جائے جس میں دوسرے داخل نہ ہو سکیں - دوسرے لفظوں میں یہ سمجھیے کہ جس طرح بھی ہو اپنی قوم کے لیے روپیہ سمیٹا جائے ، خواہ اس سے دوسری قوموں کی آزادی چھن جائے - اس خیال کا مطلب یہ ہوا کہ بنی نوع انسان کی آزادی ایک ایسی گھٹیا چیز ہے جس کے مقابلے میں روپیہ کمانا زیادہ قیمت رکھتا ہے - گھٹیا اور بڑھیا چیز کے فرق کو ہم تہذیب کی ایک بنیادی شرط مان چکے ہیں - یورپ کی شہنشاہیت اور نو آبادیاں اس شرط کا خون کرتی ہیں - مزہ اس وقت ہوتا ہے جب شہنشاہیت کی یہ وبا کبھی کبھی اُلٹے پاؤں چل پڑتی ہے ، یعنی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتی ہے جو پرانے زمانے میں ممکن تھی مگر اب ممکن نہیں رہی - دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے کچھ مدت پہلے اٹلی کی شہنشاہیت نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کیے اور مسولینی نے ابی سینیا پر جبراً قبضہ کر لیا - لیکن جنگ کے بعد ابی سینیا میں جا گھسنا تو ایک طرف رہا ، خود اٹلی میں بھی مسولینی کو پناہ نہ مل سکی - ایک اور لطیفہ یہ ہے کہ اکثر نو آبادیاں قائم کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ جن ملکوں کو ہم نے فتح کیا ہے ،

ہم انھیں تہذیب سکھائیں گے۔ انھیں یہ خیال قطعاً نہیں ہوتا کہ زبردستی کی نو آبادیاں بناتے بناتے انھوں نے خود تہذیب کا خون کر دیا ہے اور دوسروں کو سکھانے کے لیے ان کے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔

یہ خرابیاں تو قوم پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں مگر روپیہ سمیٹنے کا مرض ایک اور شکل بھی اختیار کرتا ہے جسے سرمایہ داری کہتے ہیں۔ یہ مرض اتنا خوفناک ہے کہ تنہا یہی تہذیب کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ سرمایہ داری میں ایک شخص یا چند شخص مل کر یہ کوشش کرتے ہیں کہ قوم کے محنت کرنے والے طبقے کو کام میں لگا دیں اور اس کی محنت سے خود زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح قوم کے ایک بہت بڑے طبقے کی حالت غلاموں کی سی رہ جاتی ہے۔ جب حالت یہ ہو جائے تو قوم مہذّب نہیں رہ سکتی۔ تہذیب صرف چند آدمیوں کی خوش حالی کا نام نہیں ہے۔ تہذیب کے درجے تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قوم میں ہر شخص کو یکساں آزادی حاصل ہو اور عام خوشی اور خوش حالی میں بھی اسے حصہ دیا جائے۔ جب تک سرمایہ دار اور محنت کرنے والے میں کوئی منصفانہ سمجھوتا نہیں ہوگا، تہذیب کو اسی خطرے کا سامنا رہے گا جس نے ۱۹۱۷ میں زار روس کی حکومت کو ختم کر دیا تھا۔

تہذیب کے لیے جن خطروں پر ہم نے اب تک غور کیا ہے اُن کا تعلق انسان کی حرص اور طمع سے ہے۔ قوم پرستی، شہنشاہیت، سرمایہ داری، یہ سب خود غرضی اور طمع کی شکلیں ہیں۔ لیکن ایک اور دشمن بھی ہے جس کا نام ہے جہالت اور وہم پرستی۔ جہالت اور وہم پرستی کو عقل سے بَیر ہے اس لیے تہذیب سے بھی اس کی دشمنی ہے۔ قدیم یونان کو لوگ تہذیب کے نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ بجا بھی ہے۔ پھر بھی وہاں کم از کم ایک موقع پر جہالت نے اس طرح سر نکالا کہ سقراط کی جان لے کر چھوڑی،

کیونکہ وہ عقل کی بات کہتا تھا ۔ لیکن یونان کے دورِ تہذیب میں اس طرح کی بات آئے دن کی بات نہ تھی ۔ سمجھ بوجھ والے لوگ ہر قسم کے سوال اٹھاتے اور اہلِ علم ان کے جواب دیتے تھے ۔ جب تک یہ صورت قائم رہے ، اُمید کی جا سکتی ہے کہ تہذیب بھی قائم رہے گی ۔ لیکن جوں ہی جہالت اور وہم پرستی دلوں پر قبضہ کر لے ، سمجھ لیجیے کہ تہذیب کا خاتمہ ہوگیا ۔ جو شخص دنیا کو وہم پرستی کی عینک لگا کر دیکھتا ہے اس کو کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ سچی بات کو دیکھنے اور پہچاننے میں کیا مزہ ہے ۔ تہذیب زندگی کو ہر پہلو سے دیکھنے کی راہ بتاتی ہے اور جہالت انسان کی نظر کے سامنے ہر طرف پردے لٹکاتی ہے ۔ یہ پردے خواہ کسی بہانے سے آپ کے سامنے لٹکائے جائیں ، آپ کی عقل کا کام انہیں ہٹانا ہے تاکہ آپ کی آنکھیں اُس روشنی تک پہنچ سکیں جس کا نام تہذیب ہے ۔

☆ ☆ ☆

دوسری عالمی جنگ کے بعد

برعظیم کے لیے تعلیم کا سرکاری منصوبہ

یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو ، نئی دہلی ، سے ۱۴ - مئی ۱۹۴۶
کو نشر ہؤا -

جنگ کا خاتمہ جوں جوں قریب آ رہا ہے ، سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو فکر ہو رہی ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کا نقشہ کیا ہوگا - اس جنگ کی وجہ سے دنیا بھر میں اس طرح افراتفری رہی کہ دنیا والوں کو تن بدن کا ہوش نہ تھا - بڑا سوال یہ تھا کہ زندگی کو کس طرح بچائیں ، یہ نہیں تھا کہ زندگی کس طرح بسر کریں - تعلیم اس لیے دی جاتی ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آئے - لیکن جس وقت دنیا بھر کی قوموں کو یہ فکر ہو کہ لڑائی کس طرح جیتی جائے ، اس وقت بھلا یہ دھیان کس کو ہو سکتا ہے کہ زندگی بسر کرنے کے گُر کیا ہیں - پورے چھ برس تک ہم سب کی یہ حالت رہی کہ گویا جان بچانے کی خاطر چھپے بیٹھے ہیں - اب بھی لڑائی بالکل ختم نہیں ہو چکی ، لیکن ہمیں بھروسا ہے کہ لڑائی کا میدان ہم نے مار لیا ہے - اس لیے اب موقع ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ جب صلح اور امن کے دن آئیں گے تو اُجڑی ہوئی دنیا کس طرح آباد کی جائے گی اور ہمارے اس ملک میں زندگی کا رنگ ڈھنگ کیا ہوگا -

اس پر آپ شاید یہ پوچھیں کہ آخر اس قدر سوچ بچار کی کیا ضرورت ہے ؟ سب جانتے ہیں کہ تعلیم اچھی چیز ہے - تعلیم کے جو طریقے چھ سات برس پہلے جاری تھے ، کیوں نہ اب اُنھی پر توجہ دی جائے اور

آنھی کی بنیاد پر نئی عمارت کھڑی کی جائے ؟ اِس سوال کا جواب میں آپ کو ایک مثال کے ذریعے سے دوں گا - آپ نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ ۱۶۶۶ میں ، یعنی ہمارے زمانے سے تقریباً پونے تین سو برس پہلے ، لندن شہر میں آگ لگ گئی تھی - ہؤا یوں کہ ایک نانبائی کی دکان سے شروع ہو کر آگ دور دور تک پھیل گئی - مشرق سے لے کر مغرب تک پورا شہر چار دن تک دھڑا دھڑ جلتا رہا - ہزاروں عمارتیں جل کر خاک سیاہ ہوگئیں ، نواسی گرجا گھر (جن میں سینٹ پال کا بڑا گرجا بھی شامل تھا) ، بہت سی بڑی بڑی سرکاری عمارتیں ، چار سو بازار اور تیرہ ہزار سے زیادہ مکانات برباد ہوگئے - اس کے بعد لندن کی نئی تعمیر نئے رنگ میں شروع ہوئی - لندن والوں نے یہ خیال تک نہ کیا کہ اسی پرانے نقشے پر نیا شہر بسالیں ، بلکہ انھوں نے سوچا کہ پرانے شہر کی تباہی کے بعد اپنے لیے ایک بہتر شہر تعمیر کریں - چنانچہ جب نیا لندن بنا تو وہ ایک زیادہ صاف ستھرا ، زیادہ فراخ اور زیادہ خوبصورت شہر تھا -

جس طرح لندن ۱۶۶۶ میں جلا تھا ، اسی طرح ۱۹۳۹ میں اِس جنگ کی آگ جرمنی اور پولینڈ سے شروع ہوئی مگر جلد ہی تمام دنیا پر اس کا اثر پڑا اور کئی برس تک دنیا اِس سرے سے اُس سرے تک جلتی رہی - اب اِس جُھلسی اور اُجڑی ہوئی دنیا کی تعمیر نئے سرے سے ضروری ہے - ہمارا ہندوستان بھی باقی دنیا کی طرح اس آگ کی لپیٹ میں آیا ہے - جوں ہی پورا امن قائم ہوگیا ، ہماری کوشش یہ ہوگی کہ اپنے ملک کو پھر آباد کریں -

ہماری کوششوں پر سب سے پہلا حق تعلیم کو ہے ، کیونکہ ہماری زندگی کا کوئی کام ایسا نہیں جو تعلیم کے بغیر سلیقے سے انجام پا سکے - تعلیم صرف کتابیں پڑھ لینے کا نام نہیں ہے ، تعلیم اُس تیاری کا نام ہے جو ہمیں زندگی کے کاموں میں حصہ لینے کے قابل بناتی

ہے - جنگ کے ختم ہو جانے پر کئی لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ ہماری تعلیمی کوششیں پرانے ڈھب پر نہ ہوں بلکہ اُن میں بہت سی تبدیلیاں کی جائیں - ایک تو اس لیے کہ ہمارا پرانا طریقۂ تعلیم کوئی ایسا اچھا طریقۂ تعلیم نہ تھا ، اُس میں بہت سی خرابیاں تھیں - لاکھ خرابیوں کی ایک خرابی تو یہ تھی کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی - ہم اپنے ملک میں جمہوری طریقے کی حکومت یا حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں ، لیکن جہاں کروڑوں ایسے لوگ ہوں جو اپنا نام بھی نہ لکھ سکیں ، وہاں صحیح معنوں میں کوئی جمہوریّت نہیں ہو سکتی - اِس کے علاوہ جنگ کے بعد یوں بھی ملک کے حالات اتنے بدلے ہوئے ہوں گے کہ تعلیم کے پرانے طریقوں سے کام نہیں چلے گا - ہمارے لاکھوں سپاہی جنگ کے میدانوں سے چُھوٹ کر دیہات میں پہنچیں گے - پانچ چھ برس تک زندگی کا جو رنگ ڈھنگ وہ دیکھ چکے ہوں گے ، اپنے گھروں میں اُس کی تصویر اُنھیں نظر نہیں آئے گی - اُن کو کسی نئے زراعتی یا صنعتی کام میں لگانے کے لیے نئی قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا پڑے گا - اِس جنگ کے بعد ہندوستان کی صنعت و حرفت کو بہت ترقّی دی جا رہی ہے - اس مقصد کے لیے ملک بھر میں ہزاروں چھوٹے بڑے کارخانے قائم ہوں گے - ان کارخانوں کو جو لوگ چلائیں گے اُن کے لیے ہماری پرانی تعلیم سے کہیں زیادہ نئی صنعتی تعلیم کی ضرورت ہوگی اور اس وجہ سے بھی ہمیں اپنے طریقۂ تعلیم میں بہت سا ردّ و بدل کرنا پڑے گا -

یہ اور اِسی قسم کی اور بہت سی باتیں حکومتِ ہند کی نظر کے سامنے تھیں جن کی بنا پر اُس نے ایک سنٹرل ایڈوائزری بورڈ قائم کیا - اِس بورڈ کے سپرد یہ کام تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی تعلیمی ترقّی کے سوال پر پوری طرح غور کرے اور ایک مفصّل رپورٹ پیش کرے جس پر ہندوستان کے نئے طریقِ تعلیم کی بنیاد

رکھی جا سکے - یہ رپورٹ تیار ہو کر شائع ہو چکی ہے - اِس وقت اِس رپورٹ کی بعض ضروری اور قابلِ ذکر تجاویز آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں -

تعلیمی رپورٹ کی تجویزوں پر بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیے ہیں - کوئی رپورٹ اِتنی مکمّل نہیں ہو سکتی کہ اُس میں کہیں تبدیلی کی گنجائش نہ ہو - لیکن اس رپورٹ کی ایک خوبی ایسی ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا ، اور وہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان میں تعلیم کے سوال کو وہی بنیادی حیثیت دی ہے جو اُسے دوسرے ملکوں میں حاصل ہے - جنگ سے پہلے ہندوستان میں تعلیم کا درجہ یہ تھا کہ اس ملک کی آبادی میں تعلیم کے لیے ایک شخص کے حصے میں پونے نو آنے سالانہ کا خرچ آتا تھا ، حالانکہ برطانیہ میں ہر شخص کے لیے یہی خرچ بتیس روپے دو آنے سالانہ کے برابر تھا - جنگ کے ختم ہو جانے پر ہندوستان کے تعلیمی بجٹ کے لیے کروڑوں روپے الگ کر دینے کی تجویز ہے - اگر اِس تجویز پر عمل ہو سکا تو تیس چالیس سال کے اندر ہندوستان کا نقشہ بدل جائے گا -

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان میں ہر بچّہ ، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ، لکھنا پڑھنا شروع کر دے گا - اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے بچّوں کو کسی مدرسے میں داخل نہیں کرے گا ، اُس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا ہر بچّہ لکھنا پڑھنا شروع کر دے گا تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف شہروں اور قصبوں میں رہنے والے بچّے پڑھیں گے - چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں ، خواہ وہ شہری آبادی سے کتنا دور ہو ، بچوں کے لیے مدرسے کا انتظام کیا جائے گا - جوں ہی کوئی بچہ چھ سال کی عمر کو پہنچے گا ، وہ مدرسے میں داخل

ہونے پر مجبور ہوگا ۔ تعلیم کا سلسلہ چودہ سال کی عمر تک جاری رہے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر بچے کی تعلیم بالکل مفت ہوگی ، کسی بچے کو فیس نہیں دینی پڑے گی ۔ حکومتِ ہند کی تعلیمی رپورٹ کے اِس حصے کا ذکر کر دینا آسان ہے ، لیکن جب اس کے متعلق عملی کارروائی ہوئی تو کروڑوں کا خرچ اٹھے گا ۔ چنانچہ اندازہ یہ کیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم کو جبری اور مفت بنانے کے لیے دو ارب روپیہ خرچ ہوگا ۔

اگر معاملہ صرف یہیں تک رہ جاتا کہ حکومتِ ہند کی نئی تعلیمی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ہر بچہ آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کر لیتا اور بس ، تو بہت کم لوگ اس تعلیمی رپورٹ کی تعریف کرتے ، کیونکہ آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کر لینا ہی کسی انسان کی زندگی کا آخری مقصد نہیں ہو سکتا ۔ لیکن آٹھویں جماعت تک کی تعلیم اس رپورٹ کا صرف ایک حصہ ہے ۔ اس کے بعد بھی ہر لڑکے یا لڑکی کے لیے ایسی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا جو اُس کے حالات اور پسند کے مطابق ہو ۔ آج تک ہمارے ملک میں یہ دستور رہا ہے کہ مدرسے سے نکلنے کے بعد تقریباً ہر اچھے طالب علم کو بی ۔ اے ۔ یا ایم ۔ اے ۔ کرنے کا شوق ہوتا ہے ۔ چونکہ ملک میں صنعت و حرفت کو زیادہ ترقّی نصیب نہیں ہوئی تھی ، اس لیے اکثر طالب علم ، جو یونیورسٹی کی تعلیم کے لائق بھی نہ ہوتے تھے ، ناچار بی ۔ اے ۔ کی تیاری کے لیے کسی کالج میں داخل ہو جاتے تھے ۔ یہ بڑی مجبوری کی بات تھی ، لیکن امید ہے کہ جنگ کے بعد یہ مجبوری باقی نہ رہے گی ۔ جنگ سے متعلقہ صنعتوں کو گزشتہ تین چار سال میں کافی ترقّی ہوئی ہے ، اور امید کی جا سکتی ہے کہ ترقّی کی یہ رفتار آئندہ نہ صرف قائم رہے گی بلکہ بہت کچھ بڑھ جائے گی ۔ جنگ کے بعد ہندوستان کی صنعتی اور کاروباری دنیا کو خاص خاص کاموں کے

سمجھنے والے آدمیوں کی بے حد ضرورت ہوگی اور اُن کی تعلیم کے لیے بہت سے صنعتی مدرسوں اور کالجوں کا قیام ضروری ہوگا۔ جب کوئی طالب علم آٹھویں جماعت تک تعلیم پوری کر لے گا تو اُس کے لیے یہ لازم نہیں ہوگا کہ انٹرنس یا ہائر سیکنڈری سکول کے لیے صرف اِس مطلب سے تیاری کرے کہ آگے چل کر اُسے بی۔ اے۔ کی ڈگری لینی ہے۔ آٹھویں جماعت کے بعد دو قسم کے مدرسوں میں طالب علم کا داخلہ ممکن ہوگا۔ ایک تو ویسے مدرسے ہوں گے جیسے آج کل بھی بہ کثرت ہائی سکول موجود ہیں، لیکن اِن کے ساتھ ہی ٹیکنیکل ہائی سکول بھی کثرت سے قائم ہو جائیں گے۔ اِن مدرسوں کا رخ وہ طالب علم کریں گے جنھیں آرٹس کے مضمونوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے لیکن کسی صنعتی کاروبار میں اچھے کاریگر بن سکتے ہیں۔ آرٹس کے مضمون لینے کی اجازت صرف اُن طالب علموں کو دی جائے گی جن کی طبیعت کا رنگ اِن مضمونوں کے لیے خاص طور پر موزوں ہوگا۔ تعلیمی رپورٹ کے اِس حصے پر عمل کرنے کے لیے تقریباً دس کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔

لیکن صنعتی تعلیم کے انتظام کے علاوہ موجودہ یونیورسٹیوں کے طریقِ تعلیم میں بھی کئی تبدیلیاں کی جائیں گی، مثلاً ایف۔ اے۔ کا کورس اُڑا دیا جائے گا اور اسے مدرسے ہی میں پورا کر دینے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ مدرسے میں دس کے بجائے گیارہ جماعتیں ہوں گی۔ یونیورسٹی کا کورس چار سال کے بجائے تین سال میں پورا ہوگا۔ لیکن یونیورسٹی میں تعلیم کا معیار پہلے سے بلند کر دیا جائے گا۔ اس مطلب کے لیے قابل پروفیسر مقرر کیے جائیں گے۔ پروفیسروں کی تنخواہیں موجودہ تنخواہوں کے مقابلے میں بڑھا دی جائیں گی۔ یونیورسٹیوں کی اس اصلاح پر تقریباً پونے سات کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔

جس طرح یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے آج کل کے مقابلے میں

بہتر ہوں گے اور زیادہ تنخواہیں پائیں گے ، اسی طرح مدرسوں کے لیے بھی اچھّے استادوں کی بہت مانگ ہوگی اور چھوٹی جماعتوں کو پڑھانے والے استادوں کی تنخواہیں خاص طور پر بڑھا دی جائیں گی ، کیونکہ جو اثر بعض دفعہ بچپن کے استادوں سے ملتا ہے وہ عمر بھر قائم رہتا ہے ۔ لیکن اچھّے استاد ابھی کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں ۔ استادوں کو بھی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوگی اور اس غرض سے بہت سے ٹریننگ سکول اور ٹریننگ کالج قائم کیے جائیں گے ۔ اس تجویز پر غالباً چار پانچ کروڑ روپے خرچ ہوں گے ۔

کچھ عرصے سے ہمارے مدرسوں میں بچّوں کی جسمانی صحت پر بھی توجّہ ہو رہی ہے ۔ ورزش بھی کرائی جاتی ہے اور ڈاکٹری معائنے بھی ہوتے ہیں ۔ لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے ۔ مدرسے میں بہت سے بچے دن کے آخری حصے میں بالکل بھوکے رہتے ہیں ۔ جنگ کے بعد یہ کوشش کی جائے گی کہ ایسے بچّوں کے لیے کسی نہ کسی شکل میں خوراک کا انتظام کیا جائے اور ڈاکٹری معائنہ بھی سرسری نہ ہو بلکہ بچے کے بدن میں اگر کسی بیماری کا آغاز ہو تو اس کا شروع ہی سے علاج کیا جائے ۔

یہ سب سرکاری تجویزیں ہیں اور جہاں تک ممکن ہؤا ، اِن پر عمل کیا جائے گا ۔ لیکن کسی تعلیمی منصوبے کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے حکومت کے علاوہ عوام کی بھی پوری مدد حاصل ہو ۔ حکومت جس حد تک خود اِس فرض کو انجام دے سکتی ہے ، ضرور انجام دے گی ، لیکن ملک کے عام باشندوں کا بھی فرض ہونا چاہیے کہ اِن تعلیمی تجویزوں میں دل چسپی لیں اور اِن کو سمجھنے کی کوشش کریں ، کیونکہ حکومت کی تعلیمی تجویزوں کو پوری کامیابی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ عوام بھی دلی شوق سے سرکاری محکمۂ تعلیم کا ہاتھ بٹائیں ۔

☆ ☆ ☆

استقلالِ پاکستان کے بعد
تعلیمی زندگی کے بعض کوائف

یہ مضمون آزادیٔ وطن کے بعد اسلامیہ کالج ، لاہور ، کی پہلی سالانہ روداد کے اقتباسات پر مشتمل ہے ۔ اُس زمانے میں میرے محبّبِ قدیم شیخ غلام حسین ، اُستادِ معاشیّات و تاریخ ، کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے ۔ اُن کے رفقائے کار کا خاصا بڑا حصہ کالج کو چھوڑ کر پنجاب یونیورسٹی ، حکومتِ پنجاب اور بعض دوسرے سرکاری اداروں سے منسلک ہو چکا تھا اور وہ خود کالج کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے اپنے باقی ماندہ عملے کی مدد سے شبانہ روز جدّ و جہد میں مصروف تھے ۔ جون ۱۹۴۸ میں سالانہ روداد تیار کرنے کا حکم انھوں نے مجھے دیا اور موضوعاتِ کلام اور انتخابِ الفاظ کا معاملہ میری صواب دید پر چھوڑا ۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے میری اِس تجویز سے بھی اتفاق فرمایا کہ سالانہ جلسے کی پوری کارروائی (پہلی مرتبہ !) اُردو میں ہو ۔ میں نے جو روداد تیّار کی وہ اُنھوں نے ۳۰ ۔ جون ۱۹۴۸ کو بلا ترمیم "جلسۂ تقسیمِ اسناد و انعامات ۱۹۴۷ - ۱۹۴۸" میں پیش کی ۔ اس جلسے کے صدر "آنریبل سردار عبدالحمید دستی وزیرِ صحّتِ عامہ" تھے ۔ میں اس خطبے کی تاریخی خصوصیت کے پیشِ نظر اس کے اہم اقتباسات پروفیسر شیخ غلام حسین کی اجازت سے شاملِ کتاب کر رہا ہوں ۔

جناب سردار صاحب و حاضرینِ کرام ! میں اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کا شکریہ

ادا کرتا ہوں اور بالخصوص ، سردار صاحب ، آپ کا کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور گراں بار ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے ہماری دعوت بلا تامّل قبول فرمائی اور یہ ثابت کردیا کہ مدرسے کے در و دیوار اور حکومت کے ایوان ایک دوسرے سے کچھ بہت زیادہ دُور نہیں ہیں - ہمارا کالج پاکستان میں سب سے پرانا اسلامی کالج ہے اور ہمیں فخر ہے کہ آپ کی تشریف آوری کے ذریعے سے ہمارے صوبے کی خُرد سال قومی حکومت نے ہمارے کُہنہ سال کالج کے اُس حق کو تسلیم کر لیا جو بڑھاپے کو بچپن پر ہمیشہ حاصل رہا ہے -

اِس روداد کا موضوع ایک نہایت ہی غیر معمولی سال کے غیر معمولی واقعات و حالات ہیں - یہ وہ سال ہے جس میں پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا - اس سال آزادیٔ وطن نے ہم سے ہمارے خونِ حیات کا خراج مانگا اور دنیا جانتی ہے یہ خراج ہم نے کس طرح دل کھول کر ادا کیا - مشرق پنجاب کے چپّے چپّے پر ہماری لاشیں تڑپیں - دہلی سے لےکر لاہور تک کی سرزمین لہو کے اُن فوّاروں سے جو ہمارے بچّوں ، بوڑھوں اور نوجوانوں کی شاہ رگ سے اُبلے ، ابھی تک لالہ رنگ ہے - پھر بھی ہمیں کوئی گلہ نہیں - آزادی کی نعمت جس قیمت پر بھی ملے ، ارزاں ہے - مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہماری محدود و مجبور بشریّت مرنے والوں کے دُنیوی انجام پر انسانی درد و کرب کے چند آنسو ٹپکائے بغیر نہیں رہ سکتی - شہیدوں میں فرقِ مراتب کرنا دشوار ہے - آج ہماری قوم کے وہ بوڑھے جن کی پیرانہ سری کا نور اُن کی زندگی کی سفارش نہ کر سکا ، وہ ننّھے بچّے جن کی معصومیت بھی اُنھیں بے قصور ثابت کرنے میں ناکام رہی ، ہمیں سب سے پہلے یاد آتے ہیں - لیکن ان سے بھی زیادہ حق ہم پر ہماری اُن مظلوم بہنوں اور بیٹیوں کا ہے جو غیر قوم کی اسیری میں زندہ ہیں اور عذاب کے دن کاٹ رہی ہیں - اُن کی فریاد ہمارے

کانوں میں گونجتی ہے اور ہماری روح پر کپکپی طاری کر دیتی ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

جناب والا! یہ ہے گزشتہ سال میں ہمارے کالج کی سرگرمیوں کا پس منظر۔ اگر اِس سال ہمارے تعلیمی کارناموں کی داستان مختصر سی معلوم ہو تو یقیناً آپ کو تعجّب نہ ہوگا۔ آپ سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اسلامیہ کالج قومی تحریکات کے سلسلے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ مرگ و زیست میں بھی اِس کالج نے اپنی روایات کے شایانِ شان حصہ لیا۔ اس برس ڈیڑھ برس کے دورِ ابتلا میں کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر عمر حیات ملک اور کالج کے دیگر اساتذہ کی خدمات کا بیان تحصیلِ حاصل ہوگا۔ لیکن کالج کے صدہا طلبہ نے قوم کی دعوت پر جس والہانہ انداز میں لبّیک کہا، اُس کا مختصر سا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سرِ عنوان ہمارے جواں سال، جواں ہمّت اور جواں مرگ طالب علم محمد مالک شہید کا نام آتا ہے جو گزشتہ سال جنگِ آزادی کی ابتدائی منزلوں میں اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کرکے ہمیشہ کے لیے حیاتِ جاوداں کی تجلّی میں شامل ہو گیا۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ۔

سرفروشی کے اِسی جذبے کے ماتحت ہمارے اکثر طلبہ میدانِ عمل میں آترے اور کفر و اسلام کی اِس جاں گُسل کشمکش میں منزل بہ منزل وہاں تک آئے جہاں خاتمۂ جنگ پر لاکھوں پناہ گزیں پاکستان کے اُن علاقوں میں جمع ہو گئے جو ہندوستھان[1] کی سرحد سے متّصل تھے۔ مہاجرین کے امدادی مرکزوں میں ہمارے بہت سے طلبہ نے قابلِ ذکر خدمات انجام دیں۔ اس خاموش کام کا سلسلہ سالِ حال کے

۱۔ یہ املا اُس وقت کے عذاب انگیز جذبات کا آئینہ ہے۔ سنہ ۴۸ کے بعد میں نے ہمیشہ "ہندوستان" ہی لکھّا ہے، "ہندوستھان" کبھی نہیں لکھّا۔ (مصنّف)

ابتدائی زمانے تک جاری رہا۔

اِن حالات میں امتحانات اور اُن کے نتائج کا کوئی با ترتیب تذکرہ اور سال ہائے ماسبق سے ان کا موازنہ خارج از بحث ہے۔ یونیورسٹی کے امتحانات گزشتہ سال ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بے ترتیبی سے اور بے وقت ہوتے رہے۔ یونیورسٹی کی طرف سے متعلقہ اعداد و شمار کا کوئی مرتّب رسالہ بھی شائع نہیں ہوا جو نتائج کے ذکر کو مفید یا سبق آموز بنا سکے۔ اِس لحاظ سے میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ بعض دوسرے کوائف کے بیان کی طرف رجوع کروں۔

اس سال ۳۱۔ مارچ کو طلبہ کی تعداد ۱۳۳۰ تھی[1]۔ جس قدر یہ تعداد زیادہ تھی اُسی قدر پریشانی ہمیں اِس وجہ سے رہی کہ اساتذہ کی تعداد قطعاً ناکافی تھی۔ اس ناکافی تعداد میں بھی پیہم ردّ و بدل ہوتا رہا۔ اِس ضمن میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر عمر حیات ملک کا ہے جو گزشتہ سال پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوئے اور اس سال جنوری میں پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ اُن کے رخصت ہو جانے سے کالج اُن کی گراں قدر تعلیمی و انتظامی خدمات سے جو چار پانچ سال سے جاری تھیں، محروم ہوگیا۔ اِسی سال ہمارے شعبۂ تاریخ کے صدر اور علمِ تاریخ کے مسلّم الثّبوت اُستاد پروفیسر سیّد عبدالقادر اپنی طویل مدّتِ ملازمت ختم کر کے سبکدوش ہوئے۔ اِن کے بعد ڈاکٹر سردار محمد اختر پروفیسر معاشیات جو کچھ عرصہ قائم مقام پرنسپل رہے تھے، بہتر مشاہرے پر یونیورسٹی میں چلے گئے۔ اِن کے علاوہ کالج کے عملے سے جو اصحاب رخصت ہوئے اور جن نئے اساتذہ کا تقرر ہوا اُن کے متعلق تفصیلات بیان کر کے میں آپ کا وقت نہیں لوں گا۔ اساتذہ کا قحط پانچ سال ہوئے گزشتہ

۱۔ یہ کوائف اور اس سے اگلے پیرا گراف کے مذکورہ کوائف اپنی تاریخی اہمیت کے باعث شاملِ اقتباس رکھے گئے ہیں۔ (مصنّف)

جنگِ عظیم کے دوران میں شروع ہوا تھا - جنگ ختم ہوگئی مگر یہ قحط ختم نہیں ہوا بلکہ حالات مسلسل خراب تر ہوتے گئے - تاہم اِن نامساعد حالات میں جو کچھ ممکن تھا اُس کی سرانجام دہی میں ہم نے کوتاہی نہیں کی -

کالج کے کتب خانے میں اس سال ۲۷۱ کتابوں کا اضافہ ہوا - اگر ملک کے ناسازگار کاروباری حالات کا خیال کیا جائے تو ۲۷۱ کتابوں کا یہ اضافہ بھی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے - کالج کے دونوں اقامت خانے اِنھی حالات کی وجہ سے اس سال بے رونق رہے - مقیم طلبہ کی تعداد شروع میں پونے چار سو کے قریب تھی ، لیکن جوں جوں بد امنی بڑھی یہ تعداد کم ہوتی گئی - ۱۹۴۷ کے اخیر تک یہی کیفیّت رہی ، لیکن پھر حالات بتدریج سنبھلنے لگے اور اب دونوں اقامت خانوں میں پُرانی زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں -

پاکستان کے قیام کے بعد ہمارا نیا ماحول قدرۃً ایک نئے تعلیمی نظام کا تقاضا کرتا ہے - میرے نزدیک اِس نئے تعلیمی نظام کا محور دو نقطے ہیں - اسلامیّات اور اُردو زبان - اِسے اسلامیہ کالج کی خوش قسمتی سمجھیے کہ اپنے روزِ قیام سے لے کر اب تک قوم کی تعلیمی زندگی کی یہ دونوں اہم ضرورتیں اس کی نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں ہوئیں - گویا دوسری درس گاہیں تعلیم کے جن شعبوں کا از سرِ نو آغاز کریں گی ، ہم اُن کے ضمن میں محض ایک سلسلۂ قدیم کی تجدید کریں گے - اسلامیّات کو شروع سے ہمارے کالج کے تعلیمی پروگرام میں نمایاں حصّہ حاصل رہا ہے ، بلکہ گزشتہ چند سال سے ہم نے اس سلسلے میں کچھ مفید اضافے بھی کیے ہیں - اِن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر درس القرآن کی ایک روزانہ جماعت ہے جس میں کالج کے تمام طلبہ لازماً شریک ہوتے ہیں - ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ شعبۂ اسلامیّات کو ابھی بہت کچھ وسعت اور مزید تقویت کی ضرورت

ہے ، اور ہم انشاء اللہ بہت جلد اِس بارے میں کوئی نتیجہ خیز قدم اٹھائیں گے - ہماری کوشش یہ ہے کہ اسلامیات کی تعلیم کے ذریعے سے ہم اُس ذہنی انقلاب کا رستہ صاف کریں جس سے ہم پاکستان کے قیام کے باوجود اب تک محروم ہیں -

میرے نزدیک اِس افسوس ناک محرومی کی ایک وجہ انگریزی زبان کا موجودہ غلبہ اور اپنی قومی زبان سے ہماری موجودہ بے اعتنائی ہے - جناب والا ! مجھے انگریزی ادب کی رفعت اور پاکیزگی کا اعتراف ہے - ہم نے انگریزی شاعروں اور نثر نگاروں سے بہت کچھ سیکھا ہے - لیکن مجھے معاف فرمایا جائے اگر میں یہ کہوں کہ ہماری تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کو جو ہمہ گیر فوقیت دے دی گئی وہ ہمارے ذہنوں پر غلامی کی ایک مستقل مُہر بن کر ثبت ہوگئی - مجھے یقین ہے کہ ہمارے ذہنوں سے غلامی کے داغ اُس وقت تک نہیں دُھلیں گے جب تک انگریزی کی حاکمیّت کا بوجھ ہمارے دماغوں سے اُٹھا نہیں لیا جائے گا - ہم اپنی تہذیب و تمدّن کی صحیح قدر و قیمت سے اِس لیے نا واقف ہیں کہ ہم اُس کی عظمت کو ایک غیر زبان کے پیمانوں میں ناپتے ہیں - اِس غیر زبان کی خدائی کا لوہا جس طرح ہم مانتے ہیں اُس کا سب سے پہلا نفسیّاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیں من حیث القوم ایک احساس کمتری دیتی ہے اور ہماری فطری صلاحیّتوں کو فروغ دینے کے بجائے نقّالی کے میلان کو مضبوط کرتی ہے - اور یہ تو ظاہر ہے کہ ''نقل را چہ عقل'' -

اِس وقت ہمارے خیالات ، ہمارے مقاصد و عزائم ، ہماری معاشرت ، ہمارا قول و فعل کسی نہ کسی انگریزی اصل کا ترجمہ ہیں - اب وقت آ گیا ہے کہ اس دورِ ترجمہ کو ختم کیا جائے - اور اِس انقلاب کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ انگریزی زبان کا حاکمانہ اقتدار ، نظامِ تعلیم اور نظامِ حکومت میں ، بالکل نابُود کر دیا جائے اور اُردو زبان کو وہ جگہ

دی جائے جو ہر خوددار قوم اپنی زبان کو دیتی ہے۔

ہمیں شرم آتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک غیر زبان گھر کی رانی بنی بیٹھی ہے اور ہماری اپنی زبان کی حیثیت اُس کے سامنے ایک پیش دست سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم اُس وقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھیں گے، جب تک اُردو کو وہی حیثیت حاصل نہیں ہو جائے گی جو اِس وقت انگریزی کو حاصل ہے۔ اپنے محدود سے دائرۂ عمل میں ہم اُردو کو عنقریب اسلامیہ کالج کی کاروباری زبان بنا رہے ہیں۔ اور وہ دن دُور نہیں جب اس کالج میں اُردو کا ایک مستقل شعبہ قائم ہوگا[1]، جو شعبۂ اسلامیات کے ساتھ ہمارے کالج کے اہم ترین امتیازات میں شمار ہوگا۔

جناب والا! میں نے گزشتہ سال کے تعلیمی کام کا ذکر تھوڑی دیر پہلے معذرت آمیز الفاظ میں کیا تھا۔ درسیات و نصاب کے باب میں میرا یہ اعتذار گزارشِ احوالِ واقعی کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن درس و نصاب سے قطعِ نظر، تعلیم کا ایک وسیع تر مفہوم بھی ہے۔ اِس وسیع مفہوم میں ہمارا کم از کم ایک تعلیمی کارنامہ ایسا ضرور ہے جس کا ذکر نمایاں طور پر کرنے کے لیے مجھے یہاں کچھ گنجائش نکالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ طلبہ جب سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں تو معلمین کے لیے ایک بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انھیں بالآخر تعلیمی مشاغل کی طرف کس طرح لوٹایا جائے گا، کیونکہ میدانِ جنگ اور مدرسہ و خانقاہ کے نفسیات میں بُعد المشرقین ہے۔ ہم نے اپنے طلبہ کو گزشتہ سال کارزارِ سیاست میں اس لیے بلا تامل ڈال دیا کہ ملک کے نازک حالات کا تقاضا یہی تھا۔ لیکن، جیسے کچھ عرصہ پہلے قائد اعظم محمد علی جناح نے اسلامیہ کالج پشاور کے ایک

۱۔ یہ تفصیل اب دل چسپ معلوم ہوتی ہے کہ جون ۱۹۴۸ تک پنجاب کے کالجوں میں اُردو کے شعبے بھی قائم نہیں ہوئے تھے۔ (مصنّف)

جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے ، اب وقت بدل چکا ہے - اب طلبہ کے لیے لازم ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے بجائے اپنی تعلیم کی طرف رجوع کریں - اِن بدلے ہوئے حالات میں ہم نے گزشتہ چند مہینے قائدِ اعظم کے اِسی ارشاد کی تعمیل میں صَرف کیے ہیں اور میں خوش ہوں کہ بڑی حد تک کامیابی سے صَرف کیے ہیں - مشتعل جذبات کو سنبھالنا اور سیاست کے ہنگامہ زاروں سے منہ موڑ کر تعلیم و تعلّم کے حُجروں میں آ بیٹھنا بڑی نفس کُشی کا کام ہے - لیکن خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ سہ ماہی میں ہماری مسلسل تگ و دو بارور ہوئی اور ہمارے طلبہ ذہنی طور پر پھر اُسی منزل میں آ داخل ہوئے ، جہاں یہ سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ دست و بازو کی قوّت کے مظاہروں میں اگر ایک سرمستی ہے تو چراغِ نیم شبی کی لَو سے تہذیبِ نفس کا نور مانگنے میں بھی کچھ کم لذّت نہیں ملتی - یہ وہ منزل ہے جہاں اِس حدیثِ نبوی کے حقائق ذہن پر روشن ہوتے ہیں کہ عالم کی دوات کی روشنائی اور شہید کا خون مرتبے میں برابر ہیں -

لیکن اِس ابتدائی کامیابی پر ہم بالکل مطمئن نہیں ہوگئے - ہمیں خوب معلوم ہے کہ روحانی خلفشار کا وہ طوفان جو گزشتہ سال ہمارے نوجوان اور صاحبِ احساس طبقے میں برپا ہوا ، ابھی پوری طرح فرو نہیں ہو سکا - یہ طوفان اب چھپی ہوئی راہوں سے ہماری روح و دماغ پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے - آپ سے بڑھ کر اِس حقیقت کو کون سمجھے گا کہ جب کسی بڑے مقصد کے لیے جدّ و جہد کی جائے تو بارہا اس جدّ و جہد کے خاتمے پر اس کا ردِّ عمل افسردگی اور انتشار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے - گزشتہ سال ہم نے اپنے طلبہ کے جوشِ عمل کے شعلوں کو دہکایا اور اُنھوں نے قومی جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگا دی - لیکن اب اِس جنگ کے خاتمے پر محاسبے کا وہ وقت آ پہنچا ہے جب ان نوجوانوں کی نگاہیں

اپنی روزمرّہ کی زندگی میں ایک نئی اور بہتر صورتِ حال کو تلاش کرتی ہیں ، اُس انقلاب کو ڈھونڈتی ہیں جس کو ظہور میں لانے کے لیے گزشتہ سال اُنھوں نے زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں کیا تھا ۔ انسان کے لیے ، بالخصوص عنفوانِ شباب میں ، اِس سے زیادہ نازک مرحلہ اور کوئی نہیں ہے جب وہ ایک طرف اپنے نصب العین اور دوسری طرف زندگی کے روزانہ معمولات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرے ۔ اگر وہ نصب العین جس کے حصول کی خاطر کل ہم نے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا تھا ، آج عملی حیثیت سے محض خواب و خیال ثابت ہو تو انسانی روح کا کون سا احساس ہے جو تلخی میں ہمارے اِس احساسِ ناکامی کا مقابلہ کر سکے ؟

جناب والا ! آپ ہماری قومی زندگی کے رہنماؤں میں ہیں ۔ میری درخواست آپ سے یہ ہے کہ از برائے خدا ہمارے نوجوانوں کی روح کو اِس احساسِ شکست کی تلخی سے محفوظ کر دیجیے ۔ اُنھیں یہ یقین دلا دیجیے کہ گزشتہ سال جس بلند نصب العین کی خاطر ہماری قوم نے جان و مال کی قربانیاں آزادی کی راہ میں بے دریغ ڈال دیں ، وہ نصب العین واقعی قابلِ حُصول تھا اور اس کا عکس ہماری عملی زندگی پر پڑ سکتا ہے اور پڑ رہا ہے ۔ ہم اہلِ مدرسہ اپنے درویشانہ انداز میں اس نصب العینی زندگی کی صرف ذہنی جھلک اپنے طلبہ کو دکھا سکتے ہیں ۔ آپ سے ہمیں یہ توقّع ہے کہ آپ اپنے تدبّر اور فراست سے مثالی اور حقیقی زندگی کی یہ خلیج پاٹ دیں گے ، اور ہمیں موقع بہم پہنچائیں گے کہ جب ہم اپنی نگاہیں اپنے حجرۂ درویشی سے باہر دوڑائیں تو گرد و پیش کی زندگی کی طرف اشارہ کرکے اپنے طلبہ سے یہ کہہ سکیں کہ دیکھو ، ہماری آزاد قومی زندگی نصب العین اور عمل دونوں لحاظ سے کس قدر ہم آہنگ ہے ۔

☆ ☆ ☆

ناکام طالب علم کی آپ بیتی

یہ مضمون ریڈیو پاکستان، لاہور، سے بتاریخ ۲ نومبر ۱۹۴۸
نشر ہؤا۔

جی ہاں، میں بطور طالب علم کے ناکام رہا۔ میں نے کسی امتحان میں نہ کوئی انعام لیا، نہ کبھی کوئی وظیفہ پایا۔ میں کھِچ گھسٹ کر بی۔ اے۔ تک پہنچ تو گیا مگر میرا نام مدرسے اور کالج کی تعریفی رپورٹوں میں کبھی نہ آ سکا۔ میں نے بعض جماعتوں میں ایک ایک کے بجائے دو دو برس لگا دیے، لیکن وہ نیک نامی جس سے والدین کے دل کھِلتے ہیں، میرے مقدّر میں نہ تھی۔ میرا تعلّق طالب علموں کے اُس جانے پہچانے گروہ سے تھا جو ہمیشہ جماعت کے پچھلے بنچوں پر اپنی نشست بناتے ہیں اور اُستاد سے شاباش کا لفظ کبھی نہیں سنتے۔ طالب علموں کا یہ بے زبان گروہ ہر روز اپنے خلاف بہت کچھ سنتا ہے اور خاموشی سے سر جھکا دیتا ہے۔ لیکن ناکام طالب علم کی زبان اگر کبھی کھُل سکتی تو مایوسی اور محرومی کے کتنے افسانے زندگی کا جامہ پہن لیتے، شکوہ و شکایت کے کتنے ہی ایسے دفتر کھُلتے کہ ملک کے اہلِ تدبیر اور قوم کے راست رَو اپنی گردنیں جھکا دیتے! مگر ناکام طالب علم کی زبان کبھی نہیں کھُلتی، وہ اپنے حق میں کبھی آواز نہیں اُٹھاتا۔ قوم کے راست رَو اُسے ایک لاعلاج انسان سمجھ کر مطمئن رہتے ہیں۔ ملک کے اہلِ تدبیر اِس یقین میں مگن ہیں کہ یہ پھسڈّی شخص اُسی اندھیرے میں بھٹک رہا ہے جس سے باہر نکلنے کے لیے

اِس کے پاؤں کبھی حرکت میں نہیں آئے ۔

چلیے میں آپ کی خاطر ، اور قوم کے روحانی اطمینان کی خاطر ، یہ مانے لیتا ہوں کہ سب قصور میرا ہے ۔ اس کے بعد آپ شاید مجھے ایک سوال کرنے کا حق دیں جس کا جواب مجھے آج تک نہیں مل سکا ۔ میں خود کچھ ایسا قابل آدمی نہیں ہوں کہ مشکل سوالوں کا جواب دے سکوں ۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ناکام طالب علم انسان کی کوئی نئی قسم ہے جو کوشش کرنے سے دور بھاگتی ہے ، جس کی فطرت میں نئی باتیں سیکھنے کے لیے کوئی تڑپ نہیں ، جسے ترقّی سے نفرت ہے ؟ میرا اپنا دل کہتا ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے ۔ میں نے کبھی کوئی چھوٹا بچّہ یا لڑکا ایسا نہیں دیکھا جس کی طبیعت میں جستجو کا مادہ نہ ہو ، نہ کوئی ایسا آدمی میری سمجھ میں آ سکتا ہے جو اپنی زندگی کو بہتر بنانا نہ چاہتا ہو ۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلے پہل مدرسے گیا تو میں نے بڑے شوق سے نئے کپڑے پہنے تھے اور جی میں یہ ٹھانی تھی کہ میں اچھّا لڑکا بنوں گا ۔ ہمارے ماسٹر صاحب ہمارے قصبے کے رہنے والے نہ تھے ، پاس کے ایک گاؤں سے آتے تھے ۔ بڑے اچھّے آدمی تھے ۔ پہاڑے اُنھیں خوب یاد تھے ۔ ہمیں اپنے گھر کی سب باتیں بھی سنا دیا کرتے تھے ۔ گو لکھائی پڑھائی کا کام زیادہ نہیں کراتے تھے مگر پہاڑے خوب سنتے تھے ۔ پوری جماعت لہک لہک کر پہاڑے گاتی تھی اور ماسٹر صاحب سو جاتے تھے ۔ کبھی کبھی اُن کی آنکھ کھلتی تو وہ لڑکے پکڑے جاتے جو پہاڑے سنانے کے بجائے کسی اور کام میں لگ جاتے تھے ۔ اُن کی خوب مرمّت ہوتی ۔ خود مجھ پر کئی مرتبہ ماسٹر صاحب کا بید اُٹھا ۔ پہاڑے تو اب بڑی حد تک بھول چکا ہوں مگر اُنگلیوں پر جو نیل پڑ جاتے تھے ، وہ آج تک یاد ہیں ۔ لیکن اِس یاد میں کوئی غصّہ شامل نہیں ہے ۔ پٹنے کے باوجود ہمیں

ماسٹر صاحب پر کبھی غصّہ نہ آتا تھا ۔ در اصل ماسٹر صاحب تھے بڑے ہمدرد ۔ سالانہ امتحان میں بہت سے لڑکے فیل ہو گئے تو ماسٹر صاحب نے اکثروں کو پاس کرادیا ۔ میں اُن خوش نصیبوں میں نہ تھا ۔ ماسٹر صاحب نے میری رونی صورت دیکھی تو کہا : ''اچھا بھئی تمھیں بھی پاس کرا آئیں !'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے ۔ تھوڑی دیر بعد واپس ہوئے تو یہ خوش خبری لائے کہ مجھے بھی اگلی جماعت میں ترقّی مل گئی ۔

اپنی تعریف اپنے منہ کرنا اچھّا نہیں ہوتا ، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگوں نے ، خواہ ہم لائق تھے یا نالائق ، اپنے اُستادوں کی بڑی خدمت کی ۔ ہمارے اُستادوں کی تنخواہیں کم تھیں ، گھر کے کام کاج کے لیے نوکر نہ رکھ سکتے تھے ۔ اس لیے مجبوراً یہ خدمت ہم سے لیتے تھے ۔ ہم خوشی خوشی یہ سب کام کرتے تھے ۔ مدرسے کے وقت کے بعد فرصت کا اچھا خاصا حصّہ اِسی خدمت میں کٹتا تھا ۔

جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو عربی کی چوتھی کتاب پڑھنی شروع کی ۔ عربی کے مولوی صاحب کی تنخواہ صرف پندرہ روپے تھی ۔ وہ بیچارے عیال دار آدمی تھے ۔ بھلا پندرہ روپے میں کیا گزر ہوتی ۔ اُنھوں نے معلّمی کے ساتھ ساتھ کچھ اور کام بھی لگا رکھّے تھے ۔ چنانچہ طبابت بھی کرتے تھے ۔ بارہا اُن کے مریض سبق کے دوران میں نبض دکھانے کے لیے آتے ۔ اس میں بڑا لطف رہتا ۔ مریض اور معالج کے مکالمے کو ہم لوگ بڑی دل چسپی سے سنتے ۔ میں اپنی نالائقی کا اعتراف پہلے کر چکا ہوں ، لیکن اس اعتراف کے باوجود یہ کہوں گا کہ کچھ ایسا کُند ذہن بھی نہیں ہوں ۔ عربی تو جو سیکھی سو سیکھی لیکن لعوقِ سپستاں اور جوارشِ جالینوس کا وہ چرچا سنا کہ نویں جماعت پاس کر کے نکلا تو نیم حکیم بن چکا تھا ۔ مولوی صاحب کو عربی آتی تھی یا نہیں ، یہ وہ شخص کہے جو خود

عربی جانتا ہو۔ میرے بعض ہم جماعت مولوی صاحب کو شرارت سے تنگ کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے کسی لفظ کے جو معنی بتائے، ان شرارت پسندوں نے لغت کا حوالہ دے کر اُس سے مختلف معنی بتا دیے۔ شاید مولوی صاحب لغت دیکھ کر نہیں آتے تھے یا کچھ اور بات تھی مگر بارہا یہ ہوا کہ شرارت پسندوں کی جیت رہتی اور مولوی صاحب ہار جاتے۔ مگر آفرین ہے مولوی صاحب پر کہ وہ ہار کر بھی ہار نہیں مانتے تھے اور کسی نہ کسی طرح سے اپنے ایجاد کردہ مفہوم اور لغوی معنوں کا جوڑ ملا دیتے تھے۔ ایسے ہر معرکے میں مولوی صاحب کا پلّہ بھاری رہتا اور شرارت پسند بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ سبق میں ''ظلمت'' کا لفظ آیا۔ مولوی صاحب نے اس کے معنی بتائے ''مرغی''۔ کسی نے کہا: ''مگر مولوی صاحب! لغت میں اس لفظ کے معنی لکھے ہیں 'اندھیرا'۔'' اس پر مولوی صاحب گھبرائے نہیں بلکہ مسکرائے اور ہم اُن کی حاضر جوابی پر عش عش کرنے لگے جب اُنھوں نے فرمایا: ''واہ رے پگلے! یہ کیا بات کہہ دی! 'اندھیرا' درست ہے لیکن اس لفظ کے معنی 'مرغی' بھی آئے ہیں۔ کبھی گھر کے صحن میں مرغی کو دیکھا نہیں کہ کس طرح اپنے بچوں کو پیچھے لیے لیے پھرتی ہے؟ مگر آسمان پر چیل منڈلا رہی ہے۔ وہ جھپٹ کر نیچے اُتری، مرغی نے بچوں کو چھپانے کے لیے اپنے پر پھیلا دیے۔ صحن میں ہر طرف دھوپ ہے مگر مرغی کے پروں کے نیچے کیا ہے؟ اندھیرا! سو 'ظلمت' کے معنی 'اندھیر' بھی آئے ہیں اور 'مرغی' بھی۔''

یہ ہے خلاصہ عربی زبان کے ساتھ میرے تجربات کا۔ اسے میری بدقسمتی کہیے کہ ایسے طبّاع استادوں کی خدمت میں حاضر رہ کر بھی میں محروم رہا۔ مگر یہ عربی زبان کی برکت ہے کہ بے علمی کے باوجود ہر امتحان میں کچھ نہ کچھ نمبر مل ہی رہتے تھے۔ اور میں

فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں عربی میں کبھی فیل نہیں ہوا۔

انگریزی کے متعلق البتہ میری نالائقی مسلّم ہے۔ مجھے افسوس صرف یہ ہے کہ اس معاملے میں میری نا اہلی کے ساتھ میری بدقسمتی بھی آ شامل ہوئی، یعنی جب انگریزی نہ آئی تو اس کا وبال دوسرے مضمونوں پر بھی پڑا۔ شاید اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوگی کہ علم، انگریزی کے سوا اور کسی زبان میں نازل نہیں ہوا۔ لیکن اس کا اثر ہم لوگوں پر، جنھیں انگریزی نہیں آتی، بہت برا پڑا۔ ایک اس زبان کے نہ آنے سے ہم پر علم کے سب دروازے بند ہو گئے۔ میرا حافظہ اچھّا ہے اس لیے انٹرنس کا امتحان میں نے ہمّت کر کے پہلی ٹکّر میں پاس کر لیا۔ اصل مصیبت کالج میں آ کر شروع ہوئی جب انگریزی زبان نے ہر بات میں دخل دینا شروع کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ اور معاشیّات میں میری حالت کچھ ایسی بری نہ تھی لیکن ان دونوں مضمونوں میں بھی مجھے میری انگریزی نے مارا۔ سوال کا جواب ٹھیک ہے مگر انگریزی ٹھیک نہیں۔ میرے آدھے نمبر میری ٹوٹی پھوٹی انگریزی کھا جاتی تھی۔

یہی حال میرے بعض ایسے دوستوں کا تھا جو نفسیّات یا جغرافیہ پڑھتے تھے۔ کچھ ایسے غبی نہ تھے مگر انگریزی کے قُفل کی کُنجی اُن کے ہاتھ میں نہ تھی۔ کالج کے لیکچروں کا کچھ حصّہ سمجھتے تھے، کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اُستاد نے پوچھا: ''سمجھ گئے؟'' اب ان میں یہ ہمّت نہیں کہ انگریزی کا ایک سیدھا فقرہ جوڑ سکیں۔ کس منہ سے کہیں کہ کتنی بات سمجھے ہیں اور کتنی نہیں سمجھے! سہمے ہوئے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پانچ سات، دس پندرہ لڑکوں کی جماعت ہوتی تو اُستاد شاید ہر کسی کے حال پر کچھ توجہ کر بھی لیتا، لیکن ہماری جماعتیں ماشاءاللہ سَو سَو، سوا سوا سَو کی ہوتی تھیں۔ اُستاد اِس ہجوم میں کِس کِس کی خیریّتِ مزاج پوچھتا؟ اور پھر

کالجوں میں تو دستور بھی کچھ ایسا ہی بن گیا ہے کہ استاد ہر پانچ منٹ کے بعد رسمی طور پر پوچھتا ہے : "سمجھے ؟" اور اس کے بعد جواب کا انتظار کیے بغیر ، ہوا کے گھوڑے پر سوار ، آگے نکل جاتا ہے - مجھے اپنی کیفیّت یاد ہے کہ کبھی کبھی استاد کی نگاہیں اپنے چہرے پر جمی ہوئیں پاتا - لیکن "سمجھ گئے ؟" کا جواب کس زبان میں دیتا ؟ یہ میرے بس کا روگ نہ تھا - ناچار "ٹُک ٹُک دیدم دم نہ کشیدم" کے مقولے پر عمل کرتا -

اُن دنوں میرا اور میرے ہم مشرب طالب علموں کا دستور یہ تھا کہ مضمون کو سمجھے بُوجھے بغیر اپنی کتابوں کے صفحے کے صفحے رٹ لیتے تھے - بی - اے - تک آتے آتے ہمارا یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ دنیا کا ہر علم انگریزی زبان میں ہو - چنانچہ ہم راضی برضا ہو کر کتابیں رٹنے میں لگے رہتے تھے - اور مجھے تو اس کا یقین ہے کہ رٹنے کے بغیر امتحان میں کامیاب ہونا اچھے طالب علم کے لیے بھی ممکن نہیں - کسی امتحان کا کوئی پرچہ اُٹھا کر دیکھ لیجیے - آدھے سے زیادہ سوالات ایسے ہوں گے جو ہماری علمی واقفیّت کا نہیں ، محض حافظے کا امتحان لیتے ہیں - بلکہ مجھے تو کبھی کبھی یہ شبہہ ہونے لگتا ہے کہ امتحان میں کامیاب ہونا قابلیّت کا ثبوت ہے بھی یا نہیں ؟ میرے نزدیک علم حاصل کرنا اَور چیز ہے اور امتحان پاس کرنے کا گُر جاننا اَور چیز - میں ایک ناکام طالب علم ہوں ، اس لیے میری رائے شاید مشتبہ سمجھی جائے - لیکن عملی زندگی پر نظر دوڑائیے تو بڑے بڑے نمبر لینے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور بعض میرے ساتھی سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں - مجھے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بے رٹے امتحان پاس نہیں ہوتا - اور پھر رٹنا بھی تو ایک کمال ہے - اس میں ہم نے وہ وہ کارنامے کیے کہ اور کوئی کہے یا نہ کہے ، ہم خود شاباش کہتے تھے - مثلاً انگریزی میں ہمارے لیے

جو ناول مقرّر تھا، خود اُسے میں نے مطلق نہیں پڑھا تھا۔ لیکن اِس پر بھی مجھے ہر قسم کے سوال کا جواب یاد تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں کہ اُس ناول کی کہانی کیا تھی۔

انگریزی پڑھنے کی تو خیر ہر کسی کو مجبوری تھی، مگر باقی مضامین کے انتخاب میں ہمیں کسی حد تک آزادی حاصل تھی۔ بظاہر ہم اپنے اختیار سے تاریخ یا فلسفہ یا سائنس، جو مضمون جی چاہے، پڑھ سکتے تھے۔ لیکن اس خوبی میں بھی ایک خرابی نکل آتی تھی۔ اب خدا جانے اِس میں ہماری نالائقی کو دخل تھا یا ہماری بد قسمتی کو کہ ہم اپنے اِس حق کا استعمال بھی صحیح طور پر نہ کر سکتے تھے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ میرے ساتھیوں میں کئی ایسے بھی تھے جو سال بھر اِس بات پر پچھتاتے کہ کاش "یہ" مضمون نہ لیا ہوتا اور "وہ" لیا ہوتا۔ داخلے کے فوراً بعد آٹھ دس دن تک مضمونوں میں تغیّر و تبدّل اکثر ہوا کرتا تھا۔ مگر اس کے بعد انتخاب شدہ مضمونوں پر گویا مُہر سی لگ جاتی۔ بعض طالب علم ایسے بھی ہوتے تھے جن پر یہ انکشاف ذرا دیر سے ہوتا کہ مضمون کا انتخاب غلط ہوگیا، لیکن ابتدائی ایجاب و قبول کے بعد اِس انتخاب کو ایسی پختگی حاصل ہو جاتی کہ طالب علموں کو دو دو برس تک اُسی مضمون پر سر پھوڑنا پڑتا۔ ناچار بعض لوگ رٹنے کے لیے کمرِ ہمّت کَس لیتے۔ بعض کم ہمّت کالج کو چھوڑ کر بھاگ نکلتے۔ جو رہ جاتے اُن میں سے اکثر فیل ہو جاتے۔ میں نالائق طالب علموں کی حمایت نہیں کرتا، مگر ایک خدا لگتی بات کہنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ طالب علم جب انٹرنس پاس کر کے کالج میں پہنچتا ہے تو وہ قطعاً بے خبر ہوتا ہے کہ فلسفہ کیا بلا ہے، معاشیات کا کیا موضوع ہے اور سائنس کی راہ میں کیسے کیسے سخت مقام آتے ہیں۔ اِس ناواقفیّت کے عالم میں وہ تقدیر کی بازی لگاتا ہے۔ کوئی نہیں جو

اُس کی صحیح رہنمائی کرے، کوئی نہیں جو اس کی طبیعت اور رجحان کا جائزہ لے اور بتائے کہ تمھارے لیے فلاں راستہ درست ہوگا اور فلاں غلط۔ داخلے کے دن اُس نے اتفاق سے جس مضمون پر اُنگلی رکھ دی، وہی اُس کی سرنوشت بن گیا۔

معاف کیجیے، یہ ذکر کرتے کرتے میرے لہجے میں شاید کچھ تلخی آ گئی۔ مگر یہ اِس لیے ہوا کہ جو کچھ میں نے عرض کیا، وہ جگ بیتی نہیں، آپ بیتی ہے۔ آج اِس عمر کو پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہے کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد مجھے دراصل کیا کرنا چاہیے تھا۔ کاش اُس وقت مجھے کوئی سمجھا دیتا کہ کالج کی زندگی تم جیسوں کے لیے نہیں ہے۔ لیکن کالج کے سبق رٹنے کے علاوہ تمھارے لیے ایجاد و اختراع، خدمت اور ادائے فرض کے وسیع میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کالج کی طالب علمی کے لیے موزوں نہ تھا، لیکن دستکاری اور صنعت و حرفت میں یقیناً مفید کام کر سکتا تھا، اور عجب نہیں کچھ نام پیدا کرتا۔ مگر تقدیر کے لکھّے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اب میں بی۔ اے۔ پاس کر چکا ہوں۔ آپ میرے بی۔ اے۔ پاس کر لینے کو معجزہ سمجھیں گے۔ ایسے بیسیوں معجزے ہمارے ملک میں ہر سال ہوتے ہیں۔ اِن معجزوں کے آثار آپ کو ہمارے دفتروں کی کرسیوں پر بیٹھے، میزوں کے سہارے سر تھامے، جا بجا نظر آئیں گے۔ میں بھی اِنھی میں سے ایک ہوں۔

یونیورسٹی ایک مشین ہے، ہم اس کے لیے انسان نہیں، اجناس ہیں۔ اس مشین کے کچھ پرزے ہمیں امتحانوں کے ڈھروں کے درمیان رکھ کر پیستے ہیں، کچھ اور پرزے ہمیں چکّر دے کر ایک خاص نُقطے پر لاتے ہیں، اور پھر ایک ٹھپّہ لگا کر ہمیں باہر دھکیل دیتے ہیں۔ ہمارے اُستادوں کو خبر نہیں ہوتی کہ ہمارے نام کیا تھے، ہماری طبیعتوں کا رنگ کیا تھا۔ اور خبر ہو بھی تو کیونکر؟ یک انار و

صد بیمار کا معاملہ ہے۔ کسی کالج کے کمروں پر جا کر نظر ڈالیے۔ بارہا یہ کمرے آپ کو طالب علموں سے اس طرح بھرے ہوئے ملیں گے کہ آپ کو تعجب ہوگا اِتنی سی جگہ میں اِتنے آدمی کس طرح سما گئے۔ ایسے کمروں میں اُستاد پڑھانے کے بجائے صرف تقریر کرتا ہے۔ اِتنی عمر سکولوں اور کالجوں میں گزار کر بھی مجھے یہ حسرت ہی رہی کہ کوئی ایک اُستاد ایسا نصیب ہوتا جس کی ذاتی توجّہ کا کچھ حصّہ مجھے ملتا، جس کے لیے میں کسی ہجوم کا ایک فرد نہیں بلکہ ایک مستقل شخصیّت، ایک انسان ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نالائق شاگرد بھی کسی حد تک اصلاح پذیر ہے، بشرطیکہ اُستاد اُس پر ویسی ہی توجّہ کرے جیسی انسان، انسان پر کرتا ہے۔ طالب علم کی توجّہ اسی لیے منتشر رہتی ہے کہ اُسے اُستاد سے کوئی ذاتی تعلّق نہیں ہوتا۔ توجّہ کا انتشار نالائقی کی جڑ ہے۔ لیکن یونیورسٹی کی مشین کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ اُستاد کا ذاتی اِلتفات شاگرد کی توجّہ کو صحیح رُخ پر لا کر اس کی تربیت کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سعادت آج کل کے شاگرد کو کہاں نصیب ہوتی ہے! ہمارے اُستاد کسی اور ہی عالَم سے ہم کو دیکھتے ہیں۔ جس طرح قید خانے کا داروغہ قیدیوں کو اُن کے نمبروں سے پہچانتا ہے، اسی طرح وہ بھی سال سال دو دو سال ہماری حاضری لیتے ہوئے ہمارے نام نہیں، ہمارے نمبر پکارتے ہیں اور بعد کی زندگی میں اگر کبھی ملاقات ہو جائے اور وہ ہمیں پہچان بھی لیں تو اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے:

"Hullo! Roll mumber one eighty-nine!"

☆ ☆ ☆

زبانوں کی تعلیم کا مسئلہ

یہ تقریر انجمنِ حمایتِ اسلام، لاہور، کے جلسۂ سالانہ منعقدۂ مارچ ۱۹۴۹ میں کی گئی۔

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

پاکستان میں زبانوں کی تعلیم کا مسئلہ ہماری قومی زندگی کی تشکیلِ جدید کا ایک پہلو ہے۔ جس رستے پر پاکستان کے جمہور چلیں گے اور چلائے جائیں گے، اُسی کے متوازی ہمارے نظامِ تعلیم میں ہماری زباں دانی کی کوشش بھی جاری ہوگی۔ میرے نزدیک اس مسئلے کے چار رخ ہیں:

اول، ہم ایک نوزائیدہ ملک ہیں، اس لیے ہم پر لازم ہے کہ اپنی ملکی زبان کو سیاست اور کاروبارِ ملک میں وہ جگہ دیں جس سے وہ اب تک محروم تھی۔

دوسرے، ہم ایک قدیم ملّت ہیں، اِس لیے لازم ہے کہ اپنی مِلّی زبان سے وہ صحیح تعلّق پیدا کریں جس کے بغیر ہم اپنی جماعتی ہیئت کی بنیادوں سے بے خبر رہتے ہیں۔

تیسرے، ہم ایک عظیم الشان تہذیب کے وارث ہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیبی زبان سے مناسب ربط قائم نہ رکھیں تو ہم اپنی تہذیبی روایات سے خود بخود کٹ جاتے ہیں۔

اور چوتھے، ہم ایک ترقّی پسند مملکت ہیں جسے شب و روز اپنے مستقبل کی تعمیر سے سروکار ہے۔ اس کے لیے ایک ایسی زندہ زبان کی

ضرورت ہے جو ہمارے لیے اب ، اور آگے چل کر ، ضروری علوم و فنون کی ترجمان بنے -

اگر یہ چاروں کام چار مختلف زبانوں کے بجائے صرف دو یا تین زبانوں کے ذریعے سے نکل سکیں تو ہمیں یقیناً سہولت ہو جاتی ہے - مثلاً عربی ممالک میں ملکی اور مِلّی زبان ایک ہی ہے - اسی طرح ایرانیوں کو اپنی بیشتر تہذیبی روایات فارسی زبان ہی میں مل جاتی ہیں اور جرمنوں کو سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے روسی یا انگریزی کا جاننا ضروری نہیں ہوتا - لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ، اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی کوئی سہولت ہمارے لیے پیدا نہیں کی - اگر ہم چار مختلف زبانیں نہ سیکھیں تو کہیں نہ کہیں کوئی خلا رہ جاتا ہے - جدید علوم و فنون کا جاننا اور انگریزی [یا کسی دوسری یورپی زبان] سے واقفیت ہمارے لیے لازم و ملزوم ہیں - اپنے پیش رووں کے گزشتہ ہزار سالہ تمدنی کارنامے فارسی پڑھے بغیر ہمارے لیے ایک اَن سُنی کہانی رہ جاتے ہیں - اگر ہم عربی زبان سے کورے ہوں تو مذہب کی روشنی سے محروم رہتے ہیں اور آخر میں اردو ، گو ہمارے ملک کی بولی نہیں ہے ، مگر ہماری قومی زبان ہے - اور قومی زبان کے بغیر ایک ملک اور ایک قوم کا دعویٰ مہمل سا معلوم ہوتا ہے -

یہ مشکل دراصل اتنی پریشان کن نہیں ہے جتنی اس طرح کھول کر بیان کر دینے سے معلوم ہوئی - اکثر یورپی ملکوں کو صدہا سال تک بالکل اسی صورتِ حال کا سامنا رہا - ملکی زبان کے علاوہ دو کلاسیکی زبانیں — لاطینی اور یونانی — لازمی حیثیت سے شاملِ نصاب تھیں اور ایک چوتھی زبان — فرانسیسی — مدتوں تک یورپ بھر میں تہذیبی معاملات اور بین الاقوامی مذاکرات کی زبان بنی رہی -

میری گزارشات کا موضوع یہ ہے کہ ان چار زبانوں کی حیثیت ہمارے نصابِ تعلیم میں کیا ہونی چاہیے اور ہر زبان کی تعلیم کے کن

خاص پہلوؤں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے :

اردو کے متعلق اتنا کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اِس سلسلے میں دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی - مستقبلِ قریب میں یہ نہ صرف ہماری ادبی تخلیق بلکہ ہمارے تمام ملکی کاروبار اور سماجی میل جول کی زبان ہوگی - اس لحاظ سے نظامِ تعلیم میں اِس کی حیثیت بنیادی ہے - ذریعۂ تعلیم بننے کے علاوہ اسے مدرسے میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک ایک لازمی مضمون کا درجہ ملنا چاہیے - لیکن میں اُن اصحاب سے متّفق نہیں ہوں جو اِس بات پر (ظاہر ہے نیک نیتی سے) زور دیتے ہیں کہ اردو کی تعلیم ایف - اے - کی منزل تک لازمی ہونی چاہیے - صفائی اور ڈھنگ سے کسی زبان کا لکھنا اور بولنا سکھانے کے لیے دس سال کی مدت کافی ہوتی ہے اور دنیا کا دستور بھی اسی کے حق میں ہے - اگر ہم اردو کی تعلیم کو کالج کی منزل تک لے جائیں گے تو گویا اردو کے بُت کو اسی طرح پوجنا شروع کر دیں گے جس طرح اب تک انگریزی کی ناواجب پرستش ہوتی رہی ہے - کالج کی منزل اردو زبان کے بجائے اردو ادب کے بلند تر مطالعے کے لیے وقف رہنی چاہیے اور یہ مطالعہ اختیاری مضمون کی حیثیّت سے ہو نہ کہ لازمی مضمون کی حیثیّت سے -

جو بات بہت ضروری ہے ، وہ یہ ہے کہ مدرسے کی ابتدائی جماعتوں ہی سے اردو زباں دانی کا معیار بلند کیا جائے - مجھے تسلیم ہے کہ یہ کہنا آسان اور کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی اس طرف توجّہ ہو تو رفتہ رفتہ کچھ ہو جائے گا - بہتر اُستاد ، بہتر نصاب ، بہتر کتابیں ، اِن کے بغیر معیارِ تعلیم بلند نہیں ہوسکتا - اور جب تک یہ نہیں ہوگا ہمارے طالب علم بدستور اپنی قومی زبان کو غیر زبان کے مقابلے میں حقیر سمجھتے رہیں گے - اب ضرورت ہے کہ قومی زبان کی محبّت اور عزّت کا جذبہ بچوں کے دلوں میں پیدا کیا جائے - اُنھیں سکھایا جائے

کہ اردو صرف میٹھی زبان ہی نہیں ہے، دنیا کی سب اچھی اچھی باتیں اور اونچے خیالات اس میں بیان ہوسکتے ہیں۔

رسم الخط کا سوال جس سے آج کل اس قدر دلچسپی لی جارہی ہے، اردو کی تعلیم سے براہِ راست تعلّق رکھتا ہے۔ اکثر اہل الرائے اب متّفق ہیں کہ نسخ کے اختیار کر لینے سے کئی طرح کی آسانیاں ہوں گی۔ منجملہ ان کے ایک آسانی یہ ہوگی کہ جن چار زبانوں کا سیکھنا ہمارے لیے لازم ہے اُن کے لیے ہمیں بجائے تین کے صرف دو رسم الخط سیکھنے پڑیں گے۔ یہ معاملہ اگر جلد طے ہو جائے تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ۱۹۵۰ سے مغربی پنجاب کی حکومت مُفت اور جبری ابتدائی تعلیم نافذ کر رہی ہے۔ خواندگی کی بنیاد نئے رسم الخط پر رکھی جا سکے گی۔ گزشتہ سال مغربی پنجاب کی حکومت نے ایک کمیٹی مدارس کے نصاب پر نظرثانی کرنے کے لیے مقرّر کی تھی۔ اِس کمیٹی کی سفارشات ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن عجب نہیں کہ دوسرے مسائل پر غور کرنے کے علاوہ اُس نے اِس مسئلے کا بھی کوئی موزوں حل تلاش کیا ہو۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ نسخ کا استعمال ہمارے ملک کی بعض صوبائی زبانوں کے لیے پہلے سے ہو رہا ہے۔ مغربی پنجاب کے لیے نستعلیق کے بجائے نسخ کا اختیار کر لینا بہ آسانی ممکن ہے اور مشرقی بنگال کے لیے بھی قرآن کے رسم الخط کو قبول کر لینا دشواری کا باعث نہ ہونا چاہیے۔

عربی زبان کی تعلیم کے متعلق ہماری ضروریات کی بنیاد قرآن مجید ہے، اگرچہ تاریخِ اسلام اور بعض اسلامی علوم مثلاً حدیث و فقہ پر عبور بھی عربی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ عربی ممالک سے ہمارے روابط پر ہماری عربی دانی کا اثر یقیناً خوش گوار ہوگا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ہر بچّہ قرآن مجید کی اصل عربی عبارت کو پڑھ سکے اور نہ صرف پڑھ سکے بلکہ اِس کا مطلب بھی اُس کے ذہن پر روشن ہو۔ اِس عمل کا دوسرا حصّہ بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے اور اُس وقت

تک مشکل معلوم ہوگا جب تک اُسی قسم کا استاد عربی پڑھاتا رہے گا جو آج تک پڑھاتا رہا ہے۔ لیکن اگر عربی کی تعلیم کسی قرینے سے دی جا سکے تو تین سال کی مدت تک عربی کو بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھانا اِس مطلب کے لیے بالکل کافی ہو سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے قرآن مجید کے بےشمار الفاظ ہماری عام بول چال میں داخل ہو چکے ہیں۔ صرف اُن کے ابتدائی صرفی اور نحوی رشتوں کے سمجھ لینے سے مشکل حل ہو سکتی ہے۔ اِس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ عربی زبان کی تعلیم چھٹی جماعت سے شروع کی جائے اور آٹھویں جماعت تک اسے ایک لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔ آٹھویں جماعت کے بعد عربی کی حیثیت اختیاری مضمون کی ہو۔ اس تین سال کے عرصے میں درسی کتابوں کے علاوہ خواصِ ابواب کی تعلیم پر خاص توجّہ کی جائے اور صَرف و نحو کے ضروری ابتدائی اصول اچھی طرح سے ذہن نشین کرائے جائیں۔ جو طالب علم اس کے بعد یونیورسٹی کی منزل تک عربی کی تحصیل کرنا چاہیں وہ نویں جماعت سے اسے بطور ایک اختیاری مضمون کے پڑھیں۔

اُردو سے فارسی زبان کا تعلّق بہت قریب کا تعلّق ہے اور اِس زبان کی تحصیل اُردو کے طالب علم کے لیے نسبتاً آسان ہے۔ اسے نصابِ تعلیم میں نویں جماعت سے اختیاری مضمون کی حیثیت ملنی چاہیے تاکہ جو طالب علم اُردو ادب کے تہذیبی پس منظر سے دلچسپی رکھتے ہوں یا کالج کی منزل میں اُردو کا مطالعہ جاری رکھنا چاہتے ہوں وہ فارسی زبان کے مبادیات کی تکمیل مدرسے ہی میں کرلیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس دو سال کی تعلیم سے اُردو کی لسانی ساخت کو سمجھنے اور اُردو شاعری سے لطف اندوز ہونے میں طالب علم کو بہت مدد ملے گی۔ پھر بھی فارسی کو کسی منزل پر لازمی مضمون کا درجہ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ بہت سے طالب علم

ایسے ہوں گے جن کا مطمحِ نظر زبان کی تحصیل کے بجائے علوم (Sciences) کی تحصیل ہوگا۔ اُن کے لیے اُردو کے علاوہ انگریزی سے واقف ہونا ازبس ضروری ہے۔ فارسی اُن کے مصرف کی چیز نہ ہوگی۔ اس لیے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ اِس زبان کی تحصیل کا بوجھ اُن پر ڈالا جائے۔ گویا انگریزی سے قطع نظر زبانوں کی تعلیم کی صورت مدرسے کی منزل میں یہ ہوگی:

اُردو پہلی سے دسویں جماعت تک لازمی زبان کی حیثیّت رکھے گی۔ عربی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں لازمی طور پر پڑھائی جائے گی۔ فارسی نویں اور دسویں جماعت میں اختیاری مضمون کی حیثیّت سے پڑھی جا سکے گی اور مجموعی حیثیت سے زبانوں کی تعلیم کے لیے شرط یہ ہوگی کہ ان تین زبانوں میں سے صرف دو انگریزی کے ساتھ جمع کی جا سکیں گی۔ اس کی عملی صورت یوں ہوگی کہ انگریزی کے علاوہ بیک وقت صرف اُردو اور عربی یا صرف اُردو اور فارسی کی تعلیم دی جائے گی۔

انگریزی کو نصابِ تعلیم میں کیا حیثیّت ملے گی؟ اس پر کچھ گفتگو ہو چکی ہے لیکن معاملہ ابھی تک تصفیہ طلب معلوم ہوتا ہے۔ بحث اس سے نہیں کہ اُردو ذریعۂ تعلیم ہو یا نہ ہو۔ یہ سوال قطعی طور پر طے ہو چکا اور جامعۂ عثمانیہ کے کامیاب تجربے کے بعد اس بارے میں کلام کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی زبان پڑھنا ہمارے لیے ضروری ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اِس ضرورت کے حدود کیا ہیں؟ اصولی حیثیت سے مجھے یہ تسلیم ہے کہ مدرسے میں انگریزی کی لازمی تعلیم کے لیے کوئی جواز نہیں ہے، لیکن سوال ہماری خواہشات کا نہیں بلکہ واقعات اور عملی ضروریات کا ہے۔ ابھی کچھ عرصے تک مدارس میں انگریزی کی تعلیم تقریباً اُسی پیمانے پر جاری رہے گی جس پر اب تک جاری رہی ہے۔ لیکن جب

سرکاری اور کاروباری دنیا میں اردو کو وہی جگہ مل جائے جو اِس وقت انگریزی کو حاصل ہے، تو انگریزی کی لازمی تعلیم مدرسے میں حذف ہو جانی چاہیے - اس وقت بھی میرے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ ان طلبہ کے لیے جن کا مطمحِ نظر یونیورسٹی کی تعلیم ہو، انگریزی زبان نویں اور دسویں جماعت میں لازمی قرار دی جائے - اعلیٰ تعلیم کسی مضمون میں بھی ہو، بحالاتِ موجودہ انگریزی زبان کی مدد کے بغیر ناممکن ہے - اور جب تک اردو میں وہ سب کچھ پیدا نہیں ہو جاتا جو اِس وقت انگریزی یا جرمن یا فرانسیسی میں ہے، اس وقت تک ہم انگریزی سے بے نیاز نہیں ہو سکتے - البتہ نئے حالات میں یہ لازم ہوگا کہ ہم انگریزی کی ادبی اور کاروباری حیثیتوں میں فرق کریں اور ان طلبہ کے لیے، جو انگریزی کو ذریعۂ معلومات بنانا چاہتے ہیں، انگریزی کا نصاب حسبِ ضرورت بنائیں - انگریزی سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ابھی ہمیں اس سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے - خود اردو بطور ایک زبان کے انگریزی کی ممنونِ اِحسان ہے - نئے الفاظ، نئے اسالیبِ اظہار، جملوں کی چست بندش، شعر کا فطری حُسن، نثر کی شفّاف سادگی، نظم کا منطقی تسلسل، کون سی چیز ہے جو ہم نے انگریزی سے نہیں سیکھی؟ اور یہ سمجھ لینا کہ زبان کے معاملے میں ہم معراجِ کمال کو پہنچ چکے، خود فریبی کی ایک شکل ہوگی - اردو سے ہمیں محبّت ضرور ہے، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ:

گیسوے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے

☆ ☆ ☆

قیامِ پاکستان کے بعد تعلیم و تعلّم کا زوال

یہ مقالہ انجمن حمایت اسلام کے اکسٹھویں سالانہ جلسے منعقدہ اپریل (؟) ۱۹۵۵ میں پڑھا گیا۔

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

یہ ایک عجیب اتّفاق ہے کہ تعلیم اور اربابِ تعلیم سے بے نیازی کی جو روایت انگریزی دورِ حکومت کے ڈیڑھ دو سو برس میں قائم ہوئی تھی، وہ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ اس سے پیدا شدہ تعلیمی انحطاط کے نتائج مختلف ناگوار صورتوں میں اِس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ تعلیمی اداروں کی مالی تہی دستی اب کچھ اَور نمایاں ہو گئی ہے۔ تعلیم کا معیار پہلے سے کچھ زیادہ پست ہوتا جا رہا ہے اور اُستاد و شاگرد ایک دوسرے سے بہت زیادہ بے تعلّق ہو گئے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِس خطرناک صورتِ حال میں اُستاد اور شاگرد کی روز افزوں بے تعلقی بنیادی حیثیّت رکھتی ہے اور حکومت اور قوم دونوں کا اس سے بے نیاز رہنا بہت بڑی غفلت ہے۔

گزشتہ صدی میں سید احمد خاں مرحوم نے جب اپنی تباہ حال قوم کی رہبری کا عزم کیا تو چند ہی سال میں اُن پر یہ نکتہ روشن ہوا کہ اصل خدمت کا راستہ یہ ہے کہ قوم میں تعلیم کی توسیع و اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ افسوس، یہ سبق جس سے ہمیں سالہا سال فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، ہم نے بہت جلد فراموش کر دیا۔

اسلام کے بادشاہی دور میں یعنی دو سو برس پہلے تک تعلیمی دنیا میں باہمی تعلقات کی کیفیّت موجودہ حالات سے بہت مختلف تھی - تعلیم و تعلّم کا یہ پرانا تصوّر وہی تھا جس کے ماتحت سعدی نے جورِ استاد کو بہ ز مہرِ پدر قرار دیا تھا - خود ہمارے زمانے میں دورِ گزشتہ کے اس تصوّر سے وابستگی کی ایک قابلِ ذکر مثال علامۂ اقبال نے قائم کی - انھوں نے اپنے مدرسے کے استاد مولانا میر حسن کے لیے جن حالات میں خطابِ شمس العلما کی تحریک کی اور اپنے کالج کے استاد پروفیسر آرنلڈ سے نظم و نثر میں جو اظہارِ عقیدت و محبّت کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا - ہمارے پرانے نظامِ تعلیم (ما قبلِ عہدِ برطانیہ کے نظامِ تعلیم) کے ماتحت ہماری تعلیم کو بیک وقت ایک علمی و دینی سرگرمی کا رتبہ حاصل تھا - معلّم اور طالب علم باپ بیٹے کے رشتے سے نہ سہی، مرشد و مرید کی باہمی محبّت و احترام سے ضرور وابستہ ہوتے تھے - یہ جذباتی تعلّق خالص علمی اور عقلی حیثّیت سے بھی بے حد کارگر ثابت ہوتا تھا کیونکہ انسان صرف عقل ہی سے نہیں سیکھتا، جذبے کی روشنی میں بھی دیکھتا اور سمجھتا ہے - جدید نفسیات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ بچّے کی ابتدائی زندگی میں والدین اس کے ساتھ صحیح اور مستحکم جذباتی رشتہ قائم کر لیں تو اِسی رشتے کی بنیاد پر بچّے کی آئندہ اخلاقی قوّت کی تعمیر ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا موجودہ نظامِ تعلیم، جس میں استاد اور شاگرد کے درمیان عام کاروباری خیرسگالی کی حسّ بھی مفقود ہو چکی ہے، [الاّ ماشاء اللہ] نتائج کے لحاظ سے روز بروز زیادہ مایوس کن ثابت ہو رہا ہے -

خواتین و حضرات! ذرا غور فرمائیے کہ اگر کچھ لوگ سیر و تفریح یا شکار کے سلسلے میں تھوڑے عرصے کے لیے اتفاقاً ایک دوسرے کے ساتھی بن گئے ہوں تو برسوں بعد سرِ راہ مل جانے پر بھی کس قدر اخلاص

اور حقیقی مسرت کا اظہار کرتے ہیں! پڑھنا اور پڑھانا تو سیر و تفریح سے کہیں زیادہ دلچسپ اور اہم اور مفید کام ہے۔ لیکن استاد اور شاگرد جو اس کام میں ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں، اگر اس شرکتِ کار کے جاودانی لطف سے محروم رہیں تو ایسی خشک اور بنجر تعلیم کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ کبھی لاہور کے کسی مدرسے، بلکہ کسی کالج کی سیر کیجیے۔ آپ کو گمان ہوگا کہ آپ کسی ایسی دنیا میں ہیں جہاں دو متحارب فریق، استاد اور شاگرد، بستے ہیں، دو ایسے متحارب فریق جو کسی عارضی صلح کے ماتحت کچھ عرصے کے لیے ایک دوسرے کا وجود برداشت کر رہے ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کے درمیان سے یوں گزر جاتا ہے جیسے اس کی نظریں انسانوں سے دو چار ہی نہیں ہیں، بلکہ سامنے ایک سپاٹ دیوار ہے۔ دوسری طرف شاگرد اپنے استاد کو دیکھتے ہی یوں آنکھیں چرانے لگتا ہے جیسے کوئی مفلس اور مقروض آدمی قرض خواہ کی صورت دیکھ کر گلی کے نُکّڑ پر مڑ جانے کی فکر کر رہا ہو۔ استاد کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اس کے شاگردوں کے نام یا اُن کی طبیعتوں کی اُفتاد کیا ہے، اور اُن کی صلاحیتوں میں کتنی بلندی یا پستی ہے۔

استاد، بالخصوص کالج کا استاد، پڑھاتا نہیں، صرف تقریر کرتا ہے۔ اور تقریر اگر اچھی ہو تو بھی محض تقریر ہے۔ اِس تقریر کے دوران میں طالب علم کی توجّہ اس لیے منتشر رہتی ہے کہ اسے استاد سے کوئی ذاتی تعلّق محسوس نہیں ہوتا اور ہو بھی کیونکر؟ لیکچر بازی اور امتحان کی دنیا انسان کے باہمی روابط کی دنیا نہیں بن سکتی۔ مجھے اپنی معلّمی کی زندگی میں بارہا اس قسم کا تجربہ ہوا ہے۔ میں نے ہمّت کر کے کسی طالب علم کا نام پوچھنے کی کوشش کی۔ ''کیا آپ کا نام عبدالکریم ہے؟'' اس پر انگریزی میں برجستہ جواب ملا: "No Sir, I am Roll No. Eight"۔ اس انکار سے میرے شاگرد

کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ میں نے ان کا نام غلط لیا۔ اصل مقصود میری بے راہ روی پر ہلکا سا احتجاج ہوتا ہے: ”جناب والا! آپ عجیب دقیانوسی آدمی ہیں جو شاگردوں سے انسانی تعلقات کی سطح پر بات کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ ماڈرن طالب علم تو محض گنتی کا ایک ہندسہ ہوتا ہے۔“

تعلیمی اور انسانی قدروں کی یہ شدید علیحدگی، جس پر ہمارا نظامِ تعلیم مُصر ہے، اپنا قدرتی نتیجہ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ہماری تعلیم کو کردار کی تربیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔ دماغ اور ضمیر، علم اور عمل، تعلیم اور تربیت کے درمیان ایک ایسی سنگین فصیل کھنچ گئی ہے جس کو پھاندنا یا توڑ ڈالنا کسی طالب علم کا کام نہیں رہا۔ ہمارے موجودہ معیار کے مطابق اچھا استاد وہ ہے جو طالب علم کے حافظے میں کچھ اعداد و شمار یا کچھ لفظی گورکھ دھندے کامیابی سے بھر سکتا ہے۔ اُس کا منصب یہ ہرگز نہیں ہے کہ طالب علم کی شخصیّت کو جِلا دے، اُس کے ذہن کو اُبھارے، اُس کی عادات میں باقاعدگی یا اُس کے اطوار میں شائستگی پیدا کرے۔ یہ منصب مدرسے کی ابتدائی جماعتوں میں بہترین طریقے پر پورا ہو سکتا ہے اور وہیں ہمارے اربابِ حل و عقد اس کارِ خیر میں سب سے زیادہ رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ یقین مانیے کہ اگر دو تین سال کی تعلیم کے بعد بھی بچّے کے اخلاق و اطوار میں کوئی فرق نہیں آیا تو آپ کے تعلیمی نظام میں بلاشبہ کوئی بنیادی فتور ہے۔ سدھے ہوئے اور جنگلی جانور کے فرق کو دیکھیے۔ کتنا بڑا فرق ہے! اور یہ فرق صرف دو چار ہفتے کی تربیت سے پیدا ہو جاتا ہے۔ حیف ہے کہ حیوانِ ناطق چند سال تعلیم پائے اور کچھ نہ سیکھ سکے! ہماری قوم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو پانچویں ساتویں جماعت تک پڑھے ہیں۔ مگر آپ اُن میں اور اَن پڑھوں میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ

انسان کے بچّے کو پانچ سات سال تک تقریباً شب و روز بعض اچھی باتیں سکھائی جائیں اور وہ انھیں پھر بھی نہ سیکھ سکے ؟ اس صورت میں یا تو ہم نے جان بوجھ کر اُس کا وقت ضائع کیا کیونکہ ہمارا طریقِ تعلیم ہی غلط تھا ، اور یا وہ سب کچھ جو ہم نے اسے سکھایا ، قطعاً بے ربط اور بے معنی تھا جسے عملی زندگی سے دور کا تعلق بھی پیدا نہ ہو سکا ۔

خواتین و حضرات ! یہ صورتِ حال بڑی دردناک ہے اور صرف بدیں وجہ اس سے غافل ہو جانا کہ اب تو یہ صورت برسوں سے قائم ہے ، قوم کے مستقبل کو جانتے بوجھتے ہوئے تاریک بنانا ہے ۔ یہی وہ شانِ بے نیازی ہے جسے قیامِ پاکستان کے بعد کچھ اور تقویت ملی ہے ۔ جناب والا ! زندہ قومیں ، جنھیں زندہ رہنے کی خواہش ہو ، نونہالانِ قوم کی عقلی اور اخلاقی تہذیب سے اس طرح بے نیاز نہیں ہو جاتیں ۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو جو مرض گُھن کی طرح کھائے جا رہا ہے ، اُس کے کئی اسباب ہیں ، مگر سب سے بڑا سبب یقیناً یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل کو اچھے اساتذہ مہیّا کرنے میں ، حکومت نے قطعی بے توجّہی ، اور غالباً سوچے سمجھے ہوئے تغافل ، سے کام لیا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اُستاد فنِ تعلیم سے بیگانۂ محض ہو کر رہ گئے ہیں ۔ ذرا غور فرمائیے کہ ہمیں کتنے اُستاد میسّر ہیں جو ''پڑھانے'' کے علاوہ کبھی کبھی خود بھی کچھ پڑھتے ہوں ؟ جنھیں درس و تدریس سے فطری مناسبت ہو ؟ جنھیں سبق دینے کے علاوہ کبھی یہ غور کرنے کی بھی توفیق ہوئی ہو کہ بالآخر اُن بچوں کا انجام کیا ہوگا جو اُن کے زیرِ تعلیم ہیں ؟

مجھے معلوم ہے کہ اِن سوالات کا جواب مایوس کن ہے ۔ لیکن میں نے محض تحصیلِ حاصل کے لیے ایک مانی ہوئی حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا ۔ میری اصل غرض یہ ہے کہ آپ اس پر غور فرمائیں

کہ یہ مایوس کن صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی ؟ ہم طلبہ کی فلاح و بہبود کا خیال کر کے آتش زیرِ پا ہونے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں - لیکن اساتذہ کے حق میں کوئی آواز بلند کرنا فیشن میں داخل نہیں ہے - ہمارے بدنام ، غیر مستعد ، کوتاہ کار معلّمین ، جن سے معجزات دکھانے کی توقع وابستہ کی جاتی ہے ، اپنی کوتاہیوں کی حقیقت بیان کرنے لگیں تو اُن کی خطائیں ناقابلِ معافی معلوم نہ ہوں - صرف ایک بات کا لحاظ فرمائیے کہ اکثر مدارس میں طلبہ کی تعداد اِس قدر زیادہ ہے کہ جو تھوڑے سے اُستاد اِن مدرسوں کو نصیب ہوتے ہیں ، وہ اِن طالب علموں سے نبٹ نہیں سکتے - اتنی بڑی بڑی جاعتیں ایک ایک اُستاد کے حوالے کر دی جاتی ہیں کہ حیرت یہ ہوتی ہے کہ بیشتر اُستاد عصبی بیماریوں کا شکار کیوں نہیں ہو جاتے - میں نے لاہور کے ایک پرائمری سکول میں دیکھا کہ ایک ماسٹر صاحب ایک ہی وقت میں تیسری اور چوتھی جماعت کو پڑھا رہے تھے - کبھی تیسری جماعت میں جا کر گرج آتے اور کبھی چوتھی پر برس پڑتے - اور یہ صورت اتفاقاً کسی ایک دن پیش نہیں آ گئی ، یہ سال بھر کے لیے مستقل انتظام تھا - اب اسے ماسٹر صاحب کا معجزہ سمجھنا چاہیے ، یا ان کے شاگردوں کا ، اگر فریقین اپنے ہوش و حواس سلامت لے کر اس امتحان سے نکل آئے -

حکومتِ انگلستان مفت اور جبری تعلیم کے مدارس میں بچوں کی تعلیم کے لیے جس قسم کے اساتذہ جن حالات میں بہم پہنچاتی ہے وہ ہمارے لیے مقامِ عبرت ہیں - دو سال ہوئے میں نے خود اپنی تربیت کے لیے انگلستان کے بعض مردانہ اور زنانہ مدارس کا معائنہ کیا ، اور جو کچھ میں نے وہاں دیکھا اس نے میری آنکھیں کھول دیں - صرف ایک واقعہ سناتا ہوں - گیارہ بارہ سال کی عمر کی لڑکیوں کی ایک جماعت Mimes یعنی سُوانگ سے شوق کر رہی تھی اور یہ کھیل

در اصل ایک سبق تھا - اِن لڑکیوں کی اُستانی خوب جاندار اور ماہرِ فن عورت تھی - سُوانگ بھرنے کے سلسلے میں پہلے اُس نے چھوٹی چھوٹی مشقیں کرائیں ، مثلاً کہا کہ سوئی دھاگا ہاتھ میں لیے بغیر سوئی میں دھاگا ڈالنے کی تمام حرکات کی نقل کرو ، یعنی دھاگا ریل سے کھینچو ، اس کا سرا گول کرو ، پھر سوئی کے ناکے میں ڈالو ، اسے دوسری طرف سے کھینچو اور آخر میں اسے گرہ لگا دو - یہ پارٹ بڑی خاموشی اور انہاک سے کیا جا رہا تھا اور اُستانی کی تیز نگاہ ایک ایک لڑکی کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہی تھی - جب اس طرح کی دو تین مشقیں ہو چکیں تو اُستانی نے لڑکیوں سے ایک نسبۃً لمبا پارٹ ادا کرایا اور یہی سارے سبق کی جان تھا - اُستانی نے پہلے ایک کہانی اس خوبی سے سنائی کہ کہانی سے قطعِ نظر اُستانی کا اندازِ بیان قابلِ داد تھا - کہانی یہ تھی کہ ابّا جان کو ایک کھانے پر بلاوا آیا - ابّا جان نے کہا کہ میرے پاس کوئی اچھی پتلون پہننے کو نہیں ہے ، کروں تو کیا کروں ! ماں بیٹی اور بیٹے بلکہ نانی امّاں نے چندہ کر کے نئی پتلون کی قیمت جمع کی - ماں پتلون خرید کر لائی تو باپ نہال ہو گیا - مگر پتلون پہنی گئی تو دو انچ لمبی نکلی - باپ نے کہا کہ اب تو کل کے کھانے پر جانا میرے لیے ناممکن ہے - خیر رات ہوئی ، سب سو گئے تو ماں اُٹھی اور اس نے اپنی سلائی کی پٹاری نکالی اور پتلون کی لمبائی کو دو انچ کم کرکے سو گئی - اس کے بعد بیٹی ، بیٹا اور نانی امّاں سبھی باری باری اُٹھے اور سب نے پتلون دو دو انچ چھوٹی کر دی -

خیر یہ پوری کہانی بیان کر کے اُستانی نے کہا کہ آؤ سب مل جل کر اس کہانی کا ڈراما بنائیں - کوئی لڑکی ماں بنی اور کوئی بیٹی ، کوئی ابّا اور کوئی نانی امّاں - جب ڈراما شروع ہوا تو لڑکیاں نہ صرف مناسبِ حال حرکت کرتی تھیں بلکہ ساتھ ساتھ بولتی جاتی

تھیں - اِس طرح دیکھتے دیکھتے ایک اچھا خاصا ڈراما بن گیا -

ہمارے بے شمار مدارس میں تعلیمی کاروبار کی اِس قسم کی تنظیم کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے - اِس تباہ حالی کی بڑی وجہ وہی موزوں اساتذہ کا فقدان ہے اور وہ اس لیے کہ معلّمی کے پیشے میں ذہین اور قابلِ قدر شخصیت کے لوگوں کے لیے مناسب جگہ نہیں رکھی گئی - پاکستان کے قیام کے بعد تعلیم کو ایک بڑا نقصان اُس وقت پہنچا جب تجربہ کار اور قابل اساتذہ وزارتوں ، سفارتوں اور گراں قدر دفتری عہدوں پر مامور کیے گئے - مجھے اِن بڑے عہدوں کی اہمیت یا فائدے سے ہرگز انکار نہیں ہے ، لیکن شکایت یہ ہے کہ جو لوگ معلّمی کے پیشے کی استعداد سالہا سال کے تجربے کے بعد پیدا کر چکے تھے ، انھیں اس پیشے سے وابستہ رکھنے کے لیے کوئی ترغیب یا موقع بہم نہ پہنچایا گیا - اِس وقت جو صورتِ حال موجود ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے معلّمین کا ایک قابلِ ذکر حصہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو دنیا کا کوئی اور مفید کام کرنے کے قابل نہیں تھے - اور چونکہ ہماری سوسائٹی میں سب سے ناکارہ کام بچوں کو پڑھانا ہے اس لیے قوم کا سب سے ناکارہ حصہ اس ناکارہ کام کے لیے موزوں سمجھا گیا -

جناب والا ! میں اِس تلخ نوائی کے لیے معافی چاہتا ہوں - لیکن مجھے یہ پوچھنے کی اجازت دیجیے کہ اِس آزاد ملک میں آیندہ نسل کی تعلیم و تربیت کے عظیم الشّان مقصد کے پیشِ نظر معلّم کی زندگی کا معیار کیوں اتنا بلند نہیں کیا جاتا کہ ملک کے بہترین دماغ معلّمی کا شریفانہ پیشہ اختیار کرنے کو قابلِ غور سمجھ سکیں ؟ ہماری قومی روایات معلّموں کی تذلیل و توہین کی روایات نہیں ہیں - شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کا جو اعزاز اسلامی دَور میں قائم تھا ، اس کا خیال کر کے شاید مجھے یہ جواب دیا جائے کہ علمائے سلف کے مثیل اب کہاں ہیں ؟ میں جواباً یہ گزارش کروں گا کہ علمی و عقلی زندگی

کا معاشرتی رتبہ بلند کیجیے تا کہ اس پیشے میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کا ظہور ہو سکے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسلام کے تاجدار اورامرا و وزرا اُن معلّمین کا احترام کرتے تھے جو دنیوی طور پر کوئی جاہ و منصب نہ رکھتے تھے؟ آج اِسی قسم کے معلّمین کی جماعت کو دوبارہ پیدا کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ رومۃ الکبریٰ کی تباہی کے اسباب میں ایک یہ سبب بھی تھا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت غلاموں کے سپرد کر دی گئی تھی۔ ہم نے اپنے بچے اُن لوگوں کے حوالے کر دیے ہیں جو غلاموں کے غلام ہیں، اور ہم اِس صورتِ حال کو اِس لیے برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ اساتذہ کا ذہنی اور معاشرتی معیار گرا کر ہم تعلیم کے اخراجات میں کفایت کر سکتے ہیں۔ یہ کفایت بڑی مہلک ہے اور کم از کم زندگی کے بڑے بجٹ میں اِس سے توازن پیدا نہیں ہوگا۔ بہترین دماغوں کی مدد سے ملک میں اعلیٰ درجے کے معلّمین کی ایک باقاعدہ جماعت پیدا کیجیے تا کہ ہماری آئندہ نسلیں زندہ رہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اُس طرف لوٹیں جس طرف سید احمد خاں مرحوم نے ہمیں پکارا تھا۔ یعنی تعلیم کو سیاست کے کاروبار پر ترجیح دیں تاکہ ملک کو صحیح جمہوری بنیادوں پر مستحکم ہونے کا موقع ملے۔

☆ ☆ ☆

پاکستان کے لیے ایک قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل

[۱۹۵۹]

اگرچہ علم ، بحیثیتِ علم ، کبھی قومیّت کے حدود کے اندر محصور نہیں ہوتا ، نہ علم پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد کرنا جائز ہے ، تاہم تحصیلِ علم کے لیے قومیں اپنے اپنے مزاج اور حالات کے مطابق لازماً مخصوص ذرائع اور منتخب وسائل استعمال کرتی ہیں ۔ قدیم یونان کا نظامِ تعلیم و تربیت قوم کے ہمہ گیر ذوقِ جمال کو عملی صورت دینے کے لیے وضع ہوا تھا ۔ اس کے برعکس قدیم روما کا نصب العین اعلیٰ درجے کے نظم و ضبط کا حصول تھا ۔ اس لیے رومیوں کے نظامِ تعلیم کی تشکیل اِسی مقصد کے پیش نظر ہوئی تھی ۔ ڈیڑھ دو سو برس ہوئے انگلستان نے اپنے اُن مدارس میں جو Public Schools کہلاتے تھے ، تعلیم و تربیت کا وہ طریقہ نافذ کیا جس نے گزشتہ صدی کے انگریز نوجوانوں کو دنیا کی اولوالعزمانہ اور سخت کوش قیادت کے لیے تیار کیا ۔ الغرض یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اقوامِ عالم اپنے تعلیمی سانچے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالتی رہی ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ کس قسم کا نظامِ تعلیم پاکستان کی قومی ضروریات کے مطابق ہوگا ؟

اِس سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ نظامِ تعلیم پر ایک نظر ڈالیں اور اُن حالات کا مختصر بیان کریں جن کے ماتحت یہ نظامِ تعلیم ہمیں ملا ۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۷۶۵ میں جب مغل شہنشاہ شاہ عالم نے بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کی تو تمام انتظامی اختیارات کمپنی کے سپرد

ہو جانے کے باوجود دفتری زبان از روئے معاہدہ فارسی ہی رہی اور درسی زبان کی حیثیت سے بھی فارسی کا وہ منصب بدستور قائم رہا جو اسے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں حاصل تھا۔ سولہ برس بعد ۱۷۸۱ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہمارے نظامِ تعلیم میں پہلی بار ہمدردانہ دلچسپی لی۔ اِس سال وارن ہیسٹنگز نے عربی اور فارسی میں ہمارے قومی علم و ادب کی تعلیم کے لیے کلکتے کا مدرسہ قائم کیا اور اس کے بعد چند سال تک ہمارا نظامِ تعلیم انگریزی اعانت سے ہماری روایات کے مطابق کام کرتا رہا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں یہ کوشش کی گئی کہ مسلمانانِ ہند کو اُردو کے ذریعے سے مغربی علوم کی واقفیّت بھی بہم پہنچائی جائے، لیکن پھر انگریز حکام کے دل میں بہ تدریج ایک اور خیال پیدا ہوا جس کا پہلا تحریری سراغ ۱۸۲۴ کے ایک سرکاری مراسلے میں ملتا ہے۔ وہ خیال یہ تھا کہ اہلِ پاکستان و ہند اپنے قدیم علوم سے قطع نظر کریں، صرف یورپی علوم پڑھیں، اور ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو۔ چنانچہ ۱۸۳۵ میں مکالے کی مشہور سرکاری قرارداد نے اِس نئی تجویز کو قطعی صورت دے دی۔ یہ نیا طریقِ تعلیم جس میں اہلِ پاکستان و ہند کے لیے ذریعۂ تعلیم بھی بدل دیا گیا، انگریز حکام نے خاصے غور و فکر کے بعد اختیار کیا تھا اور اِس عمل کے بعض دُور رس نتائج اُن کے پیشِ نظر تھے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر اِس برِّ عظیم میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک ایسا اقلّیتی طبقہ پیدا کرنا مقصود تھا جو (مکالے کے الفاظ میں) "ہمارے اور کروڑوں کی اُس مخلوق کے درمیان، جس پر ہم حکمران ہیں، ترجمان بن جائے۔ ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات، خیالات، اخلاق اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہوں۔"

یہ ہے ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کی مختصر تاریخ۔ اب آپ غور فرمائیے کہ یہ نظامِ تعلیم جن مقاصد کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا

تھا ، کیا وہ سب کے سب ہمارے لیے قابلِ قبول ہیں ؟ تعلیم کا ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔ موجودہ تعلیم کے پہلے باغبان نے جب یہ درخت لگایا تو اِس کے پھل کی شناخت اُن لفظوں میں کر دی جن کا حوالہ میں نے ابھی دیا ۔ ایسا نظامِ تعلیم جس کا مقصد و منتہا ہمارے طلبہ کو رجحان و خیال اور عقل و اخلاق کے لحاظ سے انگریز بنانا تھا ، آزادی کے پہلے دن سے ہمارے غور و فکر کا طالب تھا ۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ گزشتہ ایک سو برس میں ہم نے اِس طریقِ تعلیم کی مدد سے علم و عمل کی دنیا میں کیا کارنامے کیے ؟ اِس سوال کا جواب قطعاً مایوس کن نہ سہی ، پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ ہم نہ عقل نہ اخلاق کے لحاظ سے انگریز بن سکے ۔ اس کے برعکس ہم اُس عظیم علمی اور تہذیبی ورثے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے جو ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا تھا ۔ اس سے بھی بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ہمیں اپنے قومی علمی سرمایے پر جو فخر و ناز تھا ، اُسے ہماری موجودہ تعلیم نے فنا کر دیا ۔ ہم سب عظیم الشان تاریخی روایات کے وارث ہیں اور یہ روایات ہمارے اپنے علوم کے ساتھ وابستہ تھیں ۔ عربی اور فارسی سے ہماری بے تعلّقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اُن علمی خزائن سے محروم ہو گئے جو اِنھی زبانوں میں محفوظ تھے ۔ اِس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم سے جو بے شمار فائدے ہمیں پہنچے ، اُن کا انکار کروں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اپنی قومی روایات سے منقطع ہوئے بغیر بھی ہم یہ فائدے اٹھا سکتے تھے ۔ شکایت یہ ہے ، اور بجا شکایت ہے ، کہ ہماری تعلیم کے لیے ایسا ذریعہ اختیار کیا گیا جو ہماری غیرتِ قومی کے منافی تھا ، جس نے ہمیں ہمارے ماضی سے کاٹ کر الگ رکھ دیا اور ہماری تاریخ کے علمی تسلسل کو برباد کر دیا ۔ لیکن ماضی سے قطع نظر اِس ذریعۂ تعلیم نے موجودہ دور میں بھی ہماری فکر و اظہار کی قوتوں کو اِس طرح سلب کر لیا کہ ہم عقلی

طور پر ناکارہ ہو گئے اور ہمارا شمار تیسرے درجے کی قوموں میں ہونے لگا۔

میرے نزدیک ہمارے قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل میں ذریعۂ تعلیم کا سوال جڑ بنیاد کا سوال ہے۔ برطانوی دور تک تعلیم اور زندگی کے دوسرے کاروبار میں انگریزی کے بجا اور بے جا استعمال کے لیے ایک قسم کا جواز موجود تھا۔ لیکن استقلالِ پاکستان کے بعد ہماری تعلیمی زندگی میں انگریزی پر غیرضروری انحصار بے تدبیری بھی ہے اور خواہ مخواہ کی عصبیت پسندی بھی۔ یہ ایک تاریخی اور منطقی عجوبہ ہو گا کہ اہلِ پاکستان تحصیلِ علم اور روزمرہ کے مشاغل میں ایک ایسی زبان سے کام لیتے رہیں جو ان کی تہذیب و تمدّن سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور جس کا بے محابا استعمال طالب علم کے ذہن میں خود بخود یہ خیال راسخ کرتا ہے کہ روشنی صرف مغرب سے طلوع ہو سکتی ہے اور ہماری اپنی قوم کا دماغ صرف اندھیرے کا سرچشمہ ہے۔ قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا کوئی اِس سے بڑا ذریعہ شاید ہی ممکن ہو۔

قوموں کی تاریخ نے ہمیں ایک بڑا سبق یہ دیا ہے کہ سیاسی آزادی ذہنی آزادی کے بغیر بیکار ہے، اور ذہنی آزادی کے پھول صرف قومی زبان کے باغ میں کِھلتے ہیں۔ کیا علوم اور کیا فنون، دونوں میں تخلیقی کارنامے ہمیشہ وہی لوگ کر سکے ہیں جن کا سوچ بچار اور فہم و تفہیم کا عمل دیسی ساخت کے سانچوں میں ڈھلا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم آنے والی نسل کے دماغوں کے فطری عمل کی راہ سے وہ پتھر ہٹا لیں جو محض تاریخی اتفاقات کے باعث وہاں آ پڑا تھا۔ ذرا غور کیجیے کہ گزشتہ ایک سو برس میں ہم نے کون سا بڑا ادبی یا علمی کارنامہ انگریزی زبان میں سرانجام دیا ہے؟ کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی کے فلاں پروفیسر صاحب بالکل انگریزوں کی طرح انگریزی لکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر میرا سوال ہمیشہ یہ ہوتا ہے: ”تو پھر کیا ہوا؟“ جو بات دریافت طلب ہے

وہ صرف اِتنی ہے کہ کیا صحیح انگریزی یا صحیح پنجابی یا صحیح اُردو لکھنا فی نفسہ کوئی کارنامہ ہے ؟ از برائے خدا مجھے یہ بتائیے کہ اس صحیح انگریزی یا صحیح اُردو نے علم و ادب کی دنیا میں کیا اضافہ کیا ؟

اب آپ ذرا یہ بھی فرمائیے کہ غیر زبان کا ذریعۂ تعلیم و اظہار ہونا طالب علم کے فطری ذہنی تموّج کو کس طرح روک دیتا ہے - بدیسی زبان میں تحصیلِ علم باہر سے اندر آنے کا عمل یعنی محض قبولِ معلومات کی ایک صورت ہے - اِس کے برعکس تخلیقی فکر کا چشمہ ہمیشہ اندر سے اُبلتا ہے - وہی معلومات جو آپ طالب علم کو بدیسی زبان میں دے رہے ہیں ، اُسے اپنی زبان میں دیجیے تو تخلیقی فکر کا اندرونی عمل خود بخود آپ کی تعلیم کے ساتھ شامل ہو جائے گا - مجھے یقین ہے کہ گزشتہ ایک سو برس میں طلبِ علم کی حِس اور تخلیق کی حِس کے درمیان جو علیحدگی بالعموم نمودار ہوئی اُسے انگریزی کے ذریعۂ تعلیم ہونے سے گہرا تعلّق تھا - اِسی سبب سے قوم کو محض معلومات کے قارون تو بہت ملے مگر وہ لوگ جو خلّاقِ معانی ہوں ، سیّد احمد خاں اور حالی و شبلی کی نسل کے بعد خال خال ہی نصیب ہوئے - اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر ہماری قوم بدستور گونگی رہے گی اور موجودہ ذہنی انتشار اور بے مایگی میں کوئی کمی نہ ہوگی -

قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی اِس تجویز پر عمل اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک قومی اتّحاد اور سیاسی استحکام کا محتاج ہے - قومی زبان میں تعلیم اِس خلا کو پُر کرنے میں مدد دے گی - مجھے تسلیم ہے کہ ایک سے زیادہ قومی زبانوں کے ہوتے ہوئے بھی بعض ملکوں کا سیاسی استحکام ممکن رہا ہے ، لیکن ایسی صورتوں میں جغرافیہ اور بعض دوسرے عوامل خود بخود قومی اتّحاد کو مضبوط کر دیتے ہیں ، ورنہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کی بقا ایک ملک اور ایک زبان کا تقاضا کرتی ہے - اِس خاص سیاسی

ضرورت سے قطعِ نظر، اگر اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے تو نہ صرف انگریزی کا غیر ضروری دخل جاتا رہے گا بلکہ خالص علمی اعتبار سے درس و تدریس کا معیار بلند ہو جائے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ زبانیں بلند مطالب کے اظہار کی قدرت لے کر پیدا نہیں ہوتیں۔ یہ قدرت اُنھیں اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب اُن سے بلند مطالب کے اظہار کا کام لیا جائے۔ اس موقع پر اُن ذرائع و وسائل کی تفصیل بیان نہیں ہو سکتی جن کا استعمال اُردو کو کامیاب ذریعۂ تعلیم بنا سکتا ہے۔ صرف یہ بتانا شاید کافی ہو کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تمام علوم ایم۔ اے۔ اور ایم۔ ایس سی۔ کے درجے تک کامیابی سے پڑھائے گئے اور اب بھی کراچی کا اُردو کالج بی۔ اے۔ اور بی۔ ایس سی۔ کے تمام مضامین اُردو میں پڑھا رہا ہے۔ علوم و فنون کی تعلیم سے قطعِ نظر اُردو ہی ایک زبان ہے جو عربی اور فارسی کے علمی خزانوں کا دروازہ پھر ایک بار ہم پر کھول سکتی ہے، بلکہ اب تو گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس کی کاوشوں سے علومِ اسلامیہ کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ خود اُردو میں مہیّا ہو چکا ہے۔ اسی طرح کچھ اور علمی اور تہذیبی فوائد بھی ہمیں پہنچیں گے۔ پورے ملک کو خواندہ بنانے کا کام وسیع پیمانے پر ہاتھ میں لیا جا سکے گا۔ نیز انگریزی خواں اور اُردو خواں طبقوں کی یک صد سالہ جماعتی چپقلش کا صحیح شرائط پر فیصلہ ہو جائے گا۔

ذریعۂ تعلیم کی اس مختصر بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں آپ کو انگریزی زبان کے بیش بہا علمی اور تہذیبی خزانوں سے بے نیاز ہو جانے کی دعوت نہیں دے رہا ہوں۔ اُردو زبان و ادب کو انگریزی سے بہت فائدہ پہنچا ہے اور ہم استفادے کے اِس عمل کو بدستور جاری رکھیں گے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ریاضی یا فلسفہ یا طبیعیّات انگریزی میں پڑھنے پڑھانے سے نہ انگریزی کا بھلا ہوتا ہے، نہ اُردو کا، اور نہ اُس مضمون کا جو طالب علم کو

بدرجۂ مجبوری غیر زبان میں پڑھنا پڑتا ہے - خود انگریزی زبان سے جس قسم کی جسارتیں پاکستان میں روا رکھی جا رہی ہیں ، ذوقِ سلیم اُن کے خلاف پیہم فریاد کرتا ہے - لیکن یہ ایک الگ داستان ہے جو یہاں کسی قدر غیرمتعلق ہے - مجھے ذاتی طور پر یقین ہے کہ اُردو کو اپنے قومی نظامِ تعلیم میں اُس کا صحیح مقام دے کر ہم ملک میں انگریزی کی تعلیم کا معیار بھی بلند کریں گے -

میں نے ذریعۂ تعلیم کا ذکر اس لیے پہلے کیا ہے کہ میرے نزدیک اس کی اہمیّت بنیادی ہے - با ایں ہمہ یہ کہنا ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم کا انقلاب ہمارے تمام تعلیمی امراض کا علاج نہیں ہے - ایک اور مرض بھی ہے جو گُھن کی طرح ہمارے نظامِ تعلیم کو کھا رہا ہے اور وہ ہے اُستاد اور شاگرد کی روحانی بے تعلّقی - ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی اِس صورتِ حال کو شاید کچھ بہتر بنا دے - مگر اس سلسلے میں بعض اور اسباب بھی ہیں جن کی اصلاح اشد ضروری ہے - ان میں ایک بڑا سبب اساتذہ کی وہ غیر معزّز اور ناقابلِ عزّت جماعت ہے جو اِس وقت ایک بڑی تعداد میں ہمارے نظامِ تعلیم پر حاوی ہے - ہمارے اساتذہ بالعموم علم سے بے پروا ، لطفِ تدریس سے ناآشنا اور شاگرد کی محبت سے بے نیاز ہیں - ان پریشاں حال اور پریشان خیال لوگوں کو ایسا مطمئن، فعّال اورصاحبِ عزّت طبقہ بنا دینا جو اپنی مخصوص روایات رکھتا ہو ، جسے اپنا پیشہ عزیز ہو ، جو تحقیق اور تلاشِ حق میں فرق نہ کرتا ہو ، اِس وقت ہمارے نظامِ تعلیم کا بڑا مسئلہ ہے - تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اساتذہ بھی غیرذمہ دار اور بدشوق ہو سکتے ہیں - یہ لازم ہے کہ اساتذہ کی اخلاق اور عقلی اہلیت کے معیار برقرار رکھنے کے لیے اِس اہلیّت کا جائزہ وقتاً فوقتاً لیا جائے - اساتذہ کے قوائے فکر و عمل کو شل نہ ہونے دیا جائے ، بلکہ انھیں تجدیدِ علم کے موقعے بہم پہنچائے جائیں اور ان کی تربیت کے ایسے ادارے قائم ہوں جن کے

امتحانات میں کامیاب ہونا مناسب وقفوں کے بعد ان کے لیے لازم ہو۔

نظامِ تعلیم کا ایک اور اہم شعبہ تعلیمِ بالغاں ہے۔ ہم تو ایک پس ماندہ قوم ہیں، دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی تعلیمِ بالغاں کو بے حد اہمیّت دی جاتی ہے۔ اِس سے مراد یہ نہیں ہے کہ بالغوں کو محض خواندگی کی منزل تک پہنچا دیا جائے۔ ملک کی اجتماعی زندگی کے ساتھ اُن کا صحیح تعلق مناسب تربیت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ دراصل تمام زندہ قوموں کا عمل اِس اُصول پر ہے کہ تعلیم مدرسے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، عمر بھر جاری رہتی ہے۔ اگر آپ نے لاہور کی کسی سڑک پر کھڑے ہو کر پاکستانی بالغوں کی نقل و حرکت کا ملاحظہ کیا ہے تو آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جنھیں سڑک پر چلنے کا سلیقہ اور اپنے نفس کے علاوہ کسی دوسرے کی ضرورت کا لحاظ تو کجا، اس کے وجود کا احساس تک ہے۔ ان لوگوں کو بائیسکل چلانے کے لائسنس ہی نہیں، پیدل چلنے کے لائسنس لے کر گھر سے باہر نکلنا چاہیے تھا۔ یہی لائسنس اور اس قسم کے بے شمار لائسنس تعلیمِ بالغاں کی کامیاب تنظیم ان کے ہاتھ میں دے گی۔ پاکستان میں دن کے مدارس اُسی طرح تعلیمِ بالغاں کے لیے شبینہ مدارس کا کام دے سکتے ہیں جس طرح دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں۔

ایک اور بڑا خلا ہے جو مجوّزہ تعلیمی انقلاب کے ساتھ ہمیں لازماً پاٹنا پڑے گا۔ کسی زمانے میں ہماری تعلیم کا آغاز مسجد میں ہوتا تھا۔ انگریزی تعلیم نے مسجد اور مدرسے کے درمیان ایک ایسا فاصلہ قائم کر دیا جس سے ہمارے علم کو بھی نقصان پہنچا اور ایمان کو بھی۔ مناسب یہ ہے کہ اب مدرسے کو پھر مسجد تک پہنچایا جائے۔ اس عمل کے لیے اوقاف و مساجد کی تنظیم ضروری ہوگی۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مساجد کے ائمہ حکومت کے محکمۂ تعلیم یا تعلیمی انجمنوں کے باتنخواہ ملازم ہوں۔ انھیں محلّے کے تمام بچّوں کی ابتدائی

دینی و دُنیوی تعلیم کا ذمّہ دار ہونا چاہیے - نئے مدارس کی تعمیر میں برسوں کی مدّت اور لاکھوں کی رقم صرف ہوگی، لیکن اسلام نے تعلیم اور مذہب کی بنیادی یگانگی جس طرح تسلیم کی ہے اُس سے غافل رہنا اور جہالت میں پڑے رہنا خود ہمارا قصور ہوگا -

تعلیم اور کاروباری دنیا کے درمیان جو لاتعلّقی اِس وقت پیدا ہو گئی ہے اس کا علاج کیے بغیر تعلیم کا کوئی قومی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا - طالب علم دراصل علم اور معاش دونوں کا طلب گار ہوتا ہے - اس لیے ایسی تعلیم جو حصولِ معاش کا ذریعہ نہ بن سکے، طالب علم کو لامحالہ ناآسودہ اور غیر مطمئن چھوڑ جائے گی - اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا طالب علم ناواقفیّت اور ناتجربہ کاری کے عالم میں، اور حکومت کی طرف سے کسی تعاون یا رہنمائی کے بغیر، نہ صرف اپنے نصابِ تعلیم کا بلکہ اپنے لیے کسی مستقل پیشے کا انتخاب بھی کرتا ہے - اگر صوبائی حکومتیں اِس معاملے میں دل چسپی لیں تو انتخاب کا یہ عمل ایک اجتماعی تنظیم کے اندر کارفرما ہوگا اور موجودہ بے ترتیبی اور انتشار کی کیفیّت قائم نہیں رہے گی - حکومت کا فرض ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد یہ اندازہ لگاتی رہے کہ صنعت، حرفت، زراعت، تعلیم، نظم و نسق، دفتری ملازمت وغیرہ میں اس کی ضروریات کیا ہیں اور پھر متعلقہ اعداد، بورڈز آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن اور یونیورسٹیوں کو، نیز عوام کو، مہیّا کرے - مدرسے اور کالج دونوں منزلوں پر حکومت کے مقرّر کردہ نفسیاتی بورڈ طالب علم کو مشورہ دینے کے لیے موجود رہنے چاہئیں تاکہ اُس کی زندگی محض اتّفاقات کا شکار نہ ہو جائے بلکہ فرد کے مستقبل اور قوم کے مستقبل کے درمیان صحیح رابطہ قائم ہو -

میں نے اِس مقالے میں اپنے معروضات کو ذرائع و وسائل کے بیان تک محدود رکھا ہے - لیکن یہ ذرائع اختیار کرنے کے ساتھ

ہمیں مدرسے اور یونیورسٹی کے نصاب میں جزوی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی ۔ نصابِ تعلیم میں ترمیم ، تنسیخ اور اضافے کا کام ماہرین کی کمیٹیاں کریں گی جن کی نظر یقیناً ان امور پر ہوگی کہ ضرورتِ وقت کا تقاضا کیا ہے اور ہمارے قومی مزاج کے لیے کن مضامین کا مطالعہ اور کن مضامین میں ریسرچ نتیجہ خیز ثابت ہوگی ۔

☆ ☆ ☆

علمی زبان کی حیثیت سے اردو کا مستقبل

اِس مضمون کی تاریخِ تحریر محفوظ نہیں رہی ، مگر قیاس ہے کہ یہ ۱۹۵۸ - ۱۹۵۹ میں لکھا گیا - اِس سے پہلے یہ مضمون شائع نہیں ہوا -

زندہ انسان اور زندہ زبان میں اِس قدر قریب کی مشابہت ہے کہ کسی زبان کو ''زندہ'' یا ''مردہ'' کہنا مجازی طور پر ہی نہیں ، لغوی طور پر بھی درست معلوم ہوتا ہے - یہاں مجھے عالمِ انسانی اور عالمِ لسانی کی مشابہت کے صرف ایک پہلو کا ذکر کرنا ہے ، اور وہ ہے اِن دونوں عالموں کی مسلسل حرکت اور رنگارنگی - یہ اِسی حرکت اور رنگارنگی کا کرشمہ ہے کہ انسان صبح سے شام اور شام سے صبح تک کئی مختلف دنیاؤں سے گزرتا اور نت نئے روپ دھارتا رہتا ہے - گھر کی دنیا ایک الگ دنیا ہے - اس دنیا میں وہ تہمد باندھ کر بچوں کے درمیان بیٹھتا ہے ، حقّہ پیتا ہے ، بیوی سے مٹّی کی ہنڈیا اور تانبے کی دیگچی کے نفع و ضرر پر بات چیت کرتا ہے ، گھوڑا یا اونٹ بن کر بچوں کو پیٹھ پر لادتا ہے ، یا بستر پر لیٹ کر خرّاٹے لیتا ہے - یہی انسان گھر سے نکل کر اپنے دفتر میں پہنچتا ہے تو گویا ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے - یہاں اُسے پیچیدہ حساب کی مدّوں اور خطیر رقوم کی میزانوں سے سروکار ہوتا ہے ، اپنے کارخانے کی نیک نامی پیشِ نظر ہوتی ہے ، یا اپنے اخبار کی اشاعت کا اضافہ مقصود ہوتا ہے - اُس کا دماغ حسابی ، کاروباری ، ادارتی مسائل سے اُلجھتا ہے اور اس نئی دنیا میں مشکلات کے حل کی

نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ سرسری طور پر دیکھیے تو یہ وہ شخص معلوم نہیں ہوتا جو گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ اودھم مچا رہا تھا۔ لیکن حقیقت صرف اِتنی ہے کہ یہی ایک انسان مختلف اور متعدّد دنیاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ دفتر پہنچ کر اُس نے صرف اتنا کیا ہے کہ گھر کی دنیا دفتر کی دنیا سے بدل لی ہے۔

زندہ زبان کو بھی، زندگی کی حرکت اور رنگا رنگی میں، بالکل یہی معاملہ پیش آتا ہے کیونکہ زبان کی بھی کئی دنیائیں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے بول چال کی دنیا ہے جہاں زبان گویا تہمد باندھ کر حقّہ پیتی ہے۔ اس دنیا میں زبان کو صرف اُن الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہم اپنے کنبے کے لوگوں میں، یا بے تکلّف دوستوں کے حلقے میں، یا بازار میں نکل کر پان بیڑی والے سے بات کرنے میں، استعمال کرتے ہیں۔ لیکن زبان اگر کسی متمدّن قوم کی زبان ہے تو وہ محض بات چیت کی دنیا تک محدود نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر "ترقی" یافتہ زبان میں روزمرّہ کے الفاظ کے علاوہ ادبی اور علمی اسالیبِ بیان کے لیے کئی قسم کے الفاظ کے ذخیرے موجود ہوتے ہیں جن کا استعمال موقع و محل کی مناسبت سے شاعری یا تنقید، افسانے یا علم و حکمت کی دنیا میں ہوتی ہے۔ ان مختلف دنیاؤں میں زبان اپنا رنگ اِس طرح بدل لیتی ہے کہ بعض دفعہ ایک دنیا کی بات دوسری دنیا میں سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ عام فہم زبان کا استعمال بڑا اچھا اُصول ہے لیکن علم اور حکمت عام فہم مضمون نہیں ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ جیسا مضمون ہو، اُسی قسم کا لفظی سانچا اُسے نصیب ہوتا ہے۔

میں نے اِس نکتے پر شروع ہی میں زور اس لیے دیا ہے کہ میرے نزدیک اِس کی اہمیت بنیادی ہے۔ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو یہ اعتراض کرتے سنا ہے کہ اُردو میں علمی اصطلاحات بنانے والے مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سوال اُس

علمی دنیا کا ہے جس کے لیے وہ اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں - جہاں منطق کے قضایا کے لیے صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب زیرِ غور ہو، وہاں "چکی" چولھے کے محاوروں سے کام نکالنا ناممکن ہی نہیں، نامناسب بھی ہے - اس نکتے کی وضاحت کے لیے میں دو مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں - فرض کیجیے، آپ کا کوئی بے تکلّف دوست آپ سے کہتا ہے:

> بھئی کیا بتاؤں، گھر سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ گلی کے نُکڑ پر پنواڑی کے ہاں منّو میاں کھڑے نظر آئے - ماموں جان کی قسم! میں اُڑ کر پہنچا اور تڑاق سے وہ چانٹا دیا کہ بھیّا کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا -

اپنے بے تکلّف دوست کی اِس گفتگو کے بعد مقابلے کے لیے مولانا وحید الدین سلیم مرحوم کا لکھا ہوا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے:

> بعض حضرات کی رائے ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے سے حافظے پر بار پڑتا ہے - سہولت اِسی میں ہے کہ ہر اصطلاح سے جو معنی مطلوب ہیں، وہ تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے جائیں، مگر ایسا کرنے میں یہی دقّت ہے کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے -

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کے بے تکلف دوست کی گفتگو کا عالم، اور زبان کے اصطلاح ساز کی ذہنی کاوش کا عالم، دو بالکل مختلف عالم ہیں - یہ اعتراض کہ ایک عالم کی زبان دوسرے عالم میں کیوں استعمال نہیں ہوتی، بداہۃً بے بنیاد ہے - برسوں پہلے جب مولانا نذیر احمد دہلوی نے تعزیراتِ ہند کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تو وہ بھی جانتے تھے کہ زبان میں "رشوت ستانی" اور "کالا پانی" کی ترکیبیں موجود ہیں لیکن اصطلاحی طور پر انھیں

"استحصال بالجبر" اور "حبسِ دوام بہ عبورِ دریاے شور" کا اختیار کرنا بجا طور پر بہتر معلوم ہوا۔

تاریخِ السنۂ عالم کا یہ ایک عام واقعہ ہے کہ زبان جب علمی دنیا کی طرف بڑھتی ہے تو اُس کے پہلے قدم اُکھڑے اُکھڑے سے معلوم ہوتے ہیں۔ نئے علمی انکشافات کے بیان کے لیے نئے الفاظ گھڑے جاتے ہیں۔ یہ نئے علمی الفاظ بے ساختہ نہیں آتے، ساختہ پرداختہ آتے ہیں، اس لیے شروع میں نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو جب اپنے شاگردوں کو اپنے مشّائی فلسفے کا درس دے رہا تھا تو اُسے بھی ضرورت پڑی ایسے مختصر الفاظ کی جو گہرے اور وسیع فلسفیانہ مطالب کو، بلا طوالتِ اظہار، ادا کر سکیں۔ مثلاً اُسے دو ایسے لفظوں کی ضرورت محسوس ہوئی جن سے کسی خاص چیز کی "حقیقت" اور "حجم" (یا "جسامت") کے عام فلسفیانہ تصوّر کا اظہار ہو سکے۔ یونانی زبان میں دو لفظ پوئیوس اور پوسوس موجود تھے جو "کس طرح کا" اور "کتنا بڑا" کے ہم معنی تھے۔ ارسطو نے اپنے وقت کے زباں دانوں اور روزمرّہ شناسوں کے نازک احساسات سے بے پروا ہو کر اِس "کتنا بڑا" اور "کس طرح کا" سے دو نئے لفظ گھڑ لیے اور بلا تکلّف اپنے مدرسے میں یوں پڑھانا شروع کر دیا جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں: اِس چیز کا "کتنا پن"، اُس چیز کا "کیسا پن"۔ دو سو برس بعد لاطینی زبان میں بعینہ اسی طریقے پر qualitas "کیسا پن" کے لیے اور quantitas "کتنا پن" کے لیے گھڑے گئے۔ پھر آٹھ سو برس اور گزر گئے۔ عربی زبان شاعری کی دنیا سے نکل کر علم کی دنیا میں داخل ہوئی تو عربوں نے اپنا "کیسا" اور "کتنا"، یعنی "کیف" اور "کم" لے کر، ارسطو کی تقلید میں، انھیں "کیفیت" اور "کمیّت" بنایا۔ اِس طرح اُردو کو "کیسا پن" اور "کتنا پن" کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ

عربی نے اپنے لفظ ''کیفیّت'' اور ''کمیّت'' اظہارِ مطلب کے لیے دے دیے تھے - غرض ہر زبان کو علمی حیثیّت دینے کے لیے ابتدا میں نئی وضع شدہ اصطلاحات کی غرابت کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے - اہلِ علم کے متواتر استعمال سے غرابت دور ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی تو کثرتِ استعمال سے یہ کیفیّت بھی ہوتی ہے جو لفظ ''کیفیّت'' کو پیش آئی کہ اس کا علمی مفہوم تقریباً نظر انداز ہو گیا اور لوگوں نے اسے عام بول چال کا لفظ بنا لیا -

کبھی کبھی اردو کی علمی حیثیّت پر ایک عجیب و غریب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم اِس زبان میں دی ہی نہیں جا سکتی - مراد یہ نہیں ہوتی کہ ''اِس وقت'' نہیں دی جا سکتی بلکہ معترضین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرے سے دی ہی نہیں جا سکتی - یہ اعتراض اِس طفلانہ غلط فہمی پر مبنی ہے کہ انگریزی زبان بطنِ مادر سے قبائے علم پہن کر نمودار ہوئی تھی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیا یونانی ، کیا لاطینی اور کیا عربی ، سب بول چال کی منزل سے شاعری کی منزل اور شاعری کی منزل سے ادبی نثر کی منزل اور ادبی نثر کی منزل سے علمی اظہار کی منزل تک بتدریج پہنچیں - عربی کو دیکھیے ، یہ اعلیٰ درجے کی شاعری کی زبان ضرور تھی ، لیکن خلافتِ عباسیہ کے آغاز میں اس کی علمی حیثیت اردو کی موجودہ علمی حیثیت کے مقابلے میں بدرجہا پست تھی - لیکن جوں ہی عربوں نے یونانی علمِ طب اور یونان کے مشّائی و اشراق فلسفوں کی طرف توجہ کی ، یہ سب علوم عربی میں اسی خوبی سے بیان ہوگئے جس طرح اصل یونانی میں ہوئے تھے - پس یہ کہنا کہ اردو اعلیٰ علوم کے اظہار کی متحمّل نہ ہوگی ، محض اپنی سادہ لوحی کا ثبوت دینا ہے - قصور اردو کے افلاس کا نہیں ، اہلِ اردو کی فرومایگی کا ہے -

اردو دنیا کی اُن چند خوش نصیب زبانوں میں سے ہے جو براہِ راست

تین مختلف سرچشموں سے سیراب ہوتی ہیں - ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کی زبان علمی طور پر صرف سنسکرت سے فیض یاب ہوتی ہے اور سنسکرت ایک مردہ زبان ہے - اس کے برعکس اُردو سنسکرت کے علاوہ دنیا کی دو نہایت ترقی یافتہ زبانوں عربی اور فارسی سے مستفید ہے اور خوش قسمتی یہ ہے کہ یہ دونوں زبانیں زندہ ہیں - علومِ جدیدہ کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیے ہمیں نہ صرف عربی اور فارسی کی مدد حاصل ہے ، بلکہ ترقی یافتہ عربی اور عجمی ممالک کی علمی مساعی سے اُردو زبان بھی خاطرخواہ فائدہ اٹھا سکتی ہے - اِس وقت ہمارے علمی الفاظ تقریباً تمام کے تمام عربی سے اور تہذیبی الفاظ بیشتر فارسی اور تُرکی سے ماخوذ ہیں - خدا کا شکر ہے کہ یہ چشمے ابھی خشک نہیں ہوئے - علمی حیثیت سے اُردو کو مستقبلِ قریب میں فارسی سے اور بالخصوص عربی سے روز افزوں رابطہ پیدا کرنا ہوگا -

جدید مغربی علوم سے اُردو کا تعلّق سوا سو برس ہوئے دہلی کالج میں شروع ہوا - وہاں علمی اصطلاحات کا ترجمہ اُردو میں نہایت خوش اسلوبی سے کیا گیا - آٹھ دس سال کے اس ابتدائی دَور میں سائنس کی تعلیم کو حیرت انگیز فروغ ہوا - افسوس کہ یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا - مکالے کی مشہور تعلیمی روداد کے ماتحت انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی اور یہ کیفیت آج تک برقرار ہے - اِس طرح برّ ِعظیم میں اُردو کی علمی حیثیت کو شدید نقصان پہنچا - اس کے باوجود اہلِ علم افراد حسبِ مقدرت اُردو کی علمی خدمت میں مصروف رہے ، لیکن سچ یہ ہے کہ زبان کی علمی حیثیت کے معاملے میں انفرادی کوششیں کچھ زیادہ کارگر نہیں ہوتیں - دہلی کالج کے بعد اِس سلسلے میں دوسری اہم اجتماعی کوشش پاکستان کے ظہور سے تیس برس پہلے حیدر آباد دکن میں ہوئی ، جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا - اِس یونیورسٹی میں چند ہی سال کی کوششوں

کے بعد یہ صورت رونما ہوئی کہ نہ صرف معاشیات ، ریاضی اور فلسفے وغیرہ کی تعلیم ایم - اے - کے درجے تک ہونے لگی بلکہ کیمیا اور طبیعیّات وغیرہ تجربی علوم بھی ایم - ایس سی - تک نہایت کامیابی سے پڑھائے جانے لگے - قانون میں ایل ایل - بی - اور طب میں ایم - بی - بی - ایس - جیسی ڈگریوں کے لیے حیدرآباد میں وہی تعلیم اُردو میں ملنے لگی جو پاکستان میں آج کل انگریزی میں دی جاتی ہے -

عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر جو کامیاب تجربہ ہوا ، اس کے بعد پاکستان کے نظامِ تعلیم میں اُردو کو جدید علوم کا ذریعۂ تدریس بنانے اور اِس مقصد کے حصول کے لیے ضروری منازل و وسائل پر غور کرنے کا وقت آ چکا ہے - کوئی زبان علمی زبان نہیں بن سکتی جب تک وہ اعلیٰ علوم کے لیے ذریعۂ تدریس نہ ہو - ہارون الرشید نے جب اپنے عہد کے علوم کو عربی میں منتقل کرانا چاہا تو بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا جس میں عرب ، ایران ، ہندوستان اور یورپ کے علما تصنیف اور ترجمہ کرتے اور نئے تصوّرات و نظریّات معلّم و متعلّم تک پہنچاتے تھے - عثمانیہ یونیورسٹی کی تمہید ایک دارالترجمہ سے بندھی - پنجاب یونیورسٹی کو بھی اِس قسم کے ادارے کی ضرورت ہے ، اور اگر دل لگا کر کام کیا جائے تو سال دو سال میں تمام ضروری علمی اصطلاحات اُردو میں مہیّا ہو سکتی ہیں - اُردو میں فارسی کے تمام لاحقے اور سابقے ، عربی کے تمام قواعدِ اشتقاق ، ایسی خوش اسلوبی سے استعمال ہوتے ہیں کہ تجربی اور فکری دونوں طرح کے علوم کی اصطلاحات حسن و خوبی سے اُردو میں منتقل ہو سکتی ہیں - جب تک اِس قسم کا دارالترجمہ کام نہیں کرے گا ، اُردو میں تعلیم نہیں دی جا سکے گی ، اور جب تک اُردو میں اعلیٰ علوم کی تدریس کا انتظام نہیں ہوگا اسے علمی زبان کا بلند مرتبہ نصیب نہ ہوگا -

اُردو کی علمی حیثیت منوانے کے لیے سب سے بڑا خطرہ خود یونیورسٹی کے دامنِ عاطفت میں چھپا ہوا ہے۔ یہ سنگِ گراں کالجوں کے پروفیسر حضرات ہیں جن کے ذہن پختگیٔ عمر کی وجہ سے جوانی کی لچک کھو چکے ہیں۔ یہ اصحاب ایک نئی سمت میں حرکت کرنے سے گھبراتے ہیں، لیکن جب واقعات کا تازیانہ علم کی شاہراہ پر کڑکتا ہو تو بھاری بھرکم شخصیتیں بھی خود بخود حرکت میں آتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اسلامیہ کالج دو حصّوں میں منقسم ہونے کے بعد

(روداد سالانہ)

۱۹۵۸ کے اوائل میں انجمنِ حمایتِ اسلام نے فیصلہ کیا کہ اسلامیہ کالج دو مستقل حصوں میں بٹ جائے گا جن میں سے ایک کا تعلق صرف انٹرمیڈیٹ کے شعبے سے ہوگا اور دوسرے کا صرف ڈگری کے شعبے سے۔ میں نے انتظامی اور مالی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر اپنے دوست (اور اُس وقت کے پرنسپل) شیخ محمد اسلم مرحوم سے تحریک کی کہ وہ انجمن کو اِس کارروائی سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ میرے سامنے بڑی دلیل یہ تھی کہ گورنمنٹ کالج، لاہور، نے بھی یہ انقلابی قدم نہیں اٹھایا۔ تاہم انجمنِ حمایتِ اسلام نے اپنے فیصلوں میں وائس چانسلر میاں محمد افضل حسین مرحوم کی رائے سے اتّفاق کیا۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۵۸ سے ایک اسلامیہ کالج کے دو علٰحدہ کالج بن گئے۔ ڈگری کالج کی پرنسپلی کے فرائض (انگریزی زبان و ادب کی معلّمی کے علاوہ) راقم الحروف کو تفویض ہوئے۔ ذیل کے کوائف اِسی ڈگری کالج کی تیسری رودادِ سالانہ میں پیش کیے گئے۔ یہ سالانہ جلسۂ عطاے اسناد و انعامات ۳ اپریل ۱۹۶۱ کو منعقد ہوا۔ جلسے کے صدر ملک امیر محمد خاں گورنر مغربی پاکستان تھے۔

صدرِ گرامی قدر، خواتین و حضرات،

آپ کی اِس نوازش کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ آپ اپنی مصروفیتوں کو پسِ پشت ڈال کر اسلامیہ کالج کے اِس سالانہ جلسے

میں شریک ہوئے ۔ خاص طور پر سمندر پار کے دوستوں کا شکریہ واجب ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ جلسے کی کارروائی انگریزی میں نہیں ہوگی ، محض کالج سے اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لیے تشریف لائے ۔ مگر سب سے بڑھ کر ، جناب والا ، میں آپ کے لطف و کرم کا احسان مند ہوں کہ کاروبارِ حکومت کی چند در چند ذمہ داریوں اور دن رات کی مصروفیت کے باوجود آپ نے ہماری عزت افزائی کے لیے نہ صرف اِس تقریب کی صدارت منظور فرمائی بلکہ جب میں کالج کی طرف سے دعوت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے بکمال مہربانی یہ ارشاد فرمایا کہ آپ کو خود بھی اسلامیہ کالج آنے کی خواہش تھی ۔

جناب والا ، آپ کو معلوم ہے کہ اِس کالج میں انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں شامل نہیں ہیں ۔ یہاں صرف بی ۔ اے/بی ۔ ایس سی ۔ اور ایم ۔ اے/ ایم ۔ ایس سی ۔ کے طلبہ کا داخلہ ہوتا ہے ۔ پھر بھی سالِ رواں میں کالج کے طلبہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی ۔ اِس ضمن میں مفصّل کوائف یہ ہیں :

گوشوارۂ تعداد طلبہ و طالبات بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۰

جماعت	تعداد طلبہ (سائنس)	تعداد طالبات (سائنس)	تعداد طلبہ (آرٹس)	تعداد طالبات (آرٹس)	کُل تعداد طلبہ	کُل تعداد طالبات	میزان
بی - اے -/بی - ایس سی - جونیر	۱۸۹	×	۲۴۳	×	۴۳۲	×	۴۳۲
بی - اے -/بی - ایس سی - سینیر	۳۳۸	×	۳۰۷	×	۶۳۵	×	۶۳۵
ایم - اے -/ایم - ایس سی - جونیر	۷۲	۸	۱۰۴	۲۰	۱۷۶	۲۸	۲۰۴
ایم - اے -/ایم - ایس سی - سینیر	۴۰	۱۰	۱۰۷	۲۰	۱۴۷	۳۰	۱۷۷
آنرز سکول	۸۴	×	×	×	۸۴	×	۸۴
	۷۱۳	۱۸	۷۶۱	۴۰	۱۴۷۴	۵۸	۱۵۳۲

مجھے تسلیم ہے کہ یونیورسٹی کی منزل میں داخل ہونے والے طلبہ کی یہ کثرتِ تعداد کسی صحیح تعلیمی نظام کے لیے زیبا نہیں ہے - لیکن ہمارا تعلیمی نظام ہمارے دفتری نظام سے وابستہ ہے - جب تک ہماری دفتری زبان انگریزی ہے ، یونیورسٹی میں داخلے پر موجودہ دباؤ قائم رہے گا - کیونکہ جیسی بُری بھلی انگریزی ہم لکھ سکتے ہیں ، اُس کی آخری کام چلاؤ سند یونیورسٹی ہی سے ملتی ہے - طلبہ کی اِس بڑی تعداد کے مقابلے میں اساتذہ کی تعداد ، سائنس کے شعبوں کے Demonstrators کو شامل کر کے ، ۵۰ تھی -

ایم - اے -/ایم - ایس سی - اور بی - اے -/بی - ایس سی - کے امتحانات میں کالج کے بعض طلبہ نے امتیاز حاصل کیا - اللہ دِتا کو بی - اے - میں نہ صرف درجۂ اول ملا بلکہ وہ اپنے مجموعۂ مضامین

کے لحاظ سے یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آئے - محمد ظفر اللہ بی - ایس سی - آنرز سکول سب سڈیئری میں اوّل رہے - نعمت علی جاوید کو بی - ایس سی - میں درجۂ اوّل ملا اور وہ اپنے مجموعۂ مضامین کے لحاظ سے یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آئے - فضل الٰہی ناگی نے بی - ایس سی - آنرز سکول اولڈ سلیبس (کیمسٹری پیور) میں درجۂ اوّل لیا اور یونیورسٹی میں اوّل رہے - عبدالرشید بی - ایس سی - آنرز سکول نیو سلیبس میں درجۂ اوّل لے کر یونیورسٹی میں دوم آئے - ثناء اللہ نے ایم - ایس سی - کیمسٹری ٹیکنیکل میں درجۂ اوّل لیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے - اِسی طرح محمد اقبال ایم - اے - (ریاضی) میں فسٹ کلاس لے کر یونیورسٹی میں بھی اوّل آئے - ہمارے ایم - اے - (انگریزی) کے طالب علم نذیر احمد ، اگرچہ تمام کالجوں کے طلبہ میں اوّل آئے مگر ایک پرائیویٹ خاتون امیدوار سے مات کھا گئے اور یونیورسٹی میں اُن کا نمبر دوسرا رہا -

مقرّرہ نصاب پورا کرنے کے علاوہ کالج کے کچھ اساتذہ اور طلبہ تحریری علمی کام میں بھی مصروف رہے - اگرچہ ابھی کالج کو وہ سہولتیں میسر نہیں ہوئیں جو اِس بارے میں تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے پیشِ نظر تھیں ، تاہم کچھ نہ کچھ کام جاری رہا - میرے رفقا میں سے یوسف جمال انصاری صاحب نے تنقید اور جمالیات پر اپنی مجوّزہ کتاب کی چند اور فصلیں لکھیں - حافظ احمد یار صاحب نے حسّان ابن ثابت کی سیرت اور کلام پر مفصّل مقالہ کالج کی انجمنِ عربی و فارسی میں پیش کیا - میاں محمد شمس الدین جنھوں نے گزشتہ سال پاکستان ہسٹری کانفرنس میں ”عماد الدین ریحان اور سلطان ناصر الدین محمود“ پر ایک مقالہ پڑھا تھا ، اِمسال اِسی کانفرنس میں ایک اور تحقیقی مقالہ ”تیرھویں صدی میں پاکستان و ہند کے صوفیائے کرام“ کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں - اختر اقبال کمالی صاحب نے غالب

کی بحروں پر ایک مبسوط تنقیدی مقالہ لکھا - سجاد باقر رضوی صاحب نے محمد حسین آزاد اور اصغر گونڈوی وغیرہ پر متعدد مضامین شائع کیے - افتخار احمد صدیقی صاحب نے مولانا نذیر احمد پر تحقیقی کام شروع کیا ہے اور اِس سلسلے میں چند ابواب کی تکمیل کر چکے ہیں - وحید قریشی صاحب کا مرتّب کیا ہوا صوفیہ کا تذکرہ ''ثواقب المناقب'' اِن دنوں ''یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین'' میں قسط وار شائع ہو رہا ہے - اس کے علاوہ انھوں نے اردو ''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام'' کے لیے ''داغ'' پر مقالہ تحریر کیا اور ''قتیل و غالب'' کے موضوع پر ایک اور تحقیقی مقالہ تیار کیا -

اساتذہ کے علاوہ طلبہ بھی کالج کی علمی اور فنی کاوشوں میں شریک رہے - تبسّم کاشمیری اور گوہر نوشاہی کی تحریریں ''قومی زبان'' اور بعض دوسرے ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں - سعید احمد بدر بنیادی جمہوریت کے تصوّر پر مضمون نویسی کے سرکاری انعامی مقابلے میں شریک ہوئے اور انھیں ایک سو روپے کا انعام ملا - کالج کے ایک اور طالب علم احمد ایاز ایم - اے - (تاریخ) کے امتحان کے لیے ''پہلی جنگِ عظیم تک مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے تعلقات'' پر مقالہ لکھ رہے ہیں - بی - ایس سی - کے طالب علم رحمت علی مجاہد نے انگریزی میں Nuclear Energy کے موضوع پر ایک مفصّل مقالہ قلم بند کیا جس کی ہمارے صدر شعبۂ طبیعیات نے تعریف کی ہے - بی - اے - کے طالب علم ، غلام رسول نے اہلِ ذوق سے اپنی نقّاشی کے کام کی داد پائی - اِن کی چار تصویریں اِس سال کراچی کی All Pakistan Inter-Collegiate Arts Contest and Exhibition میں بھیجی گئی ہیں اور یقین ہے کہ پسند کی جائیں گی -

ایک اور علمی منصوبہ ، یعنی خود اسلامیہ کالج کی داستانِ زندگی

کی ترتیب، ہمارے پیشِ نظر ہے اور توقع ہے کہ کتاب اِس سال کے دوران میں مرتب ہو سکے گی ۔ اِس ضمن میں یہ بھی گوش گزار کر دوں کہ گزشتہ سال یونیسکو اور حکومتِ پاکستان نے کالج کے پرنسپل کی عزت افزائی کرتے ہوئے اُسے تین مہینے کے لیے ایک علمی اور تعلیمی دورے پر ریاست ہائے متحدۂ امریکہ ، ترکیہ ، یونان اور برطانیہ بھیجا جہاں اسے تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کے معائنے نیز اِن مُلکوں کے اہلِ علم سے ملاقات کا موقع ملا ۔

کالج کے اندر متعدّد علمی مجالس میں اساتذہ اور طلبہ جمع ہوتے ہیں اور غیر رسمی انداز میں علمی و عملی مسائل پر تبصرہ کرتے ہیں ۔ ان میں کالج یونین ، بزمِ فروغِ اردو اور انگریزی کے Study Circle کا دائرہ نسبتاً وسیع ہے ۔ بزمِ فروغِ اردو ڈاکٹر تاثیر مرحوم کی قائم کی ہوئی پرانی مجلس ہے اور عرصۂ دراز سے مفید کام کر رہی ہے ۔ انگریزی کا Study Circle ہمارے سابق امریکن پروفیسر ولیم ولیفرڈ کی کوشش سے ۱۹۵۵ میں قائم ہوا اور اب اپنے پہلے صدر کی یاد میں ولیفرڈ سٹڈی سرکل کہلاتا ہے ۔ اِس مجلس نے بہت سے علمی جلسوں کا اہتمام کیا اور چند موقعوں پر بعض برطانوی اور امریکی اربابِ علم کی تقریروں اور مقالات سے بھی مستفید ہوئی ۔ کالج یونین کی سرگرمیاں اِس سال خصوصیت سے نمایاں تھیں ۔ یونین نے کالج میں دلچسپ مباحثوں کا اہتمام کیا ، اور ہمارے مقرّرین نے دوسرے کالجوں کی تقریبات میں شرکت کر کے کئی انعام اور ٹرافیاں حاصل کیں ۔ کارگزاری کا یہ سال یونین کو ایک وقفے کے بعد نصیب ہوا ، اور اس لحاظ سے دو گونہ اطمینان و مسرّت کا باعث ہے ۔ اگر ترقی کی یہ رفتار جاری رہی اور نظم و ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا گیا تو اسلامیہ کالج یونین ، کالج کی تہذیبی زندگی میں قابلِ قدر اضافہ کرے گی ۔

کالج کی ایک اور مجلس ”سیلف ہیلپ سوسائٹی“ کے نام سے موسوم

ہے - یہ چند با ہمت طلبہ کے ذوقِ عمل سے قائم ہوئی - کالج کا نباتی باغ اِسی مجلس کی بے غرضانہ کوششوں سے وجود میں آیا - حال ہی میں ''سیلف ہیلپ سوسائٹی'' کے ارکان نے آل پاکستان یوتھ موومنٹ کی دعوت پر بہ مقامِ برکی ایک ورک کیمپ میں شرکت کی - یہاں انھوں نے سڑک کی مرمت اور نالیاں بنانے میں ہاتھ بٹایا - سوسائٹی کے بیس ممبروں نے صدر صاحب انجمنِ حمایتِ اسلام کے ایما پر پولیس کو اِس غرض سے اپنی خدمات پیش کیں کہ سڑکوں پر بے راہ روی کی روک تھام ہو سکے - نیز دیہات میں بنیادی جمہوریتوں کے کام میں پوری مدد کا وعدہ کیا -

اِس قسم کی تنظیمات سے قطع نظر، کالج کے طلبہ اپنی پرانی روایات کے مطابق ہر کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے بے تاب رہتے ہیں - پچھلے دنوں جب میوہسپتال نے اپنے بلڈ بینک کے لیے خون کے عطیات مانگے تو اسلامیہ کالج کے طلبہ نے بلا تامّل لبیک کہا - اِس موقع پر ایم - اے - (سائیکالوجی) کے طالب علم اور اسلامیہ کالج یونین کے صدر محمد آصف نے پہل کی - پھر بی - ایس سی - کے طالب علم محمد سعید نے اپنا خون پیش کیا اور اس کے بعد یہ سلسلہ اب تک اِس طرح قائم ہے کہ اشد ضرورت کے وقت میوہسپتال کا بلڈ بینک مدد کے لیے اسلامیہ کالج کے نوجوانوں کو یاد کرتا ہے - یہ نوجوان جو بیماروں اور ضرورت مندوں کے لیے اپنے اُبلتے ہوئے خون کی خیرات دینے سے دریغ نہیں کرتے، وقت آنے پر اپنے خون کے جوش کو دبا بھی سکتے ہیں - حال ہی میں کانگو اور جبل پور کے جگر خراش واقعات نے لاہور کے طلبہ کو جس طرح مضطرب کر دیا تھا اس کی کیفیت آپ کو معلوم ہے - اسلامیہ کالج کے طلبہ بھی اِس عام اضطراب میں شامل تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے کالج کے اندر اور لاہور کی سڑکوں پر جس نظم و ضبط کا ثبوت دیا اُس کی تعریف مجھ سے خود

پولیس کے اعلیٰ حکّام نے کی ہے۔

نظم و ضبط کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے سالانہ کرکٹ میچ کا ذکر کرنا ہے جو کھیل کے میدان میں غلط قسم کی کشیدگی اور بدمزگی کا باعث بن گیا۔ افسوس ہے کہ ہمارے کالجوں کے طلبہ بار بار یہ بھول جاتے ہیں کہ کھیل محض کھیل ہے، لڑائی نہیں ہے۔ اور دراصل کھیل کے میدان ہی میں نظم و ضبط کا سبق صحیح طور پر سیکھا جا سکتا ہے۔ میں جب اپنے تین مہینے کے سفر کے بعد واپس لاہور پہنچا تو یہ تمام ماجرا سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ خاص طور پر اس لیے کہ میں نے سنا اِس ہنگامہ خیز میچ کے امپائر تک برہمیٔ مزاج سے محفوظ نہ رہے۔ اب میرا یہ منصب نہیں ہے کہ جن صاحبوں نے یہ تمام صورتِ حال آنکھوں سے دیکھی اُن کے بیان پر کوئی اضافہ کروں یا از سرِ نو اپنے کالج کی حمایت میں ردّ و قدح کا بازار گرم کروں، لیکن مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ بعض مہربانوں نے :

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے

کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے واقعات کو اِتنا مسخ کیا کہ بات کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ با ایں ہمہ اس ایک ناخوش گوار ہنگامے کی بنا پر ہمیں اپنے کالجوں کے طلبہ کی ذہنی صحت میں شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ میری رائے میں اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کا یہ سالانہ میچ ہماری تہذیبی زندگی کا ایک سالانہ امتحان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دونوں کالجوں کے درمیان یہ میچ اگلی مرتبہ خصومت کے انداز میں نہیں، دوستی کی فضا میں کھیلا جائے گا۔

ہاکی میں ہمارا اِس سال کا کھیل ایک عجیب و غریب لطیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے پہلے دن سے شکست کھانے کا تہیّہ کچھ اِس خلوص سے قائم کر لیا کہ یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں ایک میچ

ایسا بھی آیا جس میں ہم دس گول سے ہارے ۔ یہ ایک ایسا غیر معمولی واقعہ تھا کہ میں کچھ دیر اِس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ اِس شکست سے ہماری ہاکی ٹیم نے کالج میں ایک نیا "ریکارڈ" قائم کیا ہے لیکن بعض مورخین نے مجھے یقین دلایا ہے کہ پچیس برس پہلے ہم نے ایک اور یادگار موقعے پر ہاکی میں گیارہ گول سے شکست کھائی تھی ۔

اِس تذکرے کے بعد ، جنابِ والا ، میں آپ کی اجازت سے نسبتاً خوش گوار موضوعات کی طرف گریز کرنا چاہتا ہوں ۔ اِس سال ہماری فٹ بال ٹیم اپنا ہر میچ مسلسل جیتتی چلی گئی اور بالآخر فٹ بال کی ٹرافی بھی ہمارے حصے میں آئی ۔ آخری معرکے میں ہم نے دوسری ٹیم کو چھ گول کیے اور خود ہمارے خلاف ایک گول بھی نہ ہو سکا ۔ اِس سے پہلے مقامی کالجوں کی لیگ میں ہم نے ایک موقعے پر دوسری ٹیم کو نو گول سے شکست دی ۔ ان کامیابیوں میں ہماری فٹ بال ٹیم کے کپتان ، محمد نور جہاں ، کا بڑا حصہ ہے ۔ محمد نور جہاں گزشتہ سال اور اس سال پاکستان نیشنل ٹیم کے رکن منتخب ہوئے ۔ ان کے علاوہ آفتاب احمد ، خالد محمود اور ضیاء الحق پنجاب یونیورسٹی فٹ بال ٹیم میں لیے گئے ۔

ہماری والی بال ٹیم ایک اصطلاحی غلطی کی بنا پر یونیورسٹی کی ٹرافی جیتتے جیتتے رہ گئی لیکن والی بال میں ہمارے کھیل کے معیار کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کی جس ٹیم نے حیدر آباد میں انٹر یونیورسٹی والی بال چیمپئن شپ جیتی ، اُس کے پانچ میں سے چار کھلاڑی ہمارے طالب علم ، عارف بھٹی ، عارف حسین ، خالد مسعود اور امداد حسین تھے ۔ محمد عارف بھٹی فتح پانے والی یونیورسٹی ٹیم کے کپتان بھی تھے ۔

ہماری باسکٹ بال کلب کے ایک کھلاڑی ، اسلم یوحنا ، پنجاب

یونیورسٹی ٹیم کے علاوہ سنٹرل زون باسکٹ بال کلب کے بھی رکن منتخب ہوئے۔

ہماری روئنگ کلب نے چند سال کے وقفے کے بعد اِس مرتبہ بڑی سرگرمی سے مشق کر کے کشتی رانی کے مقابلوں میں ہر موقعے پر ممتاز حیثیت حاصل کی۔ ہم یوتھ لیگ ٹورنامنٹ کے چیمپئن بنے اور ہماری کلب کے سیکرٹری، محمد یوسف، بہترین کشتی بان قرار دیے گئے۔ پنجاب یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں ہم رنر اپ رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ روئنگ کی ٹرافی جیتنے میں برائے نام فرق رہ گیا تھا۔ ہم پُر اُمید طور پر اگلے سال کے مقابلے کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہماری کوہ پیما کلب سال بھر مختلف پیدل یلغاروں کا اہتمام کرتی رہی۔ گزشتہ موسمِ گرما میں کلب نے وادیٔ کاغان میں کوہ پیمائی کی ایک مہم کا انصرام کیا اور تعطیلِ سرما میں کلب کے پانچ رکن گھوڑا گلی کے ایک یوتھ ہاسٹلنگ کیمپ میں شامل ہوئے۔

جنابِ والا، میں نے کھیل اور ورزش کے میدان میں کالج کی بعض کامیابیوں اور بہت سی کوتاہیوں کی داستان بلا کم و کاست آپ کے گوش گزار کر دی۔ اب آپ کی اجازت سے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور میں یہی ایک کالج ہے جس کے پاس کھیل کا کوئی میدان نہیں ہے۔ اِس کالج کے طلبہ کے لیے لیکچر روم اور یونیورسٹی ٹورنامنٹ کے میدانوں کے درمیان کوئی ایسی منزل نہیں آتی جہاں وہ جمع ہو کر ایک دوسرے کی رفاقت میں مختلف کھیلوں کے لیے تیاری کر سکیں۔ اِس افسوس ناک صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج کی متروکہ عمارت تو ہمارے حصے میں آ گئی لیکن کھیل کے وہ میدان جو اِس کالج سے منسلک تھے، ابھی تک موجودہ قابضوں سے واگزار نہیں کرائے گئے۔ جنابِ والا، یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آج آپ ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں۔

میں نے یہ حالات اس لیے بھی تفصیل کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں کہ مجھے یقین ہے ، اگر آپ اس معاملے پر ذاتی توجہ مبذول فرمائیں تو کھیل اور ورزش کے میدان میں اسلامیہ کالج کی سہ سالہ محرومی کا دور یک قلم ختم ہو سکتا ہے ۔

حضورِ والا ، اب میں نے فریاد کے لیے زبان کھولی ہے تو ایک اور شکایت بھی گوش گزار کر ڈالوں ۔ کالج کے ہوسٹل کا ایک چوتھائی حصہ جو ۲۷ کمروں پر مشتمل ہے ، ابھی تک پراونشل آرم ریزرو پولیس کے قبضے میں ہے ۔ اگر یہ کمرے ، جو ہمارے ہوسٹل کا باقاعدہ حصہ ہیں ، ہمیں دلوا دیے جائیں تو اُن پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہوسٹل میں ناکافی اقامت کی بنا پر ہمارے طلبہ کو ہر سال اُٹھانی پڑتی ہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ مقیم طلبہ ہر کالج کی جان ہوتے ہیں ، اس لیے مقیم طلبہ کی تعداد میں اضافہ کالج کے لیے بہت تقویت کا باعث ہوگا ۔

تین برس ہو چکے ہیں جب متّحدہ کالج دو حصوں میں تقسیم ہوا تھا ۔ اُس وقت سے لے کر اب تک ہمیں اِس موجودہ عمارت میں ایک جمنیزیم کی اشد ضرورت رہی ہے جو ابھی تک تیار نہیں ہو سکا ۔ اِس کے علاوہ تقسیم کے پہلے دن سے لائبریری میں ہزارہا کتابیں الماریوں کے نہ ہونے کی وجہ سے فرش پر پڑی ہیں ۔ حکومتِ پاکستان نے ایک گراں قدر رقم کالج لائبریری کی اصلاح و ترقی کے لیے عطا فرمائی ہے ۔ جوں ہی یہ رقم ہمیں دست یاب ہوتی ہے ، لائبریری میں بہت سے خلا پُر ہو جائیں گے ۔

باٹنی اور زوآلوجی کے شعبے جگہ کی قلّت کی وجہ سے فزکس اور کیمسٹری کی تجربہ گاہوں کے درمیان بھنچے ہوئے ہیں ۔ اِن دونوں شعبوں کے لیے ایک نئی دو منزلہ عمارت کی تجویز زیرِ غور ہے ۔ اِس سلسلے میں مجھے غالباً ملک کے مخیّر حضرات سے درخواست کرنی پڑے گی کہ وہ سائنس کی تعلیم کی ایک بنیادی ضرورت رفع کرنے کے لیے

کالج کی دست گیری فرمائیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اِس سال بھی کالج بحیثیتِ مجموعی خوش گوار اتّحادِ عمل کا ثبوت دیتا رہا۔ کالج کی فضا کو بے آئینی سے پاک رکھنے میں طلبہ نے اساتذہ کے ساتھ قابلِ تعریف تعاون کیا۔ کالج کے عملے کی مجموعی ہیئت بدستور قائم رہی۔ صرف عبدالخالق صاحب، لکچرار فلسفہ، کے محکمۂ تعلیم میں منتقل ہو جانے سے ایک جگہ خالی ہوئی۔ عبدالخالق صاحب کالج کے قدیم طلبہ میں سے ہیں۔ اور جب ۱۹۵۸ میں لکچرار کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا تو وہ بہت اچھے اُستاد ثابت ہوئے۔ ان کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا تھا اُسے پُر کرنے کے لیے ہمیں خوش قسمتی سے پروفیسر سعادت علی خاں جیسا قابل اور تجربہ کار اُستاد مل گیا۔ پروفیسر سعادت علی خاں کالج میں ۱۰ فروری سے کام کر رہے ہیں۔

اور اب، جناب والا، وہ گھڑی آ پہنچی ہے جس کے انتظار میں میرے چند عزیز طلبہ بڑے صبر سے یہ طویل روداد سنتے رہے ہیں۔ میں بڑی مسرّت سے اپنے ان انعام پانے والے عزیزوں کو نام بنام آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اِس منزل پر میری ذاتی خوشی انعام پانے والوں کی خوشی سے کم نہیں ہے۔ اگر اس خوشی کا لحاظ کروں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر انعام پانے والے کے ساتھ خود میں نے بھی ایک انعام حاصل کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

پاکستان کی تہذیبی روایت

یہ خطبہ ایمرسن کالج ، ملتان ، کی سالانہ تقریبِ عطاے اسناد کے موقع پر بتاریخ ۸ اپریل ۱۹۶۲ پڑھا گیا۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کی دنیا سے باہر تعلیمی تقریبات کی زبان اُس وقت تک انگریزی قرار دی جاتی تھی۔ ملتان کے اِس جلسے میں سول سروس اور فوج کے مقامی حکّام بھی موجود تھے ، اور قومی زبان سے اِن افسروں کی اجنبیّت معروفِ عام ہے۔ اِن حالات میں اُردو کا استعمال خود بخود ایک معذرت کا متقاضی تھا جو قارئین کو آغازِ کلام میں ملے گی۔

جناب پرنسپل صاحب ، عزیز طلبہ ، خواتین و حضرات ، میں معافی چاہتا ہوں کہ یہ چند معروضات جو میں نے اِس تقریب کے لیے قلم بند کیے ، انگریزی زبان کے بجائے اُردو میں پیشِ خدمت ہیں۔ آپ کو شاید معلوم ہے کہ پیشے کے لحاظ سے مجھے عمر بھر انگریزی زبان و ادب کی تدریس سے کام رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی پیشہ ورانہ مجبوریوں کا طوق میرے گلے میں نہیں ہوتا ، میں اپنے دل کی خوشی کے لیے احباب و اعزّہ سے اپنی زبان میں دل کی باتیں کہتا ہوں۔ اور آج صبح کی یہ محفل تو بڑی خوشی کی محفل ہے۔ اس لیے میں آپ سے اپنے دل کی باتیں دل کی زبان میں کہنے کی اجازت چاہتا ہوں :

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہاے گفتنی دارد

جنابِ والا ، میں اپنی اِس عزت افزائی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا ہے کہ اس مسرّت انگیز تقریب میں شرکت کروں اور اِس عظیم درس گاہ کے اِس سال فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو اُن کی متعدّد عقلی و اخلاقی کامیابیوں پر دلی مبارک دوں۔

سب سے پہلے میں اِس سالانہ روداد پر ، جس کی تفصیلات آج صبح ہمارے سامنے آئی ہیں ، اپنی طرف سے اطمینان و مسرّت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بڑی مبارک فال ہے کہ اِس کالج کے صاحبِ فراست اور اُولوالعزم اساتذہ و طلبہ کے اشتراکِ عمل سے قابلِ تعریف تعلیمی نتائج برآمد ہوئے ، اور سال بھر ایک ایسی فضا قائم رہی جس میں یہ ممکن ہو سکا کہ نوجوان اہلِ علم اور پختہ عمر کے اہلِ علم ، مِل جل کر ، اپنی ذہنی کاوشوں سے دل و دماغ کی زندگی کے لیے وہ اکسیر تیار کریں جس سے بڑی کیمیا نہ قدیم مصر و یونان نے دریافت کی ، نہ قرونِ وسطیٰ میں خود ہمارے روشن ضمیر اسلاف نے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے اپنے دَور کے دانش ورانِ مغرب بھی انسانی تمدّن کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کے لیے کوئی اِس سے زیادہ کارگر نسخہ مہیّا نہیں کر سکے۔ یقین جانیے کہ تحصیلِ علم کے بغیر اقوامِ عالم میں سے کسی کو کبھی فروغ نصیب نہیں ہوا۔ جب کبھی علم سے قوموں کا رشتہ کٹ جاتا ہے ، وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتی ہیں۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر اگر غور فرمائیے تو خود بخود ظاہر ہے کہ علم کی روشنی کے مرکز قوم کی زندگی کے مرکز ہیں۔

جنابِ والا ، میں خوش ہوں کہ قومی زندگی کا یہ مرکز ، جسے ایمرسن کالج کہتے ہیں ، آپ جیسے دردمند اور صاحبِ بصیرت رہنما کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھ رہا ہے۔ آپ نے اپنی روداد میں ایک مختصر سا اشارہ یہ بھی کیا ہے کہ گزشتہ سال ایک ایسی صورت پیش آئی کہ آپ نے دنیوی ترقی سے منہ پھیرا اور بدستور اِس

کالج کی خدمت کرتے رہنے کو ترجیح دی - اپنے کام سے یہ لگن اور جاہ و منصب سے یہ بے نیازی ہمارے علمائے سلف کی ایک درخشاں روایت کی یاد تازہ کرتی ہے - کاش! اربابِ تعلیم میں اس قسم کی قابلِ تقلید مثالیں اس قدر خال خال نہ ہوں جس قدر فی الحقیقت ہیں -

آپ نے اپنی تقریر میں یہ امید ظاہر کی ہے کہ یہ کالج بالآخر ملتان کی اپنی یونیورسٹی کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوگا - میں اس امید کے اظہار میں آپ کا ہم نوا ہوں اور اس خیال کی تائید کرتا ہوں کہ اِس شہر میں ایک الگ یونیورسٹی کا قیام نہ صرف موزوں بلکہ ضروری ہے - ملتان ہمارے اکابرِ مشائخ و صوفیہ اور علما و صلحا کا شہر ہے - برِّعظیم پاکستان و ہند میں یہی شہر تھا جو ہماری قومی تہذیب کا پہلا اہم مرکز بنا ، اور اس تہذیبی صدر مقام کا فیضان صدیوں تک دور دور پہنچتا رہا - اِس شہر کے چپّے چپّے میں ہماری علمی تاریخ اور تہذیبی روایت کے آثار پوشیدہ ہیں ، اور اب جب کہ ہماری قوم کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی ہے ، کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ملتان کی علمی و تہذیبی روایت کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے یہاں ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں نہ آئے - یہ شہر دینی اور دنیوی علوم کے جن لازوال خزانوں کا وارث ہے ، وہ خود تقاضا کرتے ہیں کہ اُن کی حفاظت اور فروغ کا انتظام ایک مستقل یونیورسٹی کے ذریعے سے کیا جائے -

خواتین و حضرات ، بارہ سو برس ہو چکے ہیں کہ شہر ملتان کی زندگی پاکستانی قومیّت ، یعنی ہند اسلامی نظریۂ حیات ، کے سانچے میں ڈھل رہی ہے - اِسی مناسبت سے مجھے خیال گزرا کہ اہلِ علم و بصیرت کی اِس مجلس میں میرے لیے بہترین طریقِ کار یہ ہوگا کہ قومی تہذیب کے مسئلے کو موضوعِ سخن بناؤں - یہ صورت اس لیے بھی موزوں معلوم ہوئی کہ جو عزیز طلبہ فضیلت کی سند لے کر آج اپنی

اِس مادرِ تعلیمی سے رخصت ہو رہے ہیں ، وہ علم و عمل میں ہمارے ماضی کی بہترین امانت ، زمانۂ حال میں پاکستان کی پوری عزت و شان کے علم بردار ، اور مستقبل کے لیے ہماری سب سے گراں بہا اُمّید ہیں ۔ اِن نوجوانوں کے سامنے پاکستان کی اُس دولت کا تذکرہ ، جسے ہم اپنی قومی تہذیب کہتے ہیں ، خصوصیت سے بر محل معلوم ہوتا ہے ۔

قومی تہذیب کی کوئی ایسی منطقی تعریف ، جو سائنس کے قوانین کی قطعیّت رکھتی ہو ، شاید عملاً ممکن نہیں ہے ۔ زندگی کی بہترین قدریں ، جیسے صداقت ، حسن اور عدالت ، منطقی تعریف سے ہمیشہ بالاتر رہی ہیں اور تہذیب کا مسئلہ بھی انھی بلند ترین اقدار سے وابستہ ہے ۔ تاہم سمجھنے سمجھانے کا عمل تہذیب کے تصوّر کی کوئی حتمی حد بندی کیے بغیر بھی کسی حد تک ممکن ہے ۔ اس لیے میں اِس موضوع پر اپنے چند خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں ۔

سب سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ کسی قوم کے مذہب کو اُس کی تہذیب کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے ، لیکن مذہب اور تہذیب محض ایک چیز کے دو نام نہیں ہیں ۔ ذاتی طور پر میرے لیے کسی ایسی تہذیب کا تصوّر ممکن ہی نہیں ہے جو مذہبی اعتقادات کے کسی نہ کسی سلسلے پر مبنی نہ ہو ۔ با ایں ہمہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ محض اصولِ دین پر ازروئے عقل و فہم حاوی ہونا ، یا احکامِ شریعت پر خلوصِ نیّت سے کاربند ہونا ، ہی کسی شخص کو "مہذّب" انسان نہیں بناتا ۔ یہ مسلّم ہے کہ تہذیب کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جب دینی نظریے کسی ملکی یا علاقائی معاشرت کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں ۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ تہذیب اُس مرکّب اندازِ فکر و عمل کا نام ہے جو کسی قوم کے مذہب اور جغرافیے اور تاریخ اور فنونِ لطیفہ

اور علم و حکمت ، الغرض ایمان و اخلاق اور عقل و احساس کے تمام سرچشموں سے بہرہ یاب ہو - ترکیب و امتزاج کے عمل کے باوجود مذہب اور تہذیب کی جداگانہ مگر متّصل شخصیّت اپنی اپنی جگہ قائم رہتی ہے - مذہب کے بنیادی حقائق اٹل اور ہر حال میں قابلِ تسلیم ہیں - اِس کے برعکس تہذیب کو لیجیے تو یہ کیا عقل ، کیا جمالیات ، کیا اخلاق ، ہر پہلو سے تنقید کی زد میں آتی ہے - تہذیب میں زوال و فساد بھی ممکن ہے اس لیے اس میں اصلاح و تغیّر کی گنجائش باقی رہتی ہے - تہذیب کا خاکہ بڑی حد تک انسان کا اپنا ساختہ پرداختہ ہے ، اس خاکے کے نقوش ہر قوم کے مخصوص مزاج ، حالات اور عقائد کے مطابق قرنوں اور صدیوں میں بتدریج اُبھرتے ہیں - اِس لحاظ سے قومی تہذیب فرد اور جماعت دونوں کی مشترک میراث ہے - اِس کے سہارے فرد اور معاشرہ باہم ایک معتدل رشتے میں منسلک رہتے ہیں - ایک طرف فرد زندگی سے حظ اُٹھاتا ہے اور اِس لطف اندوزی کی سند تہذیب کے اجتماعی ضابطے سے لیتا ہے - دوسری طرف معاشرہ مختلف افراد (اور بعض دفعہ مختلف المفاد افراد) کو متوازن حالت میں رکھ کر اجتماعی ترقی کی نئی راہیں کھولتا ہے - تہذیب کے عالم میں حاکم اور محکوم ، آقا اور خادم ، بیوپاری اور گاہک ، ہر ایک کا تعلق باہمی رواداری کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے -

یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ میں نے تہذیب کو ایک ”اندازِ فکر و عمل“ کا نام دیا ہے - یہیں سے تہذیب اور تمدّن کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے - تمدّن کے مظاہر خارجی دنیا میں موجود ہوتے ہیں - مسجد کے گنبد و مینار ، نقاشی کے رنگ اور خطوط ، غزل کا قافیہ اور ردیف ، راگ کے سُر اور بول ، یہ سب ایک خاص قومی تمدّن کے عناصر ہیں - لیکن تہذیب ایک ذہنی کیفیت ، یا یوں کہیے کہ ذہنی کیفیتّوں کا ایک مجموعہ ، ہے جو خارجی دنیا میں بالواسطہ منعکس

ہوتا ہے - ہماری قومی تہذیب جس ذہنی پس منظر میں اُبھری ہے اُس کا سب سے نمایاں عنصر دینِ اسلام ہے - ہمارا دینی عقیدہ بعض دوسرے مذہبی عقائد کی طرح پُراسرار ، دُھندلا ، اور خواب ناک نہیں ہے - یہ ہمارے صحنِ مسجد کی طرح کُھلا اور روشن ہے - اس میں سب سے پہلے اور سب سے اہم خدا کی وحدانیت پر ہمارا یقین ہے - اِس عقیدے کی دوسری شق انسانی مساوات کا وہ تصوّر ہے جو ہمارے معاشرے کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ بڑے شہروں سے لے کر دُور دراز دیہات و قصبات تک مسافر کی مدارات ، خواہ وہ دنیا کے دوسرے سرے سے آیا ہو ، اِس طرح پر ہوتی ہے جیسے گھر کے سب سے معزّز مہمان کی - مساواتِ انسانی کے اِسی بنیادی تصوّر کی ایک اور شق یہ ہے کہ ہماری قومی تہذیب ذات پات کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتی ، اگرچہ ہندو تہذیب کے بعض آثار جو ہمیں ورثے میں ملے ہیں ، اِس بارۂ خاص میں کبھی کبھی ہمارے عمل اور ہمارے تہذیبی نصب العین کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں -

قومی تہذیب کے اہم عناصر کے ذکر میں مذہب کے بعد ہماری مخصوص معاشرتی تنظیم کا مقام آتا ہے - ہماری خانگی زندگی میں میاں بیوی ، والدین اور اولاد ، بھائیوں اور بہنوں ، اعزّہ و اقربا ، کے باہمی تعلقات کا معیار ایک حد تک اُسی بنیادی تصوّر سے ماخوذ ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا - اس تصوّر کے ماتحت خدائے تعالیٰ کو ایک ایسی رحیم و شفیق مگر قابلِ پرستش ہستی قرار دیا گیا ہے جو انسان سے شخصی اور ذاتی تعلّق رکھتی ہے - دکھ درد میں اُس کی پکار سنتی ہے اور اُس پر مہربانی کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہے - یہیں سے خُردی و بزرگی کا وہ تصوّر بھی پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف بڑی عمر کا لحاظ ایک نیکی قرار پایا ہے - اگر بڑے شہروں میں نہیں تو ہمارے دیہات کی عظیم الشّان آبادی میں اب بھی ہر شخص

اپنے سن و سال کے اعتبار سے ادب و احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور اس میں امیری غریبی کے فرق کا لحاظ نہیں کیا جاتا ۔ اسی طرح ہر یتیم بچے اور مصیبت زدہ انسان کی مدد پر آمادہ رہنا ، رستے سے بھٹکے ہوئے مسافر کو راہ بتانا ، حرف شناسی میں ان پڑھ طالب علم کی رہنمائی کر کے روحانی اطمینان حاصل کرنا ، آپس میں لڑے ہوئے دوستوں کی صلح کرانا اور آزار میں مبتلا جانور کو آسرا دینا ، ہمارے تہذیبی شعائر میں خاص طور پر شامل ہیں ۔ لاہور کے گلی کوچوں میں آپ کو بارہا یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ آپ ٹھوکر کھا کر گرنے لگے تو پاس ہی سے کسی بڑی بوڑھی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی : ''بسم اللہ !'' یہ صورت پاکستان کے ہر شہر ، قصبے اور گاؤں میں پیش آتی ہے ۔ خطاکار کی خطا معاف کرنا ، بھوکے کو کھانا اور ننگے کو کپڑا دینا ، محنت کر کے روزی کمانا ، ماں باپ کی خدمت اور بہن بھائی کی مدد کرنا ، بلکہ علمی و فکری زندگی بسر کرنا اور لکھنا پڑھنا تک ''ثواب'' کے کام ہیں ، یعنی پاکستانی معاشرے کے خاص تہذیبی مظاہر میں شمار کیے جاتے ہیں ۔

استاد و شاگرد کا رشتہ بھی اسی قسم کی احترام آمیز بنیادوں پر قائم ہے ۔ سعدیؒ نے سات سو برس پہلے کہا تھا کہ ''جورِ استاد بہ کہ مہرِ پدر'' ۔ اس حقیقت کا دھندلا سا عکس اب بھی ہمارے ملک میں کہیں کہیں موجود ہے ۔ انھی بدلتے ہوئے تہذیبی عقائد میں مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کا تصوّر بھی ہے ۔ ہماری تہذیبی روایت کہتی ہے کہ نامحرم عورت کے سامنے ہماری نظریں خود بخود جھک جاتی ہیں ۔ یہ دستور ابھی ہمارے ملک سے مٹ نہیں گیا ، لیکن زمانۂ حال کے معاشرتی زلزلوں نے اب ہماری قوم میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر دیا ہے جس کے نزدیک شہر کے رہگزاروں پر آنے جانے والی عورتوں کو سرمشقِ نظر بازی بنانا ایک اہم وظیفۂ حیات ہے ۔

اب میرا روئے سخن خصوصیت سے اپنے اُن نوجوان دوستوں کی طرف ہے جنھیں اپنے تعلیمی کام کی بنا پر آج اسناد و انعامات حاصل ہوئے ہیں ۔ عزیزانِ من ، میں نے پاکستان کی تہذیبی روایات کا محض ایک سرسری خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے ۔ اِس خاکے میں آب و رنگ بھرنا میں آپ کے تخیّل پر چھوڑتا ہوں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس خاکے کے بیشتر اجزا ، یا کم از کم بعض اجزا ، اگر آپ کو نہیں تو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو تقویمِ پارینہ معلوم ہوں گے ۔ گزشتہ ایک سو برس میں ہماری انگریزی تعلیم ہمیں اپنے دینی عقائد اور تہذیبی روایات سے بتدریج دُور لے گئی ہے ۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہمارے دانش وروں کے ایک طبقے کو ، جس میں ہماری سِول سروس کے جواں سال افسروں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے ، دین و مذہب اور تہذیب و روایت کے نام سے چِڑ ہے ۔ یہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ان پرانے ڈھکوسلوں میں اب کیا باقی رہ گیا ہے ؟ کچھ ایسی ہی صورت چار سو برس پہلے یورپی اقوام کو بھی پیش آئی تھی ۔ میرا اشارہ تحریکِ احیا (Renaissance) کے زمانے کی طرف ہے ، جب نئے علوم نے مذہبی اور تہذیبی زندگی کے پیراہن کو تار تار کر دیا تھا ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب 'فاؤسٹ' کی داستان پیدا ہوئی ۔ ایک مشہور انگریزی ، اور مشہور تر جرمن ، ڈراما اِس موضوع کی طرف آپ کی توجّہ مبذول کرا چکا ہے ۔ غور کے قابل یہ بات ہے کہ انکارِ عقائد کا یہ دور یورپ میں زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا ۔ ایک سو برس کے اندر وہ نئے علوم جو شروع شروع میں پیٹ کے اندر سما نہ سکے تھے ، بالآخر ہضم ہو کر جزوِ بدن بن گئے ، اور یورپی ادبیات اور فنونِ لطیفہ کا مسیحی تسلسل ، جو تھوڑی دیر کے لیے برہم ہوا تھا ، ذرا سا بدل کر ، ایک نئے انداز میں پھر قائم ہو گیا ۔

ہماری صورت حال سولھویں صدی کے یورپ کے مقابلے میں کچھ کم حوصلہ افزا ہے - نئے علوم کے ظہور نے ہمیں قدرتی طور پر جس ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دیا ہے ، اُس سے مخلصی کی کوئی واضح صورت اب تک پیدا نہیں ہوئی - اس مشکل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمیں نہ صرف ایک نئے ذخیرۂ معلومات کا سامنا ہے ، جو ہمارے پرانے اعتقادات اور قدیم روایات سے مربوط نہ ہو سکا ، بلکہ وہ نئی زبان بھی جو ان معلومات کی تبلیغ کا ذریعہ بنی ، ایک پیچ در پیچ زنجیر کی صورت میں ہمارے ذہنوں کو چمٹ گئی ہے - ہمارے پاؤں جو باہر سے آنے والے علوم کی پہلی ٹکّر میں اُکھڑ گئے تھے ، ایک باہر سے آنے والی زبان کی بیڑیوں میں پھنس کر بالکل شل ہو گئے - انسان کا سرمایۂ علم و اخلاق شعوری کوشش کے علاوہ غیر شعوری اثرات کا بھی مرہونِ منّت ہوتا ہے - اس لیے یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ بحالاتِ موجودہ ہمارے بچوں کے لاشعور میں روزِ اوّل سے یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ عقل کی بات صرف غیر زبان میں کہی جا سکتی ہے - یقین مانیے کہ اس سے بڑی اخلاقی مصیبت کسی قوم پر نازل نہیں ہو سکتی - اس سے نقّالی اور بے ہنری اور علمی منافقت کو فروغ ہوتا ہے ، قومی اخلاق پر نونہالانِ قوم کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے اور جب یہ نوبت آ جائے تو مذہب اور تہذیب اور قومی روایات کا خدا حافظ ہے -

لیکن اس کے باوجود ، اے عزیزانِ من ، ذہنی امراض کا محض سمجھ لینا بھی نصف علاج قرار دیا گیا ہے - یاد رکھیے کہ بے یقینی ، انتشار ، اور ناامیدی سے قومیں مر جاتی ہیں اور جو معجزہ اُن کو پھر زندہ کر سکتا ہے ، وہ اپنی تقدیر پر اُن کا ایمان ہے - امریکی فلسفی ولیم جیمز نے کیا خوب کہا ہے کہ حقیقت وہ ہے جسے تم خود اپنے یقین و ایمان کی قوت سے پیدا کرتے ہو - سچ پوچھیے تو بے یقینی ،

انکارِ حقیقت ہی کا آغاز نہیں ، روح کی موت کی پہلی منزل بھی ہے ۔ آپ نے پچھلے دنوں سنا ہوگا کہ پسرور کے ایک مدرّس نے اپنے طلبہ کی جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی قربان کر دی ۔ میں نے اِس پر کہا تھا کہ طلبہ کی وہ جماعت بھی قابلِ احترام ہے جسے اپنے استاد کے دل میں سچی محبّت اور جاں فروشی کا بے مثال جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت میسّر ہوئی ۔

عزیزانِ من ، اس قسم کے واقعات سے مجھے اور آپ کو ایک بڑا سبق ملتا ہے ۔ اس سبق کی روشنی میں اپنا آئندہ طریقِ کار طے کیجیے ۔ اپنی قوم سے بہترین توقعات وابستہ رکھیے تاکہ ان توقعات کے پورا ہونے کا امکان پیدا ہو سکے ۔ بے اعتمادی کے جواب میں صرف بے اعتمادی ملتی ہے ۔ آپ اپنے اساتذہ پر ، اپنے والدین پر ، اپنے متعلّقین پر ، بھروسا کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اس بھروسے کے جواب میں انسانی فطرت کس خلوص سے لبّیک کہتی ہے ۔ بے معنی ہنگاموں میں اپنے قیمتی اوقات کو ضائع نہ کیجیے ۔ اپنی کوششوں کا رُخ تعمیری کاموں کی طرف پھیریے ۔ بے یقینی اور انتشار اور نا اُمیدی نے ہماری قوم کو بے شمار نقصان پہنچائے ہیں ۔ مگر آپ سے ، اے نوجوانانِ قوم ، ہم لوگوں کو اُمید ہے کہ خود ہماری نسل جس کشتی کو منجدھار سے نہیں نکال سکی ، آپ اُسے ساحلِ مراد پر لے آئیں گے ۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کی ہمّتوں میں برکت دے ۔

خواتین و حضرات ، میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اِن معروضات کو ، جن میں کہیں کہیں وعظ کا تلخ انداز پیدا ہو گیا تھا ، صبر اور توجّہ سے سنا ۔

☆ ☆ ☆

ہماری قومی تہذیب اور موجودہ نظامِ تعلیم

یہ مقالہ انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۸- اپریل ۱۹۶۲ میں پڑھا گیا -

جنابِ صدر، خواتین و حضرات،

مجھے یقین ہے کہ اربابِ دین و دانش کے اِس اجتماع میں میری یہ گزارش کسی توضیح یا ثبوت کی محتاج نہ سمجھی جائے گی کہ تہذیب، تمدّن، علم، اخلاق، اور تعلیم و تربیت اپنے ناموں کے ظاہری اختلاف کے باوجود دراصل انسانی زندگی کی باہم مربوط اور متّحد حقیقتیں ہیں - تہذیب و تمدّن کا چولی دامن کا ساتھ تو اِس حد تک مسلّم ہے کہ بے احتیاط لوگ دونوں کو ایک دوسرے سے گڈ مڈ کر دیتے ہیں - یہی کیفیت علم و اخلاق کو بھی پیش آتی ہے - اِس میں شک نہیں کہ علم و اخلاق کی طرح تہذیب و تمدّن کا دائرۂ کار بھی اِتنا مِلا جُلا سا ہے کہ عوام الناس کا دونوں میں صحیح فرق نہ کرنا کچھ ایسی اچنبھے کی بات نہیں ہے - مجھے اِس وقت تہذیب و تمدّن اور علم و اخلاق کے جداگانہ وجود سے بحث نہیں ہے - میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تہذیب ہو یا تمدّن، علم ہو یا اخلاق، سب کے ظہور اور فروغ کا محکم ترین وسیلہ تعلیم و تربیت ہے - قومی تہذیب قومی تعلیم کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے - یہ دونوں ایک دوسری سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتیں - اِس لحاظ سے آپ یقیناً میرے اِس سوال کو قابلِ غور خیال فرمائیں گے کہ ہمارا موجودہ

نظامِ تعلیم ہمیں کس حد تک ہمارے اسلامی نصب العین اور ہمارے قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے تیار کرتا ہے ؟

ہماری قومی تہذیب نے جن ذہنی کیفیتوں سے ترکیب پائی ہے اُن میں سب سے پہلے اور سب سے اہم ہمارے مذہبی عقائد ہیں - اِن مذہبی عقائد میں توحیدِ باری تعالیٰ پر ہمارا ایمان ہمیں خوفِ غیراللہ سے آزاد کرتا ہے ، ہمیں ایک مستحکم اور خوددار شخصیت دیتا ہے اور دنیا کے جاہ و مال کی کشش کے مقابلے میں استغنا اور قناعت سکھاتا ہے - ہمارا ایمان ہے کہ دین و دنیا ایک ہی وحدت کے دو رخ ہیں ، دو علاحدہ حقیقتیں نہیں ہیں - بنی نوعِ انسان کا باہمی تعلق مساوات اور اخوت کا تعلق ہے - مسلمانوں کے ایکے کی بنیاد اُن کا وطن نہیں بلکہ اُن کا اسلامی عقیدہ ہے - ہم اہلِ پاکستان کے یہ اعتقادات ہماری نسلی ، قبائلی اور علاقائی روایات میں گھل مل گئے ہیں - ہم بزرگوں کا ادب کرنے کو تہذیب کی علامت سمجھتے ہیں ، لیکن مال دار آدمی کو محض اس کی دولت کی بنا پر قابلِ تکریم قرار نہیں دیتے - اہلِ علم و فضل کو ہم اپنے خاص احترام کا مستحق سمجھتے ہیں - ہمارے ذہن میں عورت کا ایک مخصوص معاشرتی مقام ہے جس کے ماتحت غیر عورت بھی ، اپنی عمر کے فرق کے لحاظ سے ، ہماری ماں یا بہن کی حیثیت رکھتی ہے - ہم اپنے ہمسایے کے رنج و راحت میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے ہیں - ہماری گفتگو کا عام لب و لہجہ عجز و انکسار کا ہے ، لیکن ظلم یا زیادتی کا مقابلہ کرنے سے ہم کبھی نہیں چُوکتے -

یہ سب کچھ ہماری قومی تہذیب کی مختلف کیفیتوں کی جامع فہرست نہیں ہے - لیکن اِن چند مذکورہ عناصر سے ہماری تہذیب کی انفرادی شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے - اِس مختصر سے اشارے کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ ہر تہذیب کے ساتھ ایک مخصوص نظامِ معاشرت وابستہ ہوتا ہے جسے ہم تمدن کہتے ہیں - ہر تہذیب اپنے

اِسی متعلقہ نظامِ معاشرت یا تمدّن کے سہارے زندہ رہتی ہے - جب اسلام کے تہذیبی نظریات جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر مصر و شام اور ایران و ہند میں داخل ہوئے تو قدرۃً مقامی تہذیبوں اور تمدّنوں سے مخلوط ہو گئے - تاہم ایک ہزار برس تک ہمارے ہند پاکستانی تمدّن کی بنیادی اسلامی حیثیت قائم رہی - اُنیسویں صدی میں مغربی دنیا سے آئے ہوئے سیاسی ، سائنسی اور عمرانی انقلابات کا ایک ناقابلِ تسخیر سلسلہ شروع ہوا جس کی یورش کے سامنے ہمارے قومی تمدّن کے قدم ڈگمگانے لگے - مغربی قوموں نے نئے سائنسی اور جمہوری تصوّرات کے ماتحت اپنے تمدّن میں بتدریج تبدیلیاں پیدا کی تھیں اور اِس عمل میں چند سو برس کا عرصہ صرف ہوا تھا - ہمیں اُنیسویں صدی میں ایکا ایکی ایک بالکل نئی صورتِ حال پیش آئی جس نے قدرتی طور پر ایک ذہنی اور معاشرتی خلفشار برپا کردیا - ہمارے قومی تمدّن کی بنیاد اُن پرانے علوم پر تھی جو اب فرسودہ اور زائد المیعاد معلوم ہونے لگے تھے - یورپ کے صنعتی انقلاب نے جو تمدّن پیدا کیا اُس کے اندر رہ کر پرانے علوم پر قناعت کرنا ناممکن ہو گیا ، اور اِس نئے ، اور حیرت انگیز طور پر مختلف ، تمدّن کی فضا میں ہمارے اپنے تہذیبی نظریات کا دم گُھٹنے لگا - ہماری اسلامی تہذیب کو زندگی کا سانس لینے کے لیے اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد ایک نئے اسلامی تمدّن کی ضرورت تھی جو ہم پیدا نہیں کر سکے - اِس تہذیب نے جو تمدّن خود پیدا کیا تھا ، وہ برباد ہو چکا ہے اور اس کی جگہ یورپ اور امریکہ سے آئے ہوئے صنعتی دَور کے تمدّن نے پُر کر دی ہے - مصیبت یہ ہے کہ صنعتی دور کا یہ تمدّن ہمارا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے ، غیر اقوام سے لیا گیا ہے ، اِس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ اِس تمدّن کے پیچھے جو تہذیبی تصوّرات ہیں وہ غیر ملکی اور غیر اسلامی ہیں - ہماری اپنی تہذیب

کو زندہ رہنے کے لیے جس قسم کی بیرونی فضا درکار تھی ، وہ گزشتہ ایک سو برس میں بتدریج غائب ہوتی گئی ہے - اب ہر طرف ایک ذہنی انتشار کا عالم ہے ، اور ہم میں سے بعض لوگ یہ پوچھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ موجودہ دور میں پرانی تہذیب کی قدروں کو زندہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے ؟ اور اگر ضرورت ہے تو کیا اِن بے سہارا تہذیبی قدروں کا زندہ رہنا ممکن بھی ہے یا نہیں ؟

خواتین و حضرات ، آپ کو معلوم ہے کہ یہ اُلجھن پچھلی صدی میں پیدا ہوئی تھی - سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر ہم اپنے پرانے علوم پر قناعت کرتے ہیں تو یہ علوم نئے تمدّن کی فضا میں بے کار اور مُردہ ہو کر رہ جاتے ہیں - اور اگر بدرجۂ مجبوری نئے علوم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ علوم اور ان کا پیدا کیا ہوا تمدّن دونوں مل کر اُن تہذیبی تصوّرات کو مضحکہ خیز اور غیر حقیقی بنا دیتے ہیں جو پرانے علوم پر مبنی ہیں اور جو کسی نہ کسی رنگ میں ہمارے اسلامی عقائد سے وابستہ ہیں - ہمارے قائدِ اوّل سیّد احمد خاں نے نئے علوم کے حق میں فیصلہ کیا اور مجھے یقین ہے کہ یہی فیصلہ صحیح تھا - سیّد احمد خاں کا خیال تھا کہ مغربی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اگر اسلامی عقائد کی تعلیم بھی دی جائے تو مسلمان طالب علم کا تہذیبی مرکزِ ثقل برقرار رہے گا - آپ سب کو معلوم ہے کہ عملاً یہ امّید پوری نہیں ہو سکی اور خود ہمارے محمڈن اور اسلامیہ کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ کی بہت بڑی تعداد اپنی تہذیب سے بیگانہ ، اپنے عقائد میں متزلزل اور اپنے قومی مستقبل سے مایوس ہو کر زندگی میں قدم رکھتی ہے - ہمارا موجودہ تمدّن ، جو اسلامی تہذیبی تصوّرات سے براہِ راست کوئی ربط نہیں رکھتا ، ہمارے اپنے تہذیبی تقاضوں کو ہمارے لیے تکلیف دہ بنا دیتا ہے - نئی خوراک ، نیا لباس ، نئی وضع قطع ، جلسے میں نہیں تو گھر میں ، گھر میں

نہیں تو مسجد میں اور اہلِ مسجد کے درمیان ، ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے - پرانے فیشن کا مسلمان علی الصباح بیدار ہوتا تھا - ہم نئے مسلمان صبح سویرے نہیں اٹھ سکتے کیونکہ رات کو دیر تک جاگنا فیشن میں داخل ہے - انگریزی معاشرت کے دستور اجازت نہیں دیتے کہ رسمی تعارف کا سہارا لیے بغیر کسی اجنبی سے بات چیت شروع کر دی جائے - ہمارے آبا و اجداد نئے رسوم و قیود سے بالاتر تھے اور بلاتکلّف ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو جانا جائز قرار دیتے تھے - اِس کے برعکس ہماری موجودہ زندگی میں بارہا یہ صورت پیش آتی ہے کہ ایک ہی محلے میں رہنے والے پڑوسی ایک دوسرے کے پاس سے بیگانہ وار گزر جاتے ہیں - ہم اپنی عورتوں کو غیر اسلامی پردے کی فضا سے نکال کر ایک اس سے زیادہ غیر اسلامی بے پردگی کی فضا میں لا ڈالتے ہیں جس کی بنیاد مخلوط رقص اور اس قسم کی بعض اَور سرگرمیوں پر ہے - ٹیلیفون پر اپنے والدِ ماجد سے بھی ''فرمائیے'' کے بجائے ''ہلو'' کہہ کر خطاب کرتے ہیں - سڑک پر گزرتی ہوئی عورت کو اچھی طرح گھور چکتے ہیں تو پھر کہیں پتا چلتا ہے کہ یہ تو اپنی ہمشیرۂ عزیزہ تھیں - شراب پینے سے کوئی تعلّق نہیں ہے مگر گلاس سے گلاس ٹکرا کر پانی سے بھرا ہوا جامِ صحّت ضرور نوش فرما رہے ہیں - کیا ''غزل'' اور کہاں کی ''کافی'' ! اِن میں جو ہے وہ اب ایک ''وحشی'' صنفِ سخن ہے - اور موسیقی کے لیے تو ہماری آنکھیں اب براڈوے پر جمی ہوئی ہیں -

اِس مصیبت کا سب سے محکم حل تو یہ تھا کہ ہم بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ایک نئے قومی تمدّن کی تخلیق کرتے جو ہمارے تہذیبی مزاج کے لیے سازگار ہوتا - لیکن علاج کی یہ منزل ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہے - یہ عمل اگر صدیوں کی نہیں تو ایک آدھ صدی کی مدّت ضرور چاہتا ہے - اس کے بجائے ہمارے لیے اب نسبتہً کم کارگر

حل باقی رہ گئے ہیں ، مگر افسوس یہ ہے کہ ہم ان پر بھی کوئی توجہ نہیں کر رہے ہیں - یہ ظاہر ہے کہ علوم خواہ مغرب میں پیدا ہوں خواہ مشرق میں ، اُن کی اپنی کوئی قومیت نہیں ہوتی ، لیکن جس طریقے پر ہم مغربی علوم کی تحصیل کرتے ہیں وہ اُنھیں غیر قومی اور غیر ملکی علوم بنا دیتا ہے - ہم نے جدید علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کے بارے میں بڑی غفلت کی ہے - اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہماری زبانیں نئے علوم سے الگ رہ کر خود نئی زندگی سے کٹ گئی ہیں - اِس قسم کی پس ماندہ زبانوں سے ہمارا تعلق ہمیں ایک احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے -

بلاشبہ نئے علوم ہمیں مغرب کی طرف سے پہنچے ہیں - افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم نے انھیں غلامانہ طور پر قبول کیا ہے - ان سے واقفیّت حاصل کر کے اس واقفیّت کی بنیاد پر نئی تفصیلات و جزئیات کی تخلیق نہیں کی - یہ ظاہر ہے کہ جن علمی جزئیات کی تخلیق ہم خود کرتے ، وہ ہمارے تہذیبی مزاج اور معاشرتی ضروریات اور طور طریقوں سے کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور رکھتیں -

کیا مدرّس اور کیا نصابِ درس ، دونوں ایک اجنبی فضا کے ترجمان بن کر ہم پر نازل ہوتے ہیں - اُستاد بھی غیر (یا کم از کم ایک غیر بولی بولنے والا) اور علوم کے انکشافِ حقیقت کا انداز بھی ایسا کہ اگر فطری مقتضیات سے نہیں تو ہمارے مقرّرہ روایتی احساس سے بے تعلق - گویا ہماری طالب علمی کی سطح جوں جوں بلند ہوتی ہے ، اُتنی ہی تحصیلِ علم کے فطری تقاضوں کی نفی کرتی ہے - تحصیلِ علم بنیادی طور پر وہ عمل ہے جو جانی ہوئی اشیا کی بنا پر ہمیں نامعلوم حقائق کی معرفت تک لے جاتا ہے - اس کے برعکس ہماری تعلیمی منزلیں نامعلوم سے شروع ہوتی ہیں اور بالآخر ہمیں نامعلوم تک پہنچا دیتی ہیں -

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم و تدریس جو بھی معلومات ہمیں مہیّا کرتا ہے، وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر ہمارے اندر سے نہیں ابھرتیں، باہر سے آتی ہیں۔ اِنھیں غیر کے عطیّے کے طور پر وصول کر کے نہ ہمارے ذہن میں تموّج پیدا ہوتا ہے، نہ ہماری قومی غیرت کے تقاضوں کی تشفّی ہوتی ہے۔ الغرض یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہماری تعلیمی دنیا کا اصل مرض نقّالی اور علمی خیرات خوری ہے۔ ذہنی غلامی سے نجات پانے کے لیے لازم ہے کہ ہم اپنے عالمِ افکار اور دائرۂ موجودات دونوں کو تخلیق، تجدّد اور اجتہاد کے عمل سے آشنا کریں، تاکہ جو کچھ دوسروں نے نہیں دیکھا وہ ہم دیکھیں، اور جس حقیقت کو دوسروں نے نظر انداز کیا ہے، اُس کا انکشاف ہم کریں۔ اگر فکری اجتہاد کی بلندیاں ہمارا منتہاے مقصود ہیں تو اِس سفر کی پہلی منزل یہ ہے کہ ہم کسی ایسی زبان میں سوچنے کی طرح ڈالیں جو ہمیں ہمارے تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی پس منظر سے بہت دور نہیں لے جاتی۔ جب تک ہماری تعلیم اِس بنیادی انقلاب سے روشناس نہ ہوگی، فکری اجتہاد کا عمل شروع نہ ہوگا، اور جب تک فکری اجتہاد کا عمل شروع نہ ہوگا اُس وقت تک ہماری رسائی نہ کسی زندہ قومی تہذیب تک ہوگی، نہ کسی زندہ قومی تمدّن تک۔

☆ ☆ ☆

اساتذہ و طلبہ کے ملے جُلے معاشرے کے بعض مسائل

(رودادِ سالانہ)

اقتباساتِ ذیل اگرچہ اسلامیہ کالج کی ایک رودادِ سالانہ سے ماخوذ ہیں لیکن ان کے پیچھے یہ بنیادی سوال مرکزِ توجّہ ہے کہ معلّم و متعلّم کا مل جُل کر زندگی بسر کرنا کس حد تک ممکن ہے ؟ یہ روداد ۲۶ مئی ۱۹۶۲ کے جلسۂ عطاے اسناد و انعامات میں پیش ہوئی - اِس جلسے کے صدر شیخ انوار الحق ، جج ، ہائی کورٹ ، مغربی پاکستان ، تھے -

جنابِ صدر ، خواتین و حضرات ،

جون میں ڈھلتی ہوئی مئی کی یہ تپش اِس قسم کے جلسے کے انعقاد کے لیے سازگار نہ تھی لیکن آپ کی کرم گستری اور لطف و محبت نے ہماری مشکل اِس طرح آسان کر دی کہ برستی آگ کا یہ موسم بھی کیفیت سے خالی نہیں رہا - آپ کی اِس نوازش پر میرا دل احساسِ تشکّر سے لبریز ہے - بعض ایسے احباب بھی اِس محفل میں تشریف لائے ہیں جن کی اپنی زبان انگریزی ہے ، اور اُردو نہ جاننے کے باعث وہ ہماری آج شام کی کارروائی میں پوری طرح شریک نہیں ہو سکتے - اُن کی تشریف آوری کالج کے ساتھ اُن کے تعلّقِ خاطر کا خاص ثبوت ہے جس کا دُہرا شکریہ ہم پر واجب ہے - یقین مانیے کہ

گرمی کا پارا جتنا چڑھا ہوا ہے ، کم از کم اُتنا ہی ہماری شکرگزاری کا پیمانہ بلند ہے -

جنابِ والا ، آج شام آپ کا اِس مجلس میں رونق افروز ہونا خاص طور پر باعثِ مسرّت ہے کیونکہ آپ کی یہ صدارت اِس کالج کے ساتھ آپ کے ایک رُبع صدی پرانے تعلق کی یاد تازہ کرتی ہے - جس زمانے میں آپ یہاں ایم - اے - (معاشیات) کے طالب علم تھے اُس کے بعد سے اب تک کالج کئی انقلابات سے دوچار ہوا ہے - ان میں سے نقلِ مکان کا انقلاب ، جو چند سال ہوئے عمل میں آیا ، خود بخود ظاہر ہے - آپ کو کالج سے رخصت ہوئے چند ہی برس گزرے تھے کہ ریلوے روڈ کی گنجان آبادی کچھ اور گنجان ہو گئی اور وہاں سے نکل کر یونیورسٹی کے قریب آ جانا ہمارے لیے اشد ضروری ہو گیا - اِسے لطیفۂ غیبی سمجھیے کہ ہمیں اِس متروکہ عمارت میں سر چھپانے کو جگہ مل گئی - لاکھوں روپے اِس کی مرمت پر صَرف کرنے کے باوجود ہم اِس عمارت کو اساتذہ و طلبہ کی موجودہ ضروریات کے لیے ناکافی پاتے ہیں اور اب بھی اِس کی توسیع و تعمیر کے منصوبے ہمارے پیشِ نظر ہیں - ایک دوسرا انقلاب ۱۹۵۸ کے اوائل میں آیا جب اِس کالج نے ملک بھر میں سب سے پہلے انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں الگ کر کے صرف یونیورسٹی سے اپنا الحاق مخصوص کر لیا - یہ عمل کئی لحاظ سے ہمیں بہت مہنگا پڑا - لیکن اِس وقت نئی صورتِ حال کا یہ پہلو آپ کی خدمت میں پیش کرنا مقصود نہیں ہے - خاص طور پر کہنے کی بات یہ ہے کہ کالج کی تقسیم کے بعد پہلے تین سال تک طلبہ کی تعداد بتدریج بڑھتی گئی - لیکن گزشتہ سال ، جو تقسیم کا چوتھا اور سہ سالہ نصاب کا دوسرا برس تھا ، طلبہ کی تعداد میں نمایاں کمی ہو گئی - اِس کمی کے اسباب سے قطع نظر ، یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ لاہور کے دوسرے کالجوں کو بھی یہی صورتِ حال پیش آئی

ہے - سالِ ماسبق میں کالج کے طلبہ اور طالبات کی مجموعی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کچھ اوپر تھی - گزشتہ داخلے کے موقع پر یہ تعداد گھٹ کر ایک ہزار کے قریب رہ گئی -

اِس تعداد کی جماعت وار تفصیل یہ ہے :

گوشوارۂ تعداد طلبہ و طالبات بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۱

جماعت	تعداد طلبہ (سائنس)	تعداد طالبات (سائنس)	تعداد طلبہ (آرٹس)	تعداد طالبات (آرٹس)	کُل تعداد طلبہ	کُل تعداد طالبات	میزان
بی - اے -/بی - ایس سی - سالِ اول	۱۵۰	×	۲۳۰	×	۳۸۰	×	۳۸۰
بی - اے -/بی - ایس سی - سالِ دوم	۹۸	×	۱۲۲	×	۲۲۰	×	۲۲۰
ایم - اے -/ایم - ایس سی - سالِ اول	۴۳	۵	۹۵	۱۷	۱۳۸	۲۲	۱۶۰
ایم - اے -/ایم - ایس سی - سالِ دوم	۳۳	۸	۱۰۴	۲۰	۱۳۷	۲۸	۱۶۵
آنرز سکول	۶۰	×	×	×	۶۰	×	۶۰
	۳۸۴	۱۳	۵۵۱	۳۷	۹۳۵	۵۰	۹۸۵

طلبہ کی اِس تعداد کے مقابلے میں اساتذہ کی موجودہ تعداد ، سائنس کے شعبوں کے demonstrators کو شامل کر کے ۵۷ ہے -

بی - اے -/بی - ایس سی - کے نتائج کی شرح ۱۹۶۰ کے اوسط کے مقابلے میں افسوس ناک طور پر کم معلوم ہوتی ہے - لیکن اس کمی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۶۰ - ۱۹۶۱ دو سالہ نصاب کے طلبہ کا آخری سال تھا - یونیورسٹی ، اور بالخصوص کالج ، کے جو قواعد دورِ آخر کے آخری طلبہ کے نا اہل حصے کو امتحان دینے سے روک سکتے تھے ، ان کی فیاضانہ تاویل ، ہر ممکن حد تک ، جانے والے طلبہ کے حق میں کی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض

خوش فہموں کو جو فیّاضی اور اِسراف میں تمیز نہیں کرتے، یہ گمان گزرا کہ :

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
گیرودارِ حاجب و درباں دریں دربار نیست

بہرحال فیّاضی کے اِس سایہ دار درخت کا پھل چند مہینے بعد ناکام طلبہ کی ایک بڑی کھیپ کی شکل میں ظاہر ہوا اور اب آپ اسے ایک میوۂ تلخ قرار دیں یا کچھ اور، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

گزشتہ امتحانات میں کالج کے بعض طلبہ نے امتیاز حاصل کیا۔ اکرام الحق اور غلام ربانی نے بی۔ اے۔ میں اور جاوید سکندر اور فصیح الدین طُور نے بی۔ ایس سی۔ میں فسٹ کلاس لی۔ اکرام الحق فسٹ کلاس لینے کے علاوہ یونیورسٹی بھر میں سائیکالوجی اور اردو (آنرز) کے مضمونوں میں اول رہے۔ محمد خلیل بھٹی پورے چھ برس کالج کے طالب علم رہ کر اس سال یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے۔ (فلسفہ) میں اول آئے۔ اِسی طرح محمد مشتاق ایم۔ ایس سی۔ (باٹنی) میں اوّل رہے، مشتاق احمد ایم۔ ایس سی۔ (کیمسٹری پیور) کے امتحان میں فسٹ کلاس لے کر اوّل آئے۔ رضوان الٰہی شیخ نے ایم۔ اے۔ (سائیکالوجی) میں فسٹ کلاس لی اور یونیورسٹی بھر میں اوّل رہنے کے علاوہ اِتنے زیادہ نمبر لیے کہ علومِ عمرانی (Social Sciences) میں پنجاب یونیورسٹی کے کسی اور طالب علم نے آج کے دن تک نہیں لیے تھے۔ جنابِ صدر، آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ یونیورسٹی نے رضوان الٰہی شیخ کو تحقیقی کام کرنے کے لیے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ عطا فرمایا ہے۔ یہ وظیفہ دو سال تک جاری رہے گا۔

جنابِ والا، علم بلاشبہ زندگی کی اعلیٰ اقدار میں ہے لیکن یقیناً اس سے بھی بلند مقام اخلاقِ حسنہ کا ہے۔ چنانچہ مجھے اور

میرے رفقا کو سب سے زیادہ خوشی اُس وقت ہوتی ہے جب طلبہ کی طرف سے از خود کسی نیک ارادے یا نیک کام کا ظہور ہو - پچھلے دنوں جب طلبہ کی فیسوں میں کمی کا فیصلہ کیا گیا اور انہیں زائد وصول شدہ رقم واپس ادا ہونے لگی تو ملک خضر حیات طالب علم بی - ایس سی - سالِ اول کو دفتر کی غلطی سے پچاس پچپن روپے اُن کی اصل رقم سے زائد ادا ہوگئے - دوسرے دن وہ میرے پاس چلے آئے اور زائد رقم واپس کرگئے - خواتین و حضرات ، بات سرسری سی ہے مگر ہمارے فلاکت زدہ ملک میں اِس قسم کی دیانت کا ثبوت بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے - اِسی قسم کی نیک نیتی کی ایک مثال اُس طالب علم کی ہے جس نے بغیر اپنا نام ظاہر کیے مجھے پچاس روپے کی رقم بھیجی ہے تاکہ میں اسے کالج کی مسجد کی تعمیر میں صَرف کروں - جس خط میں پچاس روپے کی یہ رقم بند تھی اُس میں طالب علم موصوف نے لکھا تھا : ''میں آپ کا ایک بے حد حقیر اور غریب طالب علم ہوں - یہ ہدیہ . . . تعمیرِ مسجد کے لیے قبول کیجیے -'' اِس کالج کے بہت سے طالب علم تہی دست اور فاقہ مست ہیں - اِن میں سے کسی کا پچاس روپے کی رقم کالج کے حوالے کر دینا حیرت انگیز ایثار کا ثبوت ہے - کالج کے طلبہ میں بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے اپنے علاقے میں اپنے شوق سے خدمتِ خلق کا کام کرتے ہیں - اِن میں مجھے محمد اشرف بی - اے - سالِ دوم کا خاص طور پر ذکر کرنا ہے جو نئی بستی ، دھرم پورہ ، میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے ادارے کے لیے رضاکارانہ حیثیت سے کھیلوں کی تنظیم کرتے ہیں - اِسی جذبے کے ماتحت ہمارے متعدّد طلبہ نے میو ہسپتال کو اپنے خون کا عطیّہ پیش کیا ہے - اِن میں عبداللطیف ، ریاض حیدر ، مخدوم مختار ، تاج الدین اور انور حسین خاص طور پر شاباش کے مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے اُستاد خواجہ وحید احمد کی قیادت میں اِسی سال کے اندر دو

مرتبہ اپنا خون بلڈ بنک کو دیا ۔

جنابِ صدر ، آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ کالج کے طلباے قدیم میں ایسے مخیّر حضرات بھی ہیں جو گاہ بہ گاہ سو دو سو کی رقم میرے ہاتھ میں رکھ جاتے ہیں کہ میں اسے نادار طلبہ کی مدد کے لیے کام میں لاؤں ۔ حال میں میرے دوست اور سابق شاگرد شیخ عبدالحمید نے کالج کے مستحق طلبہ کو چار وظائف دینے کے لیے دو سو روپے ماہوار کے عطیے کا وعدہ کیا ہے جو انشاء اللہ تین برس تک جاری رہے گا ۔ اِس ماہوار عطیے کی پہلی دو قسطیں کالج کو وصول ہو چکی ہیں اور تجویز یہ ہے کہ آئندہ ماہ ستمبر میں پچاس پچاس روپے کے چار وظیفے بی ۔ اے ۔ اور بی ۔ ایس سی ۔ کے طلبہ کو دیے جائیں ۔

کالج کی علمی مجالس میں کالج یونین نے اِس سال بھی مستعدی سے کام کیا ۔ بہت سے مباحثے اور مذاکرے منعقد ہوئے جن میں موجودہ طلبہ کے علاوہ طلبائے قدیم اور متعدد اربابِ علم نے حصہ لیا ۔ یونین کی طرف سے طارق ریاض ، قاضی راحت جاوید اور یحییٰ خاں دوسرے کالجوں سے انعام جیت کر لائے ۔

بزمِ فروغِ اُردو کے کام کی رفتار گزشتہ سال کچھ سست رہی ۔ جو جلسے ہوئے اُن میں صرف اساتذہ کے مقالات تھے ، کسی طالب علم کا کوئی مقالہ نہ تھا ۔ لیکن یہ کمی کالج کی ایک اور مجلس نے جو ''ینگ رائیٹرز'' کے نام سے موسوم ہے ، بڑی خوبی سے پوری کر دی ۔ ''ینگ رائیٹرز'' کے جلسے باقاعدگی سے ہوتے رہے ۔ ان جلسوں میں متعدد طلبہ و طالبات نے قابلِ قدر مضامین و منظومات پیش کیے جن میں تبسّم کاشمیری ، صابر کیفی ، (مس) شناور خاں اور نفیس عذرا نے نمایاں حصّہ لیا ۔

اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس سوسائٹی اور ولی فرڈ سٹڈی سرکل کے اجلاس بھی طلبہ کی تحریری کاوشوں سے خالی نہ رہے ۔

ولی فرڈ سٹڈی سرکل کو سمندر پار کے اہلِ علم نے بھی بارہا اپنی تقریروں سے مستفید فرمایا - اِس سلسلے میں منجملہ دوسرے اربابِ دانش کے ، ڈاکٹر شیمل ، مسٹر ڈی - وائی - مارگن ، مسٹر آر - ایچ - گیتھن ، مسٹر ڈبلیو - جے - کریگ اور مسٹر جے - لیٹر برگر کے نام ہیں - اسی طرح ہسٹری سوسائٹی نے پروفیسر این - ایچ - ویلز ، مس پٹریشیا ھاگن اور ڈاکٹر انوار الحق سید جیسے مشاہیر سے استفادہ کیا -

شعبۂ طبیعیات کے صدر ، اور کالج کے وائس پرنسپل ، پروفیسر عبدالحمید بیگ ، اپنے طویل عرصۂ ملازمت کے لحاظ سے ہم سب پر فوقیت رکھتے ہیں - مگر اُن کی ذات میں کم از کم ایک اور کمال ایسا بھی ہے جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی - وہ اسلامیہ کالج کے عملے کے تنہا ''سپورٹسمین'' ہیں - جہاں دوسرے اساتذہ ، یہاں تک کہ ہمارے جواں سال ڈائرکٹر آف سپورٹس بھی ، کھیل کے اکھاڑے سے باہر رہ کر نوجوان کھلاڑیوں کو کھیل کے گُر سُجھاتے ہیں ، وہاں جواں ہمت حمید بیگ گُر سکھانے والے گُرو ہی نہیں ، اپنی ٹیم کے باقاعدہ کھلاڑی بھی ہیں - میری مراد کالج کی کوہ پیما کلب سے ہے جس کے ارکان کے ساتھ ، اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کی تسخیر میں پروفیسر مرزا حمید بیگ خود بھی قدم بہ قدم شریک رہتے ہیں - گزشتہ سال مرزا صاحب بیافو گیانگ گلیشئر کا مطالعہ کرنے والی بین الاقوامی سائنسی مہم کے ساتھ تھے - اِس سال ۲۵,۴۰۰ فٹ اونچی سال تورو کانگڑی چوٹی کی تسخیر کرنے والی پاکستانی - جاپانی مہم کی قیادت فرمائیں گے - خواتین و حضرات ، مجھے یقین ہے کہ آنسٹھ سال کے اِس نوجوان پروفیسر کو گزشتہ اور آئندہ کامیابیوں پر دلی مبارک باد پیش کرنے میں آپ سب میرے ہم نوا ہوں گے -

جنابِ والا ، کھیلوں کا ذکر کرتے ہوئے میں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے کھلاڑیوں کو پہاڑوں کے علاوہ میدانوں اور دریاؤں سے

بھی کچھ نہ کچھ سروکار رہا ہے ، اگرچہ کچھ عرصے کے لیے کیفیت یہ ہوئی کہ ان کے سر پر آسمان ضرور تھا مگر پاؤں کے نیچے زمین نہ تھی - انٹرمیڈیٹ کے حصّے سے علیحدگی کے بعد تقریباً چار سال تک ہمارے پاس کھیل کا کوئی میدان نہ تھا - اِس وقفے میں ہمارے بعض اہم کھیلوں کو ، جو صرف فرشِ زمین پر کھیلے جاتے ہیں ، بے حد نقصان پہنچا ہے - خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ سال ڈی - اے - وی - کالج کے متروکہ میدانوں میں سے کھیل کا ایک میدان ہمارے قبضے میں آ گیا - یہ میدان بڑی ابتر حالت میں ہے جس کی درستی کے لیے کوشش کی جا رہی ہے - اس سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ یہ میدان گھنی آبادی میں گھرا ہوا ہے ، اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک اس کے گرد ایک پختہ چار دیواری کی تعمیر نہ ہوئی ، محض آٹھ ایکڑ زمین کا حاصل ہو جانا کالج کے لیے کوئی نعمت ثابت نہ ہوگا -

اِس سال کالج کے جمنیزیم کی عمارت تیار ہو کر استعمال کے قابل ہو گئی ہے ، اور ہمارے سپورٹس کے ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر اِس کوشش میں ہیں کہ یہ جمنیزیم عنقریب کام آنے لگے -

خواتین و حضرات ، میں نے جن حالات کا ذکر ابھی کیا اُن کے پیشِ نظر آپ کو ہم سے کھیل کے میدان میں عظیم الشان کارناموں کی توقع نہ ہوگی - ہاکی کے یونیورسٹی فائنل میں ہم پھر ہارے مگر ہمارا فائنل تک پہنچ جانا بجائے خود ایک کرامات ہے جس کی داد ملنی چاہیے - اس کے علاوہ ہاکی میں اِس مرتبہ ہم دس گول کے بجائے صرف دو گول سے ہارے - اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اُمید کا دروازہ ابھی ہم پر بند نہیں ہوا - ہماری فٹ بال ٹیم کی حالت کچھ بہتر تھی - اس کے چار رکن عتیق احمد ، محمد سعید ، طارق باجوہ اور ریاض محمود یونیورسٹی ٹیم کے لیے منتخب ہوئے - کرکٹ کے متعلق ہماری روش یہ ہے کہ ہم سچے مسلمانوں کی طرح اپنے گزشتہ کارناموں

پر ناز کرتے ہیں - فی الحال ہمیں گورنمنٹ کالج سے ایک بار پھر شکست ہوئی مگر واقعہ یہ ہے کہ دلِ ناتواں نے مقابلہ خوب کیا - اِس کے علاوہ وہ صفت جسے انگریز ''سپورٹس مَین شپ'' کہتے ہیں ، اُس کا مظاہرہ نہ صرف ہماری کرکٹ ٹیم کی طرف سے بلکہ اِس سے بھی بڑھ چڑھ کر کالج کے ایک ہزار طلبہ کی طرف سے ، کچھ اِس پیمانے پر ہوا کہ اُنھوں نے ، گورنمنٹ کالج کے پرنسپل صاحب کے بقول ، انٹر کالجیئیٹ مقابلوں میں تہذیب و شائستگی کا ایک نیا معیار قائم کر دیا - اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کا کرکٹ میچ بڑے ہنگامے کا میچ ہوتا ہے اور یار لوگوں کو خیال تھا کہ اب کی کچھ نہ کچھ سر ضرور پھٹیں گے :

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے ، پہ تماشا نہ ہوا

جنابِ صدر ، اِن ناکامیوں کے علاوہ کھیلوں میں کچھ کامیابیاں بھی ہیں جن کا ذکر کر کے میں اپنا اور آپ کا دل خوش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں - باسکٹ بال میں اِس سال یونیورسٹی کی ٹرافی ہمارے ہاتھ رہی - یہ اعزاز سات سال کے وقفے سے نصیب ہوا ، اس لیے سات گنا خوشیاں ساتھ لایا - ہمارے کھلاڑی اسلم یوحنا ، محمد حنیف ، افتخار بھٹی اور طارق باجوہ یونیورسٹی کی باسکٹ بال ٹیم میں شامل کیے گئے - اِسی طرح والی بال کی ٹرافی بھی اس سال ہم نے جیتی اور ہمارے کھلاڑیوں میں سے خالد مسعود اور شوکت علی یونیورسٹی کی والی بال ٹیم میں لیے گئے - کبڈّی کی یونیورسٹی ٹرافی بھی سات سال بعد اِس مرتبہ پھر اسلامیہ کالج کے حصے میں آئی - ہماری ٹیم نے مدّ ِمقابل ٹیم کو دگنے Points سے شکست دی - کشتی رانی کے مقابلوں میں اِس مرتبہ ہم نے کئی کارنامے کیے ، جن میں ٹیم کا صحیح رفیقانہ جذبہ ہمیشہ نمایاں رہا - پہلے ہم نے کشتی رانی کی یونیورسٹی ٹرافی حاصل کی اور پھر مغربی پاکستان کے کشتی رانی کے

مقابلوں میں اوّل آئے ۔ اِن مقابلوں میں محمد یوسف اور محمد ارشد بہترین کشتی ران قرار دیے گئے ۔ ہماری ایتھلیٹکس ٹیم کے چار رکن فرحت حسین ، احمد سلیم اختر ، شریف ملک اور ریاض محمود نہ صرف یونیورسٹی ایتھلیٹکس ٹیم میں لیے گئے بلکہ ریاض محمود یونیورسٹی ایتھلیٹکس کے کپتان بھی مقرر ہوئے ۔

اب میں مختصر طور پر اپنے رفقا کی مصروفیتوں اور متعلقہ کوائف کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔ شعبۂ انگریزی میں سے طلعت محمود صاحب ہمارے ریلوے روڈ والے کالج میں منتقل ہوئے اور وہاں سے عزیز الدین احمد صاحب نے آ کر ان کی جگہ لی ۔ مجاہد اکبر اور انوار الحق صاحبان جو ہماری سب سے پہلی ایم ۔ اے ۔ انگلش کلاس کے کامیاب طلبہ تھے ، عرصے تک شعبۂ انگریزی میں میرے رفیق رہ کر اِس سال معلّمی کے پیشے کو خیرباد کہہ گئے ۔ مجاہد اکبر اب لاہور میں وکالت کر رہے ہیں اور انوار الحق کراچی میں دفتری زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں ۔ شعبۂ انگریزی میں اِن دونوں کی خالی کی ہوئی جگہ ابھی تک پُر نہیں ہو سکی ۔ فل برائیٹ پروفیسر مسٹر جان لیئر برگر نے شعبۂ ریاضی میں سال بھر کام کیا ۔ وہ اپنی یک سالہ خدمت کا زمانہ ختم کر کے آج شام واپس امریکہ روانہ ہو رہے ہیں ۔ ان کی رفاقت کی خوشگوار یاد ہم سب کے دلوں میں دیر تک رہے گی ۔

میرے دوست پروفیسر خواجہ محمد اسلم کو بھی اِس کالج کی کُھلی ہوا راس نہ آئی اور وہ اِس سال جنوری میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے پرنسپل ہو کر ہم سے رخصت ہو گئے ۔ ۱۹۵۸ میں جب کالج تقسیم ہوا ، اور تقسیم سے پیدا شدہ بے شمار ذمہ داریاں مجھ پر اور میرے رفقا پر آ پڑیں ، خواجہ محمد اسلم ایک عرصے تک میرے لیے قوّتِ بازو بنے رہے ۔ لیکن اُن کی معلّمانہ زندگی ریلوے روڈ سے شروع

ہوئی تھی، اور اُسی فضا کی کشش بالآخر غالب آئی:

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بااین ہمہ ہم لوگ اب بھی خواجہ صاحب کو منّت سماجت یا زبردستی کر کے اپنے جلسوں میں بُلا منگواتے ہیں، اور میں خوش ہوں کہ وہ اِس جلسے میں بنفسِ نفیس موجود ہیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اِس کالج کے تمام اساتذہ باہمی اتّفاق و اتّحاد کے عالم میں کام کرتے ہیں۔ عام دستور یہ ہے کہ کسی کالج کی ہر خوبی و خرابی کالج کے پرنسپل کی ذات سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ لیکن اس کالج میں جو بھی نیک و بد آثار آپ کو نظر آتے ہیں اُن کے بنانے اور بگاڑنے والے وہ ساٹھ آدمی ہیں جو سیاہ عباؤں میں ملبوس میرے چپ و راست بیٹھے ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست اور دست و بازو ہیں۔ یہاں کسی شخص کو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا نہ موقع ملا ہے، نہ ضرورت ہی محسوس ہوئی ہے۔ تاہم میں اِس موقع پر اپنے رفقائے عزیز سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شام کے کھانے پر ہمارے ماہوار اجتماع اِس سال کسی قدر لمبے وقفوں سے ہونے لگے ہیں۔ میرے احباب کو یاد رہے کہ محبت کا درخت مسلسل آبیاری چاہتا ہے۔ اور جس طرح مجھے مئی ۱۹۵۸ میں اصرار تھا، اُسی طرح اب بھی ہے کہ اگر کسی جماعت کو متّحد رہنا ہے تو اسے کثرت اور تواتر سے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانا چاہیے۔ کھانے کی میز بے شمار مشکلات کا حل ثابت ہوتی ہے۔

سالِ گزشتہ کی طرح اِس سال بھی ہمارے اساتذہ نے علمی اور تحقیقی کام جاری رکھا۔ پروفیسر غلام صادق نے ''پاکستانی فلسفۂ حیات'' کے عنوان سے پاکستان فلاسفی کانگریس میں ایک مقالہ پڑھا۔ پروفیسر سعادت علی خاں نے ''اصلاحِ معاشرت'' کے موضوع پر ایک

سیمینار میں مقالہ پیش کیا - میاں محمد شمس الدین نے پاکستان ہسٹری کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی پر مقالہ پڑھا - اختر اقبال کمالی صاحب نے "معنیٔ شعر کا مسئلہ" اور "اقبال کا تغزّل" سجاد باقر رضوی صاحب نے "ادب میں شخصیّت کا مسئلہ" اور ارشاد الحسن صاحب نے The Aesthetic Philosophy of Keats کے عنوان سے مقالات پیش کیے - تصنیف و تالیف کے سلسلے میں وحید قریشی اور افتخار احمد صدیقی صاحبان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - صدیقی صاحب نے "توبۃ النصوح" اور "فسانۂ مبتلا" کو مقدمے اور حواشی لکھ کے مرتّب کیا - ڈاکٹر وحید قریشی کی دو کتابیں "مطالعۂ حالی" اور "دربارِ ملّی" شائع ہوئیں - اِس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے "اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" کے لیے پانچ مقالے لکھے - اس سے قطع نظر افتخار احمد صدیقی، سجاد باقر رضوی اور محمد شریف ہلال صاحبان اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر پی ایچ - ڈی کے لیے کام کر رہے ہیں - ڈاکٹر وحید قریشی کو اِس سال پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اردو ادب میں پی ایچ - ڈی - کی ڈگری ملی -

اب آخر میں، جنابِ صدر، مجھے صرف ایک خوش گوار (؟) یا ناخوش گوار (؟) واقعے کا ذکر کرنا ہے، جس کی گونج اس سے بہت پہلے آپ تک بذریعۂ اخبارات پہنچ چکی ہے - ۳۱ جنوری کو کالج کے چند طلبہ نے جن کا شمار ساٹھ ستّر سے ایک سو تک کیا گیا ہے، کالج کی فیسیں کم کرانے کے لیے ہڑتال کی - ان طلبہ کا مقصد بالکل جائز اور ہر لحاظ سے صحیح تھا - ہماری فیسیں واقعی لاہور کے دوسرے سب کالجوں سے زیادہ تھیں اور خود میں نے نومبر ۱۹۶۱ میں ان کو کم کرنے کی تحریک کی تھی - ۳۰ جنوری کو، کہ اِس سے دو ہی دن پہلے اسلامیہ کالج کمیٹی فیسوں کے متعلق میرے اور طلبہ کے نقطۂ نظر سے کامل اتفاق کا

اظہار کر چکی تھی ، کالج یونین کے صدر جو ایم - اے - (عربی) کے طالب علم ہیں ، بیس پچیس طلبہ کو ساتھ لے کر میرے پاس آئے - میں نے فیسوں کی تخفیف کے متعلق کالج کمیٹی کی قرارداد سے اُنھیں آگاہ کر دیا اور وہ بظاہر مطمئن ہو کر چلے گئے -

لیکن حقیقتِ حال وہ نہ تھی جو مجھ پر ظاہر کی گئی - یونین کے صدر نے بی - ایس سی - سالِ دوم کے چند طلبہ کو مشورہ دیا کہ اگر فیس کی تخفیف کی قرار داد پر فی الفور عمل چاہتے ہو تو انجمنِ حمایتِ اسلام کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کرو - چنانچہ چار پانچ طالب علم ۳۰ جنوری کی رات کو کالج ہوسٹل میں ہڑتال کی کھچڑی پکاتے رہے - اُنھوں نے راتوں رات ہاتھ سے اشتہار لکھے اور کالج کی دیواروں پر لگائے - دوسری صبح میں کالج آیا تو پتا چلا کہ بی - ایس سی - سال دوم کے پچاس ساٹھ طالب علم جماعتوں میں نہیں آئے ، گول باغ میں جمع ہیں اور دوسروں کو روک کر اپنی گنتی بڑھانے کی فکر میں ہیں - بعد کی تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ ان میں سے اکثر طلبہ کو اس واقعے سے بے خبر رکھا گیا کہ کالج کمیٹی طلبہ کی خواہشات کے مطابق پرنسپل کی سفارش کو منظور کر چکی ہے - لیکن اُس وقت مجھے یہ تفصیل معلوم نہ تھی - مجھے صرف یہ نظر آیا کہ بی - ایس سی - کے ساٹھ ستّر طلبہ کو یقین ہو گیا ہے کہ پرنسپل ، رات دن اُن کے دکھ درد میں شریک ہونے کے باوجود ، ان کی صحیح دست گیری کرنے کے قابل نہیں رہا اور اب اِن طلبہ نے اپنی فلاح و بہبود کا انتظام خود سنبھال لیا ہے - اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے خیال کیا کہ کالج کی پرنسپلی کے بجائے کوئی اور مفید کام کرنا میرے لیے بہتر ہوگا - میرے اس فیصلے کی اطلاع جب میرے رفقا کو ہوئی تو اُنھوں نے ایک ایسا قدم اُٹھایا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا - آج بھی میرے لیے اُس نافرجام دن

کی سب سے خوش گوار یاد کالج کے تمام اساتذہ کا متّفقہ استعفا ہے جو اُس صبح میرے ہاتھ میں دیا گیا۔ آج کے دن تک جب بھی میں اس خلوص و محبّت کا خیال کرتا ہوں، میرے دل میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

ہڑتالی طلبہ کے حق میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اُن میں اکثر اصل صورتِ حال سے بے خبر تھے اور بعض ایسے تھے کہ محض بھیڑ چال کے ماتحت کالج سے نکل کر شہر کی سڑکوں پر جا پہنچے تھے۔ چنانچہ جب اُنھیں اطلاع پہنچی کہ میں نے اُن کی ہڑتال کو اپنے خلاف عدمِ اعتماد کے اظہار پر محمول کیا ہے تو اُن کا نیک نیّت حصّہ فوراً واپس آ گیا۔ بعض نے میرے پاس آ کر معافی مانگی۔ کالج کے چار سو کے قریب طلبہ نے ایک دستخطی یادداشت کے ذریعے سے اپنے اِس فیصلے کا اظہار کیا کہ اگر موجودہ پرنسپل کالج سے الگ ہوا تو وہ سب کے سب بھی کالج سے ہجرت کریں گے۔ مجھے باقاعدہ تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ ہڑتال کا شاخسانہ صرف پانچ سیاست کار طلبہ نے کھڑا کیا تھا۔ ان پانچ میں سے دو کو میں ان کے اظہارِ افسوس پر معاف کر چکا ہوں، اور باقی تین کے متعلق تادیبی کارروائی تاحال زیرِ غور ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہڑتال کے دن کالج یونین کے صدر سے قطع نظر، یونین کی مجلسِ عاملہ کے ارکان (رانا خالد نواز، اقبال محمود ملک، محمد اکرم، محمد منیر اظہر اور ملک شاہ نواز خاں) کالج اور کالج کے پرنسپل سے اپنی ذاتی وفاداری کا اظہار کرنے کے لیے بلا تاخیر میرے پاس پہنچے تھے، اور یقین ہے کہ کالج کی سلامتی اور استحکام کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی پر آمادہ تھے۔

اِس بظاہر چھوٹے سے واقعے میں ہم سب کے لیے ایک درسِ عبرت موجود ہے۔ یہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی یونینیں علمی اور تعمیری سرگرمیوں کے بجائے کیوں بنے بنائے اداروں کی تخریب کے لیے تیار کی

جا رہی ہیں ؟ کسی کالج یونین کو لیبر یونین بن جانے کا حق مغربی دنیا کے کس دستور کے مطابق دیا جاتا ہے ؟ میں مغربی دنیا کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ ہمارا موجودہ نظام اور اس کے تمام لوازم کا سرچشمہ یورپ اور امریکا کی روایات ہیں ۔ وہاں طلبہ کی یونین خالصتہً ایک علمی مجلس ہوتی ہے جو تقریر اور مباحثے کے ذریعے سے نوجوانوں کو مسائلِ زندگی پر تنقید کا حق دیتی ہے ۔ لیکن ہمارے ترقی پسند اور جمہوریت شناس ملک میں اگر کالج اور یونیورسٹی کے بعض انتظامی محکمے طلبہ کی تربیت کے لیے ان کے حوالے کرنے ضروری ہی ہیں تو یہ محکمے پوری طرح ان کے سپرد ہونے چاہئیں تاکہ دو عملی کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے ، اور کسی تعلیمی ادارے کا صدر ، اور اس کے طلبہ کی یونین ، ایک ہی وقت میں دو مختلف راگنیوں کی الاپ میں مصروف نظر نہ آئیں ۔ یہ بالکل واضح ہے کہ جس حد تک طلبہ کی بنیادی ضروریات اور کالج اور ہوسٹل میں ان کی عزت و آرام کی زندگی کا تعلق ہے ، اربابِ حل و عقد کی اطلاع کے لیے ایک دو یا پانچ دس طالب علم بھی جمع ہو کر بڑی وضاحت سے اپنا مطلب بیان کر سکتے ہیں ۔ لیکن اگر کسی ہجوم کے ذریعے سے اربابِ اختیار پر دباؤ ڈالنا مقصود ہے تو میری قطعی رائے یہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں اس قسم کے طریقِ کار کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے ۔ کچھ عرصے سے یہ فیشن ہو گیا ہے کہ طلبہ کی یونین طلبہ کے سراسر جائز حقوق بھی ہجوم اور جلوس کے دباؤ کے ذریعے سے منوانا پسند کرتی ہے ۔ یہ راستہ انتشار اور بربادی کا راستہ ہے ۔ کسی یونین کو طلبہ اور اساتذہ کی ٹکر کا میدان بنانا نہ طلبہ کے لیے اچھا ہے اور نہ ان تعلیم گاہوں کے لیے جہاں اس قسم کے ہنگامے برپا ہو رہے ہیں ۔ طلبہ کو ہر قسم کے خلفشار میں مبتلا کر کے ہم ان کی تربیت کی طرف سے صرف اپنی غفلت کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت نہ صرف ہمارے اپنے ملک کی سلامتی

بلکہ پورے ایشیا کی آزادی اور استحکام کا معاملہ بڑی حد تک اس مسئلے سے اُلجھا ہوا ہے کہ ہم اپنی تعلیم گاہوں کو اساتذہ و طلبہ کی باہمی آویزش کا اکھاڑا بنائیں گے یا طلبہ کی داد رسی کے لیے کوئی نسبتاً شائستہ حل تلاش کر سکیں گے۔

جناب والا، یہ کالج گزشتہ ستّر برس سے ہماری مشرق روایت اور اسلامی معاشرت کو مغربی علوم اور جدید طرزِ فکر سے ترکیب دینے کے لیے مصروفِ کار رہا ہے۔ ہم دین و دنیا اور عقل و ایمان کو ایک وحدت میں سمونے کے آرزو مند ہیں۔ ہمارے طلبہ غریب گھرانوں اور دور دراز دیہات سے ہمارے پاس آتے ہیں جہاں ہماری پرانی روایات ابھی تک زندہ ہیں اور ایک ہرے بھرے درخت کی طرح نئے افکار کا پیوند قبول کر سکتی ہیں۔ ہمیں نئے تجربوں سے کوئی بیر نہیں ہے، لیکن نئے تجربوں کے لیے ہم اپنے مرکز سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ ہم انگریزی کو اُردو سے اس لیے ملاتے ہیں کہ قوم کی تخلیقی قوّتیں، جنھیں اندھی تقلید نے شل کر دیا ہے، ازسرِ نو بیدار ہوں اور زندگی کی تعمیر میں وہ اہم حصّہ لیں جس کے بغیر ہمارا مستقبل تاریک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کالج کے وہ نوجوان طلبہ جو آج ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں، قوم اور ملک کی زندگی کے لیے باعثِ تقویت ہوں گے۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی کی نصابی اور تعلیمات کی معاشرتی تنظیمِ نو

یہ "دو لخت" مقالہ، جو ایک تعلیمی اور ایک تہذیبی حصّے پر مشتمل ہے، تعلیم الاسلام کالج، ربوہ، کے جلسۂ عطائے اسناد و انعامات، منعقدہ ۳ جون ۱۹۶۲، میں بطورِ خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نظامِ تعلیم میں اساتذہ اونچے منصبوں سے ہٹائے گئے اور سرکاری افسروں کو اُن کی جگہ دی گئی۔

جنابِ پرنسپل صاحب، طلبائے کالج، اور حضرات،

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مجھے اِس کالج میں حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اِس سے پہلے بھی میں آپ کے کالج کی علمی و ادبی تقریبات میں کئی بار شریک ہو چکا ہوں۔ آج صبح یہاں میری موجودگی میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے، کیونکہ مجھے یہاں آ کر اُن عزیزوں کو مبارک باد دینے کا موقع ملا ہے جنھوں نے آپ کے سایۂ عاطفت میں آج اپنی تعلیمی زندگی کی تکمیل کی ہے اور اب سندِ فضیلت پا کر آپ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اِس خاص دن کی اہمیت سے قطع نظر، یہ واقعہ ہے کہ میں جب بھی یہاں آیا ہوں، سچی خوشی کا احساس لے کر آیا ہوں۔ اِس فضا کا امن و سکون، بڑے شہروں کی گہماگہمی اور شور و شغب سے اِس کالج کی علیحدگی، تحصیلِ علم میں آپ کی یک سُوئی اور انہماک، سب اپنی اپنی جگہ ایک کیفیّت رکھتے ہیں۔ یہ کیفیّت تعلیم و تحقیق کے لیے

خاص طور پر سازگار ہے اور میری دلی دعا ہے کہ خدا آپ کو افراتفری کے اُن مرکزوں سے ہمیشہ دُور رکھے جہاں علم کی نہیں، تجارت و سیاست کی گرم بازاری ہے۔

میں خوش ہوں کہ اِس سال بھی تعلیم الاسلام کالج کی ترقی کی رفتار بدستور قائم رہی۔ یہ کالج، دوسری غیر سرکاری درس گاہوں کی طرح، ہمارے قومی نظامِ تعلیم میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ قومی شعور کی تربیت اور تہذیبی روایات کے استحکام کی جو رَو ہمارے غیر سرکاری اداروں میں عرصۂ دراز سے چل رہی ہے، حکومت کی نسبتاً خوش حال درس گاہیں ابھی اُس سے ناآشنا ہیں۔ اِس کے کئی اسباب ہیں۔ غیر سرکاری درس گاہوں میں جاہ و منصب کی طلب پراگندگیٔ طبع کا باعث نہیں ہوتی، یا کم از کم اس حد تک نہیں ہوتی کہ "سینیارٹی" کی شطرنج پر "گریڈ" کا مُہرہ ہر وقت عذابِ جاں بنا رہے۔ یہاں کے اساتذہ تبادلے کے عمل سے جا بجا منتشر نہیں ہوتے، نہ یہاں سرکاری اداروں کی ضابطہ پسند دنیا ذہن کی تعمیری حرکت کے لیے زنجیرِ پا بنتی ہے۔ یہاں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ یہ ادارے صرف اپنی اہلیت اور کارکردگی کے سہارے جیتے ہیں۔ ان کے وجود کا مرکز اپنے آپ سے باہر نہیں ہوتا۔ مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں ہے کہ قومی جماعتوں اور انجمنوں کی قائم کی ہوئی درس گاہیں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود، ہماری اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگا۔

جنابِ والا، آپ نے اپنی روداد میں اس صورتِ حال کا ذکر بھی کیا ہے، جو تعلیمی اصلاحات کے نفاذ کے بعد یونیورسٹی اور کالجوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہے۔ بلاشبہ اصلاح کے اس دور میں یونیورسٹی کے درسی شعبوں کو بھی توسیع و ترقی کا حق پہنچتا ہے، اور اگر یونیورسٹی اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے کالجوں کو صحیح قسم کی

دعوتِ مقابلہ دے تو اس باہمی مقابلے میں خیر و برکت کے کئی پہلو نکلیں گے ۔ لیکن مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے کہ اگر اِس مرحلے پر یونیورسٹی نے یک طرفہ استحکام کو اپنا مقصد بنا لیا تو کالجوں ہی کے لیے نہیں ، بالآخر خود یونیورسٹی کے لیے بھی ، قومی تعلیم کی یہ غیر متوازن کیفیت ضعف اور انتشار کا باعث ہوگی ۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اس موقع پر یونیورسٹی اور کالجوں کے درمیان رقابت کے حدود مقرر کر دیے جائیں ۔ ان حدود سے تجاوز کی صورت میں ہماری تعلیمی زندگی کو بے اندازہ نقصان پہنچے گا ۔

آکسفرڈ اور کیمبرج میں کالج اور یونیورسٹی کے درمیان تقسیمِ کار ، بلکہ تقسیمِ معاش ، جن اصولوں پر طے ہو چکی ہے ، ان کا بجنسہٖ اطلاق پنجاب یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے الحاق رکھنے والے کالجوں پر نہیں ہو سکتا ۔ وجہ یہ ہے کہ آکسفرڈ اور کیمبرج کے حدودِ اربعہ کو پنجاب یونیورسٹی کی جغرافیائی وسعت سے کوئی نسبت نہیں ہے ۔ یہاں تمام ملحقہ کالجوں کے اساتذہ کا یونیورسٹی کے لیکچروں میں حصہ دار ہونا خارج از بحث ہے ، نہ یہ ممکن ہے کہ بلوچستان سے آزاد کشمیر تک کے تمام طلبہ لاہور آ کر پنجاب یونیورسٹی کے حلقۂ درس میں شامل ہوں ۔ ہمارے صوبے میں ، چند بڑے شہروں سے باہر ، کالجوں کے باہمی فاصلے بالکل ایسے ہیں جیسے ممالکِ غیر میں یونیورسٹیوں کے باہمی فاصلے ۔ یوں دیکھیے تو پنجاب یونیورسٹی سے الحاق رکھنے والے کالج ، بالخصوص بیرونِ لاہور کے کالج ، بجائے خود چھوٹی چھوٹی یونیورسٹیوں کے فرائض ادا کر رہے ہیں ۔ ان کالجوں کی ترقی قومی تعلیم کی ترقی اور ان کا زوال قومی تعلیم کا زوال ہے ۔ اِسی سبب سے یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ تعلیمی اصلاحات کے اِس نئے دور میں پنجاب یونیورسٹی اور اِس کے ملحقہ کالجوں کا باہمی رشتہ کیا ہوگا ؟

آپ کو معلوم ہے کہ کئی سال سے یونیورسٹی میں "آنرز سکول اِن کیمسٹری" کے نام سے ایک سہ سالہ نصاب موجود ہے - جو طالب علم اِس سہ سالہ نصاب کی تکمیل کر لیتا ہے ، اُسے ایک سال میں ایم - ایس سی - کرنے کا موقع مل جاتا ہے - بی - ایس سی - آنرز سکول کو ایم - ایس سی - کے ساتھ ٹانکنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آنرز سکول کی جماعت صرف یونیورسٹی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے - یہ مشکل جو پہلے صرف ایک مضمون ، کیمسٹری ، سے مخصوص تھی ، اب ایک مصیبتِ عظمیٰ بن کر تمام مضامین پر چھا گئی ہے - نئے نصاب کے مطابق اردو فارسی سے لے کر باٹنی زوآلوجی تک ہر مضمون کے آنرز کو ایم - اے - /ایم - ایس سی - کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور بی - اے - آنرز کا نصاب قدر و قیمت کے لحاظ سے نصف ایم - اے - کے برابر قرار پایا ہے - اس طریقِ عمل کے نتائجً قدرۃً وہی ہوں گے جو آنرز سکول اِن کیمسٹری کے سلسلے میں پہلے نمودار ہو چکے ہیں - یعنی تمام مضامین میں آنرز کے نصاب کی تدریس یونیورسٹی تک محدود ہو جائے گی - اگر بات یہیں تک رہتی تو کالجوں کا وجود شاید خطرے میں نہ پڑتا - کیمسٹری کے آنرز سکول کا نصاب ایم - ایس سی - کے ساتھ ٹنکا ہوا ہونے کے باوجود بی - ایس سی - پاس کورس کے نصاب سے بالکل علیحدہ تھا - لیکن موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر مضمون میں آنرز کا نیا نصاب ایک طرف ایم - اے - کا جزو بنا دیا گیا ہے اور دوسری طرف بی - اے - پاس کورس کا بھی - چنانچہ اب نہ صرف یہ ہوگا کہ آنرز کی جماعتیں کالجوں سے چھن جائیں گی ، بلکہ اس کے ساتھ ہی آنرز کے طلبہ سے محروم ہونا کالجوں کی پاس کورس کی جماعتوں کو بھی خود بخود متاثر کرے گا اور صرف وہ کم ہمّت طالب علم کالجوں کے حصے میں آئیں گے جو آنرز سے بے نیاز ہوں گے - اس طرح کالجوں میں داخلہ اس قدر کم ہو جائے گا کہ

عجب نہیں بیشتر کالجوں کو اپنا کام جاری رکھنا ناممکن نظر آنے لگے۔
اس مصیبت کا ایک حل یہ ہے کہ آنرز کے نصاب کو ایم۔اے۔ میں شامل نہ کیا جائے۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ جس آنرز کورس کا قلابہ ایم۔اے۔ سے ملا ہوا ہو، اُسے یونیورسٹی کی کششِ ثقل اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ایم۔اے۔ کا نصاب بدستور دو سال پر پھیلا رہے، اور ایم۔اے۔ کی منزل پر سائنس اور آرٹس کے بیشتر مضامین کی تدریس بدستور یونیورسٹی میں ہو۔ انڈرگریجویٹ جماعتوں کی تدریس سے اُلجھنے کے بجائے یونیورسٹی اگر اپنی خصوصی توجہ ریسرچ پر مرکوز کرے تو اس کے کارنامے اپنے صحیح مقام اور منصب سے زیادہ قریب ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ لاہور کے بعض کالجوں کی طرف سے عنقریب مرکزی وزارتِ تعلیم اور اِنٹر یونیورسٹی بورڈ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوگی کہ آنرز اور ایم۔اے۔ کے نصاب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ اس تجویز سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ آنرز کا معیار سابق نصاب کے مقابلے میں بلند نہ کیا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ آنرز کا نصاب ایم۔اے۔ کے نصاب سے قطعاً آزاد رہے۔ اس علیحدگی کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آنرز کی تمام جماعتوں کے لیے یونیورسٹی میں جمع ہو جانے کا جو میلان اِس وقت پیدا ہو گیا ہے، اُس پر ایک بھاری روک لگ جائے گی۔ جو کالج آنرز کی تدریس کے لیے مناسب انتظام کر سکیں گے، اُن کے طلبہ پاس اور آنرز دونوں نصاب اپنے کالجوں کے زیرِ اہتمام پورے کریں گے اور اس طرح کالج اچھے معیار کے طلبہ سے بالکل خالی نہ ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر موجودہ صورتِ حال قائم رہی تو بہت سے کالج بتدریج ناکارہ بلکہ معدوم ہو جائیں گے۔ کالجوں کے بند ہو جانے سے ہمارا قومی نظامِ تعلیم ایک خلفشار میں مبتلا ہو جائے گا اور خود یونیورسٹی کو، بقولِ غالب، اپنی ”جفا سے توبہ“

کرنی پڑے گی - یونیورسٹی کا اپنا بھلا اِس میں ہے کہ وہ کالجوں کو اُس آخری منزل تک دھکیلنے کی کوشش نہ کرے جہاں پہنچ کر اُن کا وجود و عدم برابر ہو جائے - حضرات ، مجھے یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی نے کالجوں کو خدا نخواستہ ہڑپ کر ہی لیا تو اُس کی اپنی صحّت خراب ہو جائے گی اور اُس کے پیٹ میں سخت درد ہوگا -

تعلیمی کاروبار کی تنظیم کا یہ مسئلہ اور اِس نوع کے دوسرے مسائل ابھی ہمارے اُن طلبہ کے لیے دردِ سر کا باعث نہیں بنے جو آج فارغ التحصیل ہو کر زندگی کے نئے میدانوں کی طرف روانہ ہو رہے ہیں - لیکن ، میرے نوجوان دوستو ، ذوقِ تنظیم کی کسک کو سینے سے نہیں لگاؤ گے تو قوم اور وطن کا نام کس طرح چمکاؤ گے ؟ زندہ قومیں دن رات اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگی رہتی ہیں ، اور تعمیری کام کے لیے تعلیم یافتہ آدمی ، اور پھر نوجوان آدمی ، سے بہتر کارکن کہاں ملتا ہے ؟ اِس وقت میں آپ کو آپ کا صرف ایک فرض یاد دلانا چاہتا ہوں ، اور وہ یہ ہے کہ جن اُستادوں نے مدرسے اور کالج میں چودہ سال تک آپ کی تعلیم و تربیت کا حق ادا کیا ، ان کی طرف سے آپ پر بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے - ملک بھر میں یہ پیغام پھیلائیے ، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اِس پیغام کی صداقت کا ثبوت دیجیے کہ اہلِ علم کی عزّت کرنے سے قوم کی اپنی عزّت کا معیار قائم ہوتا ہے - کچھ عرصے سے ہم اپنے اساتذہ کی تکریم سے بے نیاز ہو گئے ہیں - یہی نہیں بلکہ استادوں کو نکمّا اور پھسڈّی کہہ کر اُن کی تذلیل کرنا آج کل فیشن میں داخل ہو گیا ہے - مانا کہ ہمارے اساتذہ اُس عقلی اور اخلاقی کمال کا نمونہ نہیں ہیں جس کی تصویر پرانی حکایتوں میں نظر آتی ہے ، لیکن کیا طلبہ کا احتجاج اور اربابِ حلّ و عقد کی ملامت کا موجودہ انداز معلّم کی عزّتِ نفس ، اطمینانِ خاطر اور کارکردگی کی صلاحیّت میں اضافہ کر رہا ہے ؟ مجھے ڈر ہے کہ بے چینی

اور گھبراہٹ کی یہ فضا درس و تدریس کی دنیا پر بہت برا اثر ڈالے گی۔ یاد رکھیے کہ جو قوم اپنے معلّمین کا ادب نہیں کرتی، علم اُس سے منہ پھیر لیتا ہے اور پھر اُسے جہالت کا غار سامنے منہ کھولے دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے معلّمین ہماری آیندہ نسل کی تربیت کے ضامن ہیں۔ اُن کے احترام میں کمی کرنا آیندہ نسل کے احترام کو تلف کرنا ہے۔

عزیزانِ من، آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ آخر ہم اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کیا کریں؟ میرا جواب یہ ہے کہ معلّمی کے شریفانہ پیشے کا وقار بحال کرنے کے لیے اساتذہ کے طبقے کی موجودہ بے چارگی و بے کسی کو قبول نہ کیجیے بلکہ اگر آپ نے اپنے کسی استاد سے کوئی بھی فیض پایا ہے تو اِس احسان کی جزا کے طور پر، گردوپیش کی بگڑی ہوئی فضا کے باوجود، اساتذہ کے متعلق اپنے خیال، قول اور فعل سے ادب و احترام کے اُسی جذبے کا اظہار کیجیے جس کے ثبوت ہر آزاد اور مہذّب معاشرے میں ملتے ہیں۔ اِن دنوں آپ نے حکومت کے عمّال اور انتظامیہ کے اہل‌کاروں کی زبان سے مدرّسوں کی کاہلی اور بے بصری کی شکایت کئی بار سنی ہوگی۔ بے شک ہمارے اہلِ مدرسہ اپنے موجودہ حالات سے بلند تر اور بہتر نہیں ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ قدیم مدرّس کوئی انسانِ کامل تھا جس کی جوتیاں اٹھانے کی خاطر خلیفۂ بغداد کے بیٹے آپس میں جھگڑ پڑے تھے؟ افسوس، ہماری وہ روایت زندہ نہ رہ سکی جس کے مطابق چند سو برس پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ علم کے ساتھ معلّم بھی قابلِ احترام ہوتا ہے۔ ہمارے اِس تہذیبی انحطاط کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ذہین طلبہ اپنے لیے بالعموم وہ پیشے انتخاب کرتے ہیں جن میں انھیں دوسروں کو مرعوب اور خائف کرنے کا موقع مل سکتا ہو۔ لیکن یاد رکھیے کہ قومیں صرف سول سروس کے افسروں کے سہارے زندہ نہیں رہتیں۔ قوموں کی زندگی کا تعلق تعلیم دینے والوں کی ایک ایسی جماعت سے بھی ہے جو کم تنخواہ

پانے کے باوجود ، بنیادی اہمیت کے فرائض بجا لاتی ہے ، اور خدمت اور محبت کو اپنے لیے سب سے بڑی سعادت سمجھتی ہے ۔ میرے عزیزو ، اگر آپ میں سے بعض نوجوانوں نے معلّمی کی با شرف مگر درویشانہ زندگی اختیار کی تو آپ کو اپنے اساتذہ کی محبت و شفقت کا قرض ادا کرنے کے لیے ایک اور موقع میسر آئے گا ۔ یہ قرض اِس طرح ادا کیجیے کہ معلّم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اِس ملک کے سب سے معزّز افراد کا ہمسر سمجھیے ۔ اپنی خودداری اور اصول کو کسی لالچ اور کسی خوف کی بنا پر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیجیے ۔ اور یہ طے کر لیجیے کہ انسان کی عظمت جاہ و منصب سے نہیں ، ضمیر کی روشنی سے قائم ہوتی ہے ۔ اگر آپ یہ سب کچھ کر سکے تو یقین رکھیے کہ آپ نے نہ صرف وہ فرض ادا کر دیا جو اچھے استادوں نے بطور طالب علم کے آپ پر عائد کیا تھا بلکہ ساتھ ہی آپ نے اُس روایت کو بھی زندہ کرنے کی کوشش کی جس پر عالمِ اسلام چودہ صدیوں سے ناز کرتا رہا ہے ۔

وہ روایت کیا ہے؟ وہ روایت یہ ہے کہ اسلامی تمدّن کے کسی دَور میں حکومت کی شان علم کی شان سے اونچی نہیں رہی :

> ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں گئے ۔ (غور کیجیے کہ خلیفۂ وقت اور شہزادے ایک عالم کے دربار میں خود حاضر ہوئے!) ۔ خلیفہ نے امام مالک سے حدیث سنانے کی فرمائش کی ۔ امامِ ممدوح نے فرمایا کہ میں نے عرصے سے طریقۂ قراءت چھوڑ دیا ہے ۔ اب اور لوگ حدیث مجھ کو سناتے ہیں اور میں سنتا ہوں ۔ ہارون الرشید نے کہا کہ بہتر ہے ، میں ہی سناؤں گا ۔ مگر اوّل عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے باہر کر دیجیے ۔ امام مالک

نے جواب میں ارشاد کیا کہ اگر خواص کی خاطر سے
عوام محروم کیے جائیں گے تو خواص کو بھی نفع
نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر اپنے ایک شاگرد ابن عیسیٰ
کو حکم دیا کہ سبق شروع کریں۔ چنانچہ ابن عیسیٰ
نے فوراً سبق شروع کر دیا اور خلیفہ کو خاموش
رہنا پڑا۔[۱]

ایک اور واقعہ سنیے۔ سلاطینِ روم کی جبّاری و قہّاری کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں۔ لیکن پاکستانی مدرّسین کی ذلّت و مسکنت کے اِس دَور میں آپ کے لیے یہ امر موجبِ حیرت ہوگا کہ یہ دوسرا واقعہ جو میں سنا رہا ہوں سلطنتِ روم کے ایک فرماں روا سے تعلّق رکھتا ہے:

مولانا ابنِ خطیب ایک روز عید کی مبارک باد دینے
ایوانِ سلطانی کو گئے۔ اُن دنوں وہ خزانۂ سلطنت
کے وظیفہ خوار بھی تھے اور سو درہم یومیہ ان کو
ملتے تھے۔ جب دربار کو چلے تو چند طلبہ ہم رکاب
تھے۔ حضورِ سلطانی میں پہنچے تو سلطان نے از راہِ
حسنِ اخلاق سات قدم بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا
نے بجائے جھک کر آداب بجا لانے کے سلام کیا
اور بجائے دست بوسی کے مصافحہ۔ ان کے ایک
شاگرد کو استاد کا یہ خلافِ آداب برتاؤ ناگوار گزرا
اور واپسی میں اس نے کہا کہ آخر سلطان فرماں روائے
وقت ہیں، کچھ تو آپ کو جھکنا تھا۔ ابن خطیب
نے فرمایا کہ آیا یہ فخر سلطان کے لیے کم ہے کہ

۱۔ علمائے سلف، ص ۶۴۔

ابنِ خطیب سا فاضل ان کے پاس گیا؟ اور میں خوب
جانتا ہوں کہ سلطان اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔[1]

علما کا یہ احترام محض علمِ دین کے احترام کی خاطر نہ تھا۔ علومِ دنیوی اور غیر مسلم علما کی قدر و منزلت میں بھی ہمارے قدیم حکمران ذرہ بھر کوتاہی نہ کرتے تھے۔ جہانگیر، جسے تاریخ نے عیش پرستی اور مے گساری کے لیے بدنام کر رکھا ہے، تمام علوم و فنون کے ماہرین کا عقیدت مند تھا۔ اس عہد کے ایک ہندو عالم جد روپ سنیاسی کے متعلق مذکور ہے کہ شہنشاہ کئی بار خود اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور گھنٹوں اس کی صحبت میں بیٹھ کر کسبِ فیض کرتا رہا۔ جد روپ ایک پہاڑ کی کھوہ میں رہتا تھا۔ جہانگیر تین میل پیادہ پا چل کر وہاں پہنچا۔ ''تزک'' میں اس سنیاسی سے ملاقات کا حال اپنے قلم سے یوں لکھتا ہے:

ویدانت کے علم میں، کہ علمِ تصوّف ہی ہے، اس
شخص نے بہت ریاضت کی تھی۔ چھ گھڑی تک اس
کے ساتھ لطفِ صحبت رہا۔ اس کی باتیں ایسی اچھی
تھیں کہ میرے دل پر بہت اثر ہوا۔

میرے نوجوان عزیزو، یہ سب کہانیاں نہیں ہیں، زندگی کے واقعات ہیں۔ اب بھی مہذّب قومیں زندگی میں اہلِ علم کو وہی مقام دیتی ہیں جو کبھی ہم دیا کرتے تھے۔ اب بھی جرمنی کا چانسلر اپنے نام سے پہلے لفظ ''پروفیسر'' لکھ کر عار محسوس نہیں کرتا۔ اب بھی امریکہ کی اقتصادی حکمتِ عملی، مالیات اور دوسرے اہم امور کا فیصلہ اہلِ مدرسہ کے مشورے سے ہوتا ہے۔ اب بھی ایران میں اربابِ علم و فضل کا معاشرتی مقام ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اس

۱۔ علمائے سلف، ص ۶۶ - ۶۷۔

طرز کے دوسرے سرکاری کارندوں سے اونچا سمجھا جاتا ہے -

مجھے سی - ایس - پی - اور دوسرے سرکاری عہدہ داروں کی ضرورت و اہمیت سے انکار ہرگز نہیں ہے - لیکن شکایت یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی نے اربابِ علم و فضل کو سول سروس کا دست نگر بنا دیا ہے - اہلِ مدرسہ کو اگر مال و دولت سے محروم کرنا ہی تھا تو اس کے ساتھ کم از کم وہ اعزاز و احترام ضبط نہ کیا ہوتا جو صدہا برس سے استاد کا بنیادی حق قرار پا چکا تھا - ہماری قومی روایات معلّمین کی توہین و تذلیل کی روایات نہیں ہیں - غزالی و رازی اور دوسرے علمائے سلف کی جو تکریم اسلامی سوسائٹی میں قائم تھی ، اس کے ذکر پر شاید مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ غزالی و رازی کے مثیل اب کہاں ہیں ؟ میں جواباً یہ گزارش کروں گا کہ عقلی و علمی زندگی کا معاشرتی رتبہ بلند کیجیے تا کہ مدرسے کی دنیا میں غزالی و رازی کا ظہور ہو سکے - آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں آج بھی ایک گم نام استاد اپنے فرض کو بجا لاتا ہوا آگ کے شعلوں کی لپک سے اُلجھا اور جل مرا - یقین رکھیے کہ آج بھی کسی کنجِ عزلت میں بیٹھا ہوا کوئی خاموش میر حسن کسی نئے اقبال کی تربیت میں مصروف ہے - اس یقین کو دل میں لیے ہوئے میں آپ سے اور قوم کے سوادِ اعظم سے التجا کرتا ہوں کہ معلّمین کے احترام کی روایت کو از سرِ نو زندہ کیجیے - ملک میں قابلِ عزت اساتذہ کی ایک باقاعدہ جماعت پیدا کیجیے تا کہ ہماری آئندہ نسلیں زندہ رہ سکیں - ہمارے معلّموں کو ذلیل کرنے والے ، حالی مرحوم کا یہ شعر نہ بھولیں :

نہ عیشِ کیخسروی رہے گا ، نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی ، اے منعمو ، تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

عزیزانِ من ! آپ یہ گمان نہ کیجیے کہ اپنے ہم مشربوں کی حمایت کے جوش میں مجھے اپنی اور اُن کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا احساس

نہیں رہا ۔ لیکن وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ، جس کا طعنہ ہمیں دیا جاتا ہے ، اصلاحِ حال کی تدبیر یہ تو نہیں ہے کہ تعلیمی دنیا کے بت ایسے تشدّد سے توڑے جائیں جس سے بہتر حالات کا تصوّر ہی ملیامیٹ ہو جائے اور تعمیرِ نو کی امید ہر قدم پر مجروح ہوتی ہوئی نظر آئے ۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک ہم بہتر اساتذہ کے ظہور کے لیے ملک کی فضا کو سازگار نہ بنائیں گے ، قوم میں بہتر اساتذہ کا ظہور نہ ہوگا ۔ اے عزیزو ! قوم کی نئی زندگی کی سب امیدیں اب آپ سے وابستہ ہیں ۔ اپنے دل میں علم کی عزت اور علم پڑھانے والوں کی عزّت لے کر دنیا میں قدم رکھیے تاکہ دنیا آپ کی اور آپ کے وطن کی عزّت کر سکے ۔

☆ ☆ ☆

ہمارا تہذیبی پس منظر

اور

زمانۂ حال کی لسانی چپقلش

یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے جلسۂ یومِ تاسیس منعقدہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۲ میں بطورِ خطبۂ صدارت پڑھا گیا۔

جناب پرنسپل صاحب، خواتین و حضرات،

میرے لیے یہ بڑا اعزاز ہے کہ مجھے اورینٹل کالج کے جشنِ تاسیس اور اربابِ علم و دانش کے اِس منتخب اجتماع میں شرکت کا موقع عطا فرمایا گیا۔ ایک سو برس ہوئے ہماری قومی تہذیب کے یورپی ہمدردوں نے، جو ہمارے تہذیبی و تعلیمی مسائل کو مغرب کی عینک سے دیکھتے تھے، اِس کالج کے لیے ''مشرقی کالج'' کا نام تجویز کیا تھا۔ اُس دور کے لیے یہ نام بہت موزوں تھا، لیکن آج میں اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو اِس کے اندر مجھے نہ تو سمت کی وہ مخصوص تمیز ملتی ہے، اور نہ اپنے اجتماعی شعور سے قطعی علٰیحدگی کا وہ احساس، جس کے ماتحت سرزمینِ یورپ صحیح مقامِ نظر قرار پاتی ہے، اور اس مقام سے عرب و عجم اور پاکستان و چین بجا طور پر بلادِ مشرق کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں۔ یقین مانیے میں خود اپنا غیر بننے کی کتنی ہی کوشش کروں، میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ انگریز یا امریکی بن جاؤں اور خود اپنے آپ کو ''اورینٹل'' سمجھنے لگوں۔ یہ قومی

دارالعلوم ہماری تہذیب کی تربیت گاہ اور ہماری علمی روایت کا گہوارہ ہے - اس کالج کو دورِ آخر کے اُن صاحب کمال بزرگوں سے نسبت حاصل رہی ہے جو آسمانِ علم و ادب کے ستارے تھے - یہ اُن بزرگوں کی بخشی ہوئی روشنی کی کرامت ہے کہ ہماری یہ لمبی اندھیری رات، رات نہیں رہی اور ہمیں اپنے ہزار سالہ ماضی سے اپنا تعلّق برقرار نظر آتا ہے - جنابِ والا، آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ کو ایسی درخشاں روایت میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہے - میرے نزدیک آپ کا جذبۂ حبِّ قوم اور علمی بصیرت دونوں اس بات کے ضامن ہیں کہ جس بلند مقصد کی تکمیل کے لیے اِس کالج کا قیام عمل میں آیا تھا، اُس کے ساتھ ہمارا رابطہ نہ صرف اُستوار رہے گا بلکہ اِس رابطے میں نئی قوّت اور نئی وسعت جلوہ گر ہوگی - اِس مقصدِ عزیز کی حفاظت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو قوم کی نگاہیں سب سے پہلے آپ کی طرف اور اِس کالج کی طرف اُٹھتی ہیں، کیونکہ وہ علوم و ادبیات جن پر صدہا برس تک ہماری قومی ہستی کی بنیاد قائم رہی، اب بھی اِس چار دیواری کے اندر زندگی سے لَو لگائے ہوئے ہیں - بے شک آندھیاں چلتی رہی ہیں، اور چل رہی ہیں، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ ہماری قومی تہذیب کا چراغ اِن ناسازگار حالات میں بھی فروزاں رہے گا -

جنابِ والا، آپ نے اورینٹل کالج میں مغربی زبانوں کے اُس نفوذ پر جو گزشتہ چند سال سے عمل میں آ رہا ہے، کچھ اندیشوں کا اظہار کیا ہے - اگر ہم واقعی نئی داخلِ نصاب مغربی زبانوں کا روئے انور دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئے کہ ہمیں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا تو یہ بڑی افسوس ناک بلکہ ہلاکت انگیز صورتِ حال ہوگی - لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہماری قومیّت کی بنیادیں بدستور قائم رہیں تو اِن نوواردوں سے ملاقات کسی تشویش کا باعث ہونے کے بجائے باعثِ انشراحِ خاطر بلکہ باعثِ تقویتِ قلب و بدن ثابت ہو سکتی

ہے - میری رائے میں عربی ، فارسی اور اُردو میں تازہ کار عناصر کا داخلہ اُن کے احیا و استحکام کا باعث ہوگا - اگر آپ اِن بیرونی اثرات کو اپنی زبانوں ، بالخصوص اُردو ، میں جذب کر سکیں تو اوریئنٹل کالج میں اِن غیر ملکیوں کی آمد بہت با برکت ثابت ہوگی ، اور مجھے ذاتی طور پر یہ عمل قرینِ قیاس بھی معلوم ہوتا ہے - اُردو فارسی کے طلبہ کو جرمن اور فرانسیسی کی محفل میں بیٹھنے دیجیے تا کہ اُن کے ذہنوں کی تُرکتاز نئے میدانوں سے آشنا ہو اور وہ نئی فتوحات سے قومی زبان کو مالامال کریں - نیّت میں راستی ہو تو غیر سے ملنا ، اور اُس کے سرمایۂ معرفت کو اپنے علوم میں شامل کر لینا ، کیا مشکل ہے - میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اُس پختہ کار عاشق کے بتائے ہوئے گُر پر عمل کیجیے جس نے فرمایا ہے :

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

خواتین و حضرات ، یہ محض شاعری نہیں ، حقیقت کا بیان ہے کہ علوم اور تہذیبیں اگر اپنے گرد و پیش کی مفید تحریکات پر حاوی ہونے کی کوشش نہ کریں تو امتدادِ زمانہ سے بے مایہ اور بے کار بلکہ بے جان ہو جاتی ہیں - یورپ کی تحریکِ احیاے علوم کے دَورِ آخر سے لے کر اُنیسویں صدی کے وسط تک مسلمانوں نے یورپی علوم و فنون کے ظہور کو عالم گیر پیمانے پر جس طرح نظر انداز کیا اور اُن سے اپنی علاحدگی پر جس طرح مُصر رہے ، وہ ہماری تہذیبی تاریخ کا سب سے بڑا المیّہ ہے - مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے تمدّن نے جدید علوم کو وقت پر بتدریج جذب کر کے جزوِ بدن بنا لیا ہوتا تو ہم اُس علمی و تہذیبی خلفشار میں مبتلا نہ ہوئے ہوتے جو موجودہ دَور میں ہمارے لیے زندگی کا عظیم ترین مسئلہ بن گیا ہے - سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ، جب ہم اپنے تمدّن کی قدامت اور تہذیب کی

پختگی پر نازاں تھے ، یورپ نے سائنس کے اکتشافات اور قوموں کی جمہوری شیرازہ بندی کے بل پر مشینی آلات کی مدد سے ایک ایسا نظامِ معیشت وضع کیا جس کی قاہرانہ قوّتِ تسخیر کے سامنے پہلے ہمارے تمدّن کے ہزار سالہ ایوان اور پھر ہمارے عقائد و اعمال کے مضبوط قلعے پاش پاش ہونے لگے - یورپی تمدّن زندگی کے ہر شعبے پر اِس طرح محیط ہونے لگا کہ ہماری اپنی قاعدہ دانی اور وضع داری اور حفظِ مراتب کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہی - صنعتی انقلاب کا لایا ہوا تمدّن محض آنکھیں بند کر لینے سے کالعدم نہ ہو سکتا تھا - اور جب ہم نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ انسان کی زندگی ایک ایسی منزل میں داخل ہو رہی ہے جسے ہم نہیں پہچانتے - موٹرکار ، ہوائی جہاز ، ٹیلیفون اور ریڈیو کے دور میں پالکی کی سواری ، چاندنی کی نشست اور ڈھولک کی تھاپ عہدِ دقیانوس کی نشانیاں نہ بھی معلوم ہوتیں تب بھی مشینی تمدّن کے پیدا کردہ لوازمِ حیات سے بے نیاز رہنا عملاً ناممکن تھا -

یہ ظاہر ہے کہ ہر تہذیب بڑی حد تک ایک باطنی ضابطۂ اقدار سے عبارت ہوتی ہے ، اور اپنی بقا اور فروغ کے لیے خارجی دنیا میں لازماً ایک ایسے تمدّن کا ظہور چاہتی ہے جو اُس کے اپنے مزاج کے مطابق ہو - یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں ہند اسلامی تہذیب کی روایات ایک طرف ، اور فرنگی تمدّن کے طور طریقے دوسری طرف ، دو اَن مِل بے جوڑ حقیقتوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئے ، اور اِن کو باہم ترکیب دینے کی کوئی صورت نظر نہ آئی - سچ پوچھیے تو گزشتہ صدی میں یورپ کا مشینی تمدّن ہماری قومی تہذیب پر ایک مصیبت بن کر نازل ہوا کیونکہ جس فضا میں اِس تہذیب کی زندگی اور کارفرمائی ممکن تھی ، وہ یک بیک معدوم ہو گئی - اِس ابتلاے عظیم سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت ممکن تھی کہ ہمارا تمدّن صدیوں پہلے سائنسی اور مشینی تمدّن کے تدریجی تغیّرات

کے ساتھ ساتھ ڈھلنا شروع ہو جاتا تا کہ ہمارا تہذیبی نصب العین ہمارے تمدنی انقلاب کی قدم بہ قدم رہنمائی کرتا ہوا ہمیں ذہنی کشمکش اور اندرونی خلفشار سے بڑی حد تک بچا کر آگے لے آتا۔ میری رائے میں یہ صورت ملتِ اسلامیہ کے لیے بالکل قابلِ عمل تھی کیونکہ ہمارے دینی عقائد بنیادی طور پر مطابقِ فطرت یا مطابقِ عقل تھے، اور اگر یورپ اپنے قرونِ وسطیٰ کے توہمات سے نکل کر اپنے تمدن کو سائنسی بنیادوں پر استوار کر سکا ہے تو ہمارے لیے یہ طریقِ کار بدرجۂ اولیٰ ممکن تھا۔ ہمارے لیے لباس، بود و ماند، کلام و طعام؛ دین داری و پرہیزگاری، عیش و عشرت، شادی بیاہ، مرگ و ولادت، تعلیم و تربیت، غرض زندگی کے ہر شعبے میں تہذیبی تصوّر اور تمدنی عمل کے درمیان بتدریج ہم آہنگی پیدا کر لینا نسبتاً آسان تھا۔ اس صورتِ حالات کے برعکس جب یورپی تمدن زلزلہ بن کر ہمارے سر پر ٹوٹا تو قدرتاً ایک ہنگامۂ گیر و دار برپا ہوا جس نے ہمارے معاشرے میں طرح طرح کی ذہنی پیچیدگیوں، بغاوتوں اور وسوسوں کو راہ دی۔ ان ایک ہزار ایک بلاؤں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ ہم موجودہ عہد میں کسی بھی علمی، تعلیمی، معاشرتی یا سیاسی فساد کا خیال کریں، اُس کی جڑ ہماری قومی تہذیب اور ہمارے اختیار کیے ہوئے یورپی تمدن کے باہمی افتراق تک پہنچی ہوئی معلوم ہوگی۔ اس ذکر کے بعد آپ کو اس قسم کے واقعات پر تعجب نہ ہوگا کہ پتلون کی شکن کے خراب ہو جانے کے اندیشے نے کسی خوش پوش مردِ مسلمان کو آرام کی نشست، بلکہ نماز کے ایک سجدے، سے بھی محروم رکھا . . . بزرگی و خُردی کے درمیان نئی جمہوریت کو کوئی پردہ حائل نظر نہ آیا . . . اور ماسٹر صاحب نے پس از سبق شاگرد کو بِل پیش کر دیا۔

خواتین و حضرات، میں نے آپ کی خدمت میں اپنی قوم کی

عمرانی تاریخ کا خلاصہ ایک حکایت کے انداز میں پیش کیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جس تاریخی حقیقت کو میں نے بیان کرنا چاہا ہے اُسے درست باور کرنے میں آپ کو تامّل نہ ہوگا۔ ہماری پرانی تہذیب اور ہمارے نئے تمدّن کی دوئی نے احترامِ روایات کے متعلق ہمارے تمام تصوّرات، نیز ہماری موجودہ تعلیم اور ہمارے عقائد و اخلاق کے باہمی تعلّق، اور اس کے ساتھ طلبہ اور معلّمین کے روابط میں ایسی ہل چل پیدا کر دی ہے کہ جو تھوڑا بہت امن و سکون ہماری زندگی کو میسّر ہے، اُسے بھی ایک معجزہ قرار دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ اس موقع پر آپ قدرةً یہ سوال کریں گے کہ کیا اس پرانے مرض کا کوئی شافی علاج ممکن بھی ہے؟ وقت کا پہیا اُلٹا نہیں گھوم سکتا، نہ تاریخ اپنے کسی باب کو دہراتی ہے۔ لیکن میری رائے میں اب بھی ہم اپنی قوم کے اِس درد کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکتے ہیں۔ اِس کی ایک تدبیر وہ ہے جس کی طرف، جناب والا، آپ اپنے بلیغ خطبے میں اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اورینٹل کالج دو تعلیمی عقیدوں کی بنیاد پر قائم ہوا: پہلا یہ کہ قوم کے پرانے علوم کو نئی زندگی سے روشناس کرانا ضروری ہے، اور دوسرا یہ کہ نئے علوم اردو کے قالب میں ڈھال کر طلبہ کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ یہ دونوں عمل، جن کا ذکر آپ نے کیا، دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہی وہ طریقِ کار ہے جسے اختیار کر کے ہم مغربی تمدّن کے شدّاد کو مشرّف بہ اسلام کر سکتے ہیں۔ یہ تمدّن سو ڈیڑھ سو برس سے ایک پرائی بلا کی طرح ہمارے سر پر معلّق ہے۔ جب تک یہ ہمارے عقائد و افکار کے حدود سے باہر ہمارا محاصرہ کیے پڑا ہے، اُس وقت تک، اِسے ایک قضائے مُبرم قرار دینا چاہیے۔ لیکن اگر ہم اِس نہ ٹلنے والے حملہ آور کو اپنے قبیلے میں شامل، بلکہ جذب، کر لیں تو وہ خطرہ جس سے ہم مضطرب

ہیں، خود بخود ٹل جاتا ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ مغربی علوم کے مطالب کو قومی زبان میں ادا کیجیے۔ یہ نسخہ ایک نہیں، سو بیماریوں کا علاج ہے۔ تعلیم اور اخلاق اور اصلاحِ معاشرت کے بہت سے عقدے اسی طرح حل ہوں گے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک ہم انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنائے رکھیں گے، یورپی انسان کے پیدا کیے ہوئے بہترین افکار غیر کی دی ہوئی خیرات کی طرح ہماری ہتھیلی پر پڑے رہیں گے، لیکن یہی مضامین اُردو میں گھول کر ہمیں پلائیے تو یہ ہمارا جزوِ بدن بن جائیں گے۔ اِس صورت میں ہم انھیں عربی و فارسی کی قدیم روایت کے پس منظر میں دیکھیں گے اور ان سے مرعوب و مغلوب ہو جانے کے بجائے ان پر اپنا ذہنی تسلّط قائم کر سکیں گے۔ یقین مانیے کہ عالمِ افکار میں غلبے کا یہ احساس ازسرِ نو وہ توازن قائم کر لے گا جسے بے حسی اور خیرات خوری اور اغیار کی نقّالی نے عرصۂ دراز سے برہم کر رکھا ہے۔

خواتین و حضرات! میرے انگریز اور امریکی احباب بعض دفعہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ انگریزی زبان و ادب کا معلّم ہوتے ہوئے میں کیوں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے منصب سے ہٹانے کے حق میں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں انگریزی زبان و ادب کی وفاداری میں اپنے انگریز دوستوں سے بھی کچھ آگے ہوں۔ میرے دوست فقط اتنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں چند انگریزی داں پیدا ہو سکیں۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہم سب انگریزی داں نہیں، انگریز بن جائیں، مگر مکالے کے ساختہ پرداختہ مصنوعی انگریز نہیں، بلکہ وہ سچے انگریز جو اپنے دین و وطن پر جان دیں، عزتِ نفس کے نگہبان ہوں اور انسانی مساوات کے قدردان؛ علم کی راہ میں کڑیاں جھیلنے کو دن رات مستعد رہیں، منطقی صحّتِ بیان اور لفظوں کے محتاط استعمال میں یگانۂ روزگار ہوں، لیکن جہاں قومی روایت سے عشق کا

سوال پیدا ہو وہاں منطق کو بالائے طاق رکھ دیں - اب آپ ہی فرمائیے کہ انگریزی کا سچا خیرخواہ میں ہوں یا میرے وہ انگریز اور امریکی احباب جو صرف انگریزی زبان کا چھلکا میری قوم کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں - مجھے یقینِ واثق ہے کہ جب تک انگریزی زبان و ادب کی روح ہماری قومی زبان میں منتقل نہ ہوگی ، انگریزی کے افکار و جذبات کا صحیح فیضان ہماری قوم کے سوادِ اعظم تک نہ پہنچے گا -

جنابِ والا ، آپ نے اپنے تمہیدی خطبے میں ضمناً یہ بھی کہا کہ "علومِ مفیدہ کو اردو میں منتقل کرنے کی تحریک ہماری یونیورسٹی میں بالکل ضعیف ہو گئی ہے -" میں یونیورسٹی کی کم کوشی و سُست کاری کی شکایت کرنے کی حد تک آپ کا ہم نوا ہوں ، لیکن مجھے یہ دعویٰ قبول کرنے میں تامّل ہے کہ اردو کی تحریک اس یونیورسٹی میں بے جان ہو گئی ہے - خود آپ ہی کے کالج میں اردو اکیڈمی ایک عرصے سے بہت مفید کام کر رہی ہے - حال میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے یونیورسٹی نے ایک ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا ہے جو عنقریب وسیع پیمانے پر درسی کتابوں کی تالیف شروع کرے گا - یہ ادارہ اپنے مقصد اور نوعیّتِ کار کے لحاظ سے دراصل اورینٹل کالج کا ایک شعبہ ہونا چاہیے - جوں ہی اس ادارے کو یونیورسٹی سے مُلحق کوئی موزوں جگہ ملتی ہے ، میں اِس کے موجودہ ناظم کی حیثیت سے تحریک کروں گا کہ ادارۂ تالیف و ترجمہ کا نظم و نسق اورینٹل کالج کے حوالے کر دیا جائے [1] - اس طرح یہ کالج اپنے تعلیمی و تدریسی کام کے علاوہ اپنے اُس تخلیقی نصب العین سے

۱- یونیورسٹی کا ادارۂ تالیف و ترجمہ راقم الحروف کی تحریک پر ۱۹۶۲ کے اوائل میں قائم ہؤا اور سنڈیکیٹ نے مجھے اس ادارے کا کنوینر مقرّر کیا - شروع میں ادارے کے دفتر کے لیے اسلامیہ کالج نے جگہ دی مگر ستمبر ۱۹۶۳ سے یہ یونیورسٹی کے سلسلۂ عمارات میں منتقل ہو گیا -

بھی سیر حاصل طور پر وابستہ رہے گا جس کے ماتحت علومِ جدیدہ کو اُردو میں منتقل کرنا اِس کے فرائض میں داخل ہے۔

جنابِ والا، خواتین و حضرات، اب آپ کی اجازت سے میں ایک اور مسئلے کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہوں، جس کا حُلیہ بعض انتشار پسند عناصر نے اِس طرح بگاڑا ہے کہ اِسے خواہ مخواہ ایک ناخوش گوار مگر بے معنی اور مضحکہ خیز صورت مل گئی ہے۔ یہ مسئلہ علاقائی زبانوں، اور بالخصوص پنجابی، کی "ترقی" کا مسئلہ ہے۔ اُردو اور علاقائی زبانوں کے درمیان گہرا اور قریبی تعلّق ہے۔ پاکستانی ثقافت کو متنوّع اور جان دار بنانے میں اِن زبانوں کا حصہ بڑا اہم ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اِن کا فکری اور لغوی سرمایہ قومی زندگی اور قومی زبان کی قوّت میں گراں قدر اضافے کا باعث ہوگا۔ جہاں تک پنجابی کا تعلّق ہے یہ اُردو کی حقیقی بہن ہے۔ اور اِس کی "ترقی" میں اُردو کی "ترقی" کے کئی پہلو مضمر ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت پنجابی کو کس قسم کے مسائل درپیش ہیں؟ مغربی پاکستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ پنجابی بولتا ہے اور پنجابی کی تنومند اور محاکاتی ترکیبوں سے مناسب موقعوں پر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اہلِ لاہور کی علمی زبانیں انگریزی اور اُردو ہیں لیکن جب کوئی نفسیاتی لمحہ وارد ہوتا ہے تو اہلِ لاہور پنجابی کی "صوتی صلابت" کا سہارا لینے میں تکلّف محسوس نہیں کرتے۔ لاہور میں برسوں سے سرکاری امداد کی بنا پر ایک پنجابی ادبی اکیڈمی قائم ہے جو بہت سی مطبوعات قابلِ تعریف سلیقے اور اہتمام سے شائع کر چکی ہے۔ پنجابی کی متعدّد ادبی مجلسیں الگ سرگرمِ عمل ہیں اور بعض اہلِ زبان اپنی شوقیہ تحریروں سے پنجابی شعر و ادب میں مفید اضافہ کر رہے ہیں۔ توقع یہ ہے کہ جوں ہی پنجابی کے اہلِ قلم اصنافِ نثر میں معتدبہ ذخیرہ فراہم کر لیں گے، پنجابی بطور ایک ادبی مضمون کے ہمارے نظامِ تعلیم میں دخیل ہو جائے گی۔ حال ہی

میں بُلھے شاہ کی کافیاں یونیسکو کی نظر میں آئیں اور بین الاقوامی سطح پر ترجمے کے لیے منتخب ہوئیں - یہ تمام حالات بظاہر اطمینان بخش معلوم ہوتے ہیں لیکن گزشتہ چار مہینے سے خدا جانے کن اسباب کی بنا پر بعض گوشوں سے واویلا کی پکار اِس طرح بلند ہوئی ہے جیسے کسی نے یکایک پنجابی کا ٹینٹوا دبوچ لیا ہے - اگر اس شور کو ذرا غور سے سنیے تو اس میں ایک خاص سُر بار بار نمایاں ہو کر اصرار کر رہا ہے کہ :

(الف) مغربی پاکستان کی قومی زبانیں پنجابی ، سندھی اور پشتو ہیں - اُردو ایک غیر ملکی زبان ہے -

(ب) بُلھے شاہ ، شاہ لطیف اور رحمان بابا کو اُن کی اصل زبان میں پڑھو - یہی قومی وحدت کا راز ہے -

(ج) مختلف علاقے ہم دل ہو جائیں تو ایک زبان کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی -

یہ سب انکشافات اپنی جگہ بھی کچھ کم دل چسپ نہ تھے ، مگر پچھلے دنوں ایک سیاسی بزرجمہر نے لاہور میں یومِ شاہ لطیف کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے اِس عام اصول کا اعلان فرما دیا کہ ایک زبان کا خیال ''احمقانہ خیال'' ہے - ان اقوال کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں رہتا کہ جو لوگ یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ ''پنجابی خطرے میں ہے'' اُن کی اصل غرض و غایت کیا ہے - ان صاحبوں کو یہ واضح رہے کہ اُردو اگر اُن کی نعرہ بازی سے ملیا میٹ بھی ہو جائے تو بھی پنجابی کو مغربی پاکستان کی قومی زبان بننے کے لیے پشتو اور سندھی جیسے سخت جان حریفوں کا سامنا ہوگا - یہ بھی بالکل واضح ہے کہ علاقائی زبانوں میں گھمسان کا رن ڈالے بغیر کسی نئے لسانی تفوّق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا -

جن نامعلوم وجوہ کی بنا پر پنجابی زبان کی حفاظت کے لیے ہوا

میں ٹلواریں چلائی جا رہی ہیں ، اُن کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے پنجابی کے علاقے کی لسانی صورتِ حال کا جائزہ لیجیے - یہاں ہر وقت تین زبانوں کو نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے - تعلیمی اور سرکاری زبان ایک قسم کی مسخ شدہ ، یا نیم مسخ شدہ ، انگریزی ہے - اخباری اور ادبی زبان اُردو ہے - میل جول اور کاروبار کی زبان وسیع پیمانے پر پنجابی ہے - اس صورتِ حال کو برہم کرنے کے لیے جو کوششیں شروع کی گئی ہیں ، اُن کے مقصد دو ہی ہو سکتے ہیں - ایک یہ کہ پنجابی کو انگریزی کی جگہ دے کر تعلیمی اور سرکاری زبان بنایا جائے - دوسرے یہ کہ اُردو کو اس کے موجودہ عوامی منصب سے ہٹا کر پنجابی کو اخباری اور ادبی زبان قرار دیا جائے - لطف یہ ہے کہ اس ہنگامے میں پنجابی کے علم بردار ساتھ ہی یہ نعرہ بھی لگائے جا رہے ہیں کہ اُردو ہماری قومی زبان ہے - یہ عجب قومی زبان ہے جو نہ تعلیم کی زبان ہے ، نہ سرکار کی ، اور اگر عوام از راہِ محبت اِسے رضاکارانہ طور پر اپنی اخباری اور ادبی زبان بناتے ہیں تو یار لوگوں کا دل جلنے لگتا ہے کہ قوم کی زندگی میں قومی زبان کا اِتنا سا دخل بھی کیوں رہے -

خواتین و حضرات ، قومی زبان کوئی بے کار سا کھلونا نہیں ہے کہ جی چاہا تو اُٹھا کر باہر پھینک دیا - یہ اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے جس کو پورا کیے بغیر معاشرے کی تشکیل و تکمیل نہیں ہوتی - قومی وحدت کی تعمیر کے لیے افرادِ قوم کا ہم خیال ہونا اور ہم خیال ہونے کے لیے ہم زبان ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے - یقین جانیے کہ زبان کا فرق دلوں کے فرق پیدا کر دیتا ہے لیکن ہم زبانی ہم دلی کی پہلی شرط بن جاتی ہے - برطانیہ اور امریکا کی مثال لیجیے - آپ کو معلوم ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر امریکا عالمی سیاسیات سے الگ رہنے کی حکمتِ عملی پر کاربند تھا - با ایں ہمہ

جب برطانیہ کو جرمنی نے بری طرح آن گھیرا تو امریکا اپنے پرانے اصول کو ترک کر کے برطانیہ کی حمایت کے لیے جنگ میں آ شامل ہوا۔ اِن دونوں ملکوں کے درمیان ہم جہتی کی بنیاد ان کی مشترک زبان پر قائم ہے اور آج بھی یہ کیفیت ہے کہ یہ دونوں دو الگ ملک ہونے کے باوجود ایک معلوم ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو انسانی جماعتوں کے درمیان اشتراکِ زبان ایک نعمتِ خداداد ہے جس کی قدر کرنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ اگرچہ مذہب یا نسل یا زبان قومیت کا جزوِ لاینفک نہیں ہے، لیکن یہ سب مجموعی طور پر اور الگ الگ قوم کے وجود کے لیے بڑی اہمت رکھتے ہیں۔ یک زبانی قوم کی وحدت و سالمیت کے استحکام کا باعث ہوتی ہے۔ کسی مشترک زبان کا نہ ہونا قوم کی وحدت کے لیے اسی طرح ضعف کا باعث ہوتا ہے جس طرح عقیدے یا نسل کا اختلاف۔

قومی زبانوں کے وجود میں آنے کی کئی صورتیں ہیں۔ بارہا قومی زبان ملک کی اکثریت کی زبان ہوتی ہے جیسے برطانیہ میں۔ لیکن انڈونیشیا کو دیکھیے تو وہاں صورتِ حال برعکس ہے۔ انڈونیشیا میں ایک چھوٹی سی اقلیت کی زبان پورے ملک کی زبان قرار دی گئی ہے تا کہ ملکی آبادی کے بڑے اجزا کے لسانی مناقشات اتحادِ قوم کو متاثر نہ کریں۔ کبھی کبھی ایک ہی ملک کے اندر متعدّد قومی زبانوں کا وجود بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کی خال خال مثالیں عام اصول کے استثنا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کئی زبانوں کا ننھا سا ملک ہے۔ اس کی قومی وحدت اپنے محدود جغرافیے کی بنا پر قائم رہ سکی ہے۔ نیز اسے یہ سہولت میسّر ہے کہ اس کی مختلف زبانیں کسی نہ کسی متّصل ملک کی قومی زبان ہونے کی حیثیت سے تعلیمی اور دفتری کاروبار کے لیے پہلے سے تیار ہیں۔

لسانی بنیادوں پر پاکستان کی تقسیم چاہنے والے بارہا روس کا

ذکر کرتے ہیں کہ وہاں کی بیسیوں بولیوں کو سرکاری زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے ۔ اس قسم کے بیانات محض اپنے آپ کو (یا دوسروں کو) فریب دینے کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ روس میں روسی زبان کے سر پر جو چترِ شاہی سایہ افگن ہے وہ سب کو معلوم ہے ۔ تمام قومی اور بین الاقوامی کاروبار اسی زبان کے ذریعے سے طے ہوتا ہے ۔ علاقائی بولیوں کی خودمختاری کی حقیقت اِس واقعے سے کھل جاتی ہے کہ ترکستان کے مسلمانوں کے نام تک ابراہیموف ، احمدوف اور یوسفوف کی شکل اختیار کر گئے ہیں ۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میرے نزدیک پاکستان کی علاقائی زبانوں کی ترقی" پاکستان کی قومی زبان کی ترقی" ہے ۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ پشتو ، سندھی ، پنجابی اور اردو سب کی سب ایک ہی تہذیبی روایت کی زبانیں ہیں ۔ اس کے برعکس روسی اور ترکی ، روسی اور فارسی ، وغیرہ کے درمیان اس قسم کا کوئی تہذیبی اور تاریخی تعلّق موجود نہیں ہے ۔ مغربی پاکستان کی علمی و ادبی روایت شمال سے جنوب تک ایک ہے اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہاں کسی ایک زبان کا فروغ کسی دوسری زبان کو نقصان پہنچائے ۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو اُس ذہنیت پر جو اردو اور علاقائی زبانوں کے قریبی تعلّق کو ختم کر کے قوم کے مختلف طبقوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دینا چاہتی ہے ۔ اتّحاد کی جو دولت ہمیں ایک مسلسل تاریخی عمل کے ذریعے سے حاصل ہوئی ، اُس کو تلف کرنے کی کوششوں پر خاموش رہنا کسی صحیح العقیدہ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے ۔ جناب والا ، مجھے معلوم ہے کہ ہمارے بعض عزیز دوست آپ کے جذبۂ حبِّ وطن کو ''عشقِ اردو'' کا نام دے کر آپ سے ناراض ہوتے ہیں :

لقد لامنی فی حُبِّ لیلیٰ اقاربی !

لیکن مجھے یقین ہے کہ ملامت یا خوشامد کا کوئی حربہ اُن اربابِ ہمّت کے خلاف کارگر نہیں ہوتا جو کسی بڑے مقصد کو سامنے

دکھ کر سیدھے راستے پر چلے جا رہے ہوں ۔ میرا اپنا مسلک یہ ہے کہ میں ''ادبی پنجابی'' سے محبت کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی اِس پلیٹ فارم سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے ''سیاسی پنجابی'' سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ پنجابی کے لیے ادبی اور لسانی کام کرنے کی بے انتہا گنجائش موجود ہے ، اور ضرورت ہے کہ یہ کام صاحبِ فراست اور صاحبِ اخلاص لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے ۔ لیکن جو لوگ پنجابی زبان کو سیاسی سازشوں کا اکھاڑا بنانا چاہتے ہیں ، اور اِس حیلے مغربی پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا خواب دیکھتے ہیں ، میں اُن سے قطعی طور پر الگ ہوں ۔ جناب والا ، اگر آپ میری اِس جسارت کو معاف فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ پنجابی کی ترقی کا مسئلہ تخریب پسند عناصر کے ہاتھ میں دے کر آپ نے اور پنجاب یونیورسٹی نے ایک اہم فرض کو نظرانداز کیا ہے ۔ جن قوّتوں نے اِس وقت پنجابی کی پکار لگانی شروع کی ہے اُن کو یہ موقع اِس لیے مل گیا کہ بے شمار ایسے اشخاص جو مغربی پاکستان کی وحدت اور لسانی توافق کے حامی تھے ، علاقائی زبانوں کی صحت مندانہ نشو و نما سے غافل ہوگئے ۔ اگر اورینٹل کالج میں علاقائی زبانوں کا ایک شعبہ قائم ہو جاتا اور اِس کام پر وہی توجہ صرف کی جاتی جو ہم دوسری علمی و ادبی تحقیقات پر کرتے ہیں تو علاقائی زبانوں کی ترقی کے مسئلے کو تخریب کی نیّت سے استعمال کرنے کی وہ کوشش صورت پذیر نہ ہوتی جس کے بعض آثار اب لاہور میں بھی نظر آنے لگے ہیں ۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ کی دانش مندانہ قیادت میں علاقائی زبانوں کے ایک شعبے کا قیام اُن ناراست اور کج اندیشانہ سرگرمیوں کا سدِ باب کر دے گا جن سے ہمارے وطن کے موجودہ لسانی توازن کو برہم کرنا کچھ لوگوں کے پیشِ نظر ہے ۔

خواتین و حضرات ، اس میں شک نہیں کہ اِس وقت معاشی

رقابتیں اور اقتصادی ناہمواریاں بھی زبان کے مسئلے کو اُلجھا رہی ہیں - لیکن ان پیچیدگیوں کی نوعیت دائمی نہیں ہے - اور تدبّر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مستقبل پر اپنی نظر رکھیں اور کسی عارضی ناآسودگی سے متاثر ہو کر آن گراں مایہ وسائل کو اپنے ہاتھوں تباہ نہ کر دیں جن پر ہمارے اتّحاد و استحکام کی بنیاد ہے -

یہ عبوری دور ایک لحاظ سے دورِ ابتلا ہے لیکن میرا ایمان کہتا ہے کہ صبح اسی وقت قریب ہوتی ہے جب رات کچھ زیادہ اندھیری معلوم ہو رہی ہو :

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

☆ ☆ ☆

اسلامیہ کالج کی پنج سالہ کارگزاری کا جائزہ

(روداد سالانہ)

اسلامیہ کالج کا ایک جلسۂ عطائے اسناد و انعامات ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ کو ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، وائس چانسلر، سندھ یونیورسٹی، کی صدارت میں منعقد ہوا۔ راقم الحروف نے جو سالانہ روداد اِس موقع پر پیش کی، ذیل کے اقتباسات اُس سے ماخوذ ہیں۔

صدرِ محترم، خواتین و حضرات،

کالج کا سالانہ جلسہ اِس لحاظ سے بڑی مبارک تقریب ہوتا ہے کہ کالج کے ہمدرد و بہی‌خواہ از راہِ اخلاص و عنایات یہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور اساتذہ و طلبہ کی کارگزاری کا بیان سن کر گویا ہمارے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہیں۔ ہماری کارگزاری کا یہ بیان لازماً ایک روکھی پھیکی روداد کی شکل اختیار کرتا ہے کیونکہ درس و تدریس کی دنیا کے ہنگامے قدرۃً کتاب، قلم اور دوات تک محدود ہوتے ہیں۔ اس بے آب و رنگ دنیا کی سیر کے لیے صرف وہی قدم اُٹھتے ہیں جن کے ساتھ ساتھ محبت کی روشنی چلی آتی ہو۔ کالج میں آج سہ پہر آپ کی آمد اِسی شانِ کرم گستری کا ثبوت ہے، اور ہمارے دل آپ کے اِس احسان کے شکریے سے لبریز ہیں۔ اربابِ فضل و کمال کے اِس مجمع میں کالج کے یارانِ قدیم کے علاوہ ہماری تعلیمی و تہذیبی زندگی کے عمائد اور ہمارے بعض انگریز احباب بھی رونق افروز ہیں۔ ان سب کی موجودگی ہمارے لیے صدگونہ مسرت کا

باعث ہے -

لیکن خود آپ کی نوازشات پر ، جنابِ صدر ، ہمارے حقوق کی نوعیّت ذرا مختلف ہے - آپ نے اپنی زندگی میں طالب علم ، معلّم اور ماہرِ تعلیم ، تینوں حیثیّتوں سے ایک ایسی روشن مثال قائم کی ہے جس سے ہمارے ملک میں ہزاروں شمعیں فروزاں ہونی چاہییں - ہمارے طلبہ و اساتذہ عرصہٴ دراز سے اس موقع کے منتظر تھے جو آج آپ کی تشریف آوری سے میسر ہوا ہے - اس جلسے کے نوجوان حاضرین کے لیے آپ کے زمانہٴ طالب علمی کا تذکرہ ایک نئے اندازِ حیات کا پیغام بننا چاہیے ، اس لیے میں ان کی خاطر کم از کم اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ نے اوائلِ عمر ہی میں اپنے انہماک اور فراست کی بدولت سائنسی علوم ، بالخصوص ریاضی ، میں قابلِ ذکر امتیازات حاصل کیے - جب معلّمی کی زندگی کا آغاز ہوا تو درس و تحقیق کے دونوں متّصل میدانوں میں آپ کے کارناموں کا شُہرہ اِس برِّعظیم سے باہر کے علمی حلقوں تک پہنچا اور آپ کے فلسفیانہ مقالات نے ہماری قومی زبان کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا - پشاور اور حیدرآباد کی یونیورسٹیاں جنھیں آپ کی قیادت کا شرف حاصل ہوا ، آپ کے حسنِ تدبیر کی شاہد ہیں - پاکستان کے نظامِ تعلیم کو محکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے آپ نے گزشتہ پانچ برس میں جو خدمات سرانجام دیں ، اُن کو تاریخی اہمیت حاصل ہے - الغرض آپ کا ذاتی اور علمی کمال خود سفارش کرتا ہے کہ اسلامیہ کالج جیسی قدیم قومی درس گاہ کو آپ کی عنایت اور توجّہ میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور ملے -

جنابِ والا ، اِس ضمن میں ایک اور استحقاق بھی ہے جس کی حیثیّت ذاتی ، بلکہ جذباتی ، قرار پائے گی ، لیکن مجھے بجا طور پر یقین تھا کہ آپ کا خلقِ کریمانہ اُس پرانے تعلق کو نظر انداز نہ کرے گا جو آپ کے اور میرے درمیان ایک مشترک تعلیمی نسب نامے کی بنا پر قائم

ہے - جہاں دنیا کو یہ معلوم ہے کہ آپ اُس باغ کے گلِ سرسبد ہیں جسے اب ناچار مرحوم جامعۂ عثمانیہ کا نام دینا پڑتا ہے ، وہاں مجھے بھی فخر ہے کہ میں اُسی اُجڑے ہوئے باغ کی گیاہِ ناچیز ہوں ، اور اِس نسبت کی بنا پر سعدی نے مجھے آپ سے یہ کہنے کا حق دیا ہے کہ ع

صحبت نہ کند کرم فراموش !

گر نیست جمال و رنگ و بویم　　آخر نہ گیاہِ باغ اویم ؟

اب میں آپ کی اجازت سے گزشتہ سال کی روداد آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں -

اِس سال کا اہم اور قابلِ ذکر واقعہ پہلی سہ ماہی میں طلبہ کی ہڑتالوں کا تسلسل ہے - یہ ہڑتالیں نظامِ تعلیم کے بعض نئے اور بعض پرانے اجزا پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوتی رہیں - اِس وقت مجھے اِن ہڑتالوں کے اسباب سے بحث نہیں ہے - تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ طلبہ کے پیہم خروج نے لاہور میں تعلیمی کام کو کئی ہفتوں تک معطّل رکھا - یونیورسٹی میں ہم نے حکومت کے فیصلے کے مطابق تعلیم کی مدّت اور امتحان کے شرائط میں مناسب تبدیلیاں کیں مگر طلبہ کے انبوہ کچھ عرصے تک رعایتوں کی بھیک مانگنے کے لیے بدستور نکلتے رہے اور اُن کے نت نئے مطالبات پر غور کرنے کے لیے یونیورسٹی کی کمیٹیاں ہفتوں تک مسلسل بیٹھتی رہیں - میں خوش ہوں کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے اِس ہلّڑ بازی میں کوئی حصّہ نہ لیا ، نہ یونیورسٹی کو بزورِ شمشیر فتح کرنے کی کوشش کی - مگر اِس تمام افراتفری اور قواعد و ضوابط کی پے در پے تبدیلیوں سے ہمیں یہ نقصان ضرور پہنچا کہ ہمارا تعلیمی سال ستمبر ۱۹۶۲ کے بجائے عملاً جنوری ۱۹۶۳ سے شروع ہوا - اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ امتحانات پر اِن ہنگاموں کی وجہ سے برا اثر پڑے گا -

اِس کالج کے طلبہ کا ہڑتالوں میں شامل نہ ہونا کالج کے پرنسپل کے بارے میں دو طرح کی قیاس آرائیوں کا باعث ہوا - جن صاحبوں کے نزدیک ہڑتالیہ پن مردانگی کی علامت ہے اُنھوں نے مجھ سے گلہ کیا کہ میں نوجوانانِ قوم کو ہڑتال، جلوس، احتجاج وغیرہ تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکتا ہوں، اُنھیں سڑکوں پر نکلنے نہیں دیتا، اور بہ جبر کالج کے کمروں میں بٹھائے رکھتا ہوں - خواتین و حضرات، ایسے وسیع پیمانے پر جبر کی تنظیم عملاً ناممکن ہے - اور پھر اِس سال تو بالخصوص یہ حال رہا ہے کہ کالج کے کسی طالب علم کا نام سزا کے طور پر خارج نہیں ہوا اور، اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا، تو کسی طالب علم سے تادیبی جرمانہ وصول کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی -

اِس سلسلے میں دوسرا قیاس اُن احباب کی طرف سے پیش ہوا ہے جو ہڑتال بازی کو طالب علمی کی شان کے منافی سمجھتے ہیں - اِن اصحاب کے حسنِ ظن نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اِس کالج کے پرنسپل کے ہاتھ میں کوئی ٹونا ٹوٹکا ہے جو کالج کو بد امنی سے بلا تکلّف بچائے چلا آتا ہے - جنابِ صدر، میں جس طرح جبر کے الزام سے مبّرا ہوں، اُسی طرح شعبدہ گری کی تہمت سے بھی پناہ مانگتا ہوں - حقیقت صرف اِتنی ہے کہ بعض ضمنی اور بعض بنیادی اسباب کی بنا پر اس کالج کے طالب علم تخریب کے فتنۂ آخر زماں سے محفوظ رہے ہیں - ہماری اِس نجات کے ضمنی اسباب میں ایک قابلِ ذکر سبب یہ ہے کہ یہاں صرف بی - اے - اور ایم - اے - کے طلبہ تعلیم پاتے ہیں - جنابِ والا، میں اپنے اس بیان کی ذرا سی تشریح بھی کردوں تو مناسب ہوگا - سال ہا سال سے میرا تجربہ ہے کہ تفریحی شرارت اور تخریبی شرارت دونوں کی صحیح استعداد بالعموم بارھویں جماعت کے طالب علم میں پائی جاتی ہے - نوجوانی کا یہ زمانہ کچھ ایسا رنگ برنگ

دور ہے کہ ایک ایک برس کا فرق اپنی الگ کیفیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ گیارھویں جماعت کے طالب علم کی معصومیت اور تیرھویں والے کی سنجیدگی شرارت کی متحمل نہیں ہوتی ۔ اِن گزارشات سے مقصد صرف یہ ہے کہ کالج میں بارھویں جماعت کا نہ ہونا ایک حد تک خود ہی نظم و ضبط کے مسئلے کا حل بن گیا ہے ۔

میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خار دامن میں

لیکن اِس قسم کی ضمنی کیفیتوں سے قطع نظر دو بنیادی سبب ایسے ہیں جنھوں نے کالج کو ہر قسم کی بد امنی سے بالاتر رکھا ۔ پہلا یہ کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ طبعاً بے حد شریف اور قرینہ شناس ہیں ۔ ان میں سے اکثر ایسے غریب گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں جو اب بھی بزرگوں کی عزّت اور اسلامی دستور العمل کو لازمۂ حیات سمجھتے ہیں ۔ یہ سب طالب علم پرانی روایات کے قدردان ہیں اور حفظِ مراتب کا خاص لحاظ کرتے ہیں ۔ اس بنا پر میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ جیسے سعادت مند اور نیک سیرت نوجوان ملک کے بہت کم کالجوں کو نصیب ہوئے ہیں ۔

دوسرا اہم سبب جس نے کالج میں شائستگی کی فضا برقرار رکھی ، کالج کے اساتذہ کا باہمی اتحاد ہے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے رفقا سب کے سب آپس میں گہرے دوست ہیں ، لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اُن کی بہت بڑی اکثریت کالج کی تنظیم کے لیے متّحد ہے اور ہر نازک مرحلے پر پرنسپل کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہے ۔ بس یہی ہے وہ جبر اور یہی ہے وہ شعبدہ بازی جس نے اس کالج کے طلبہ کو گزشتہ سال کے بلووں اور ہنگاموں میں ایک باوقار اور سنجیدہ جماعت بنائے رکھا ۔

درسی کامیابیوں کے علاوہ بعض طلبہ نے سالِ گزشتہ کے دوران میں مفید علمی و ادبی کام کیا ۔ بی ۔ ایس سی ۔ آنرز کے طالب علم

رحمت علی مجاہد نے اُردو اکیڈمی مغربی پاکستان کے انعامی مقابلے میں شرکت کی۔ ''اڑن مشین'' کے موضوع پر اُن کا مقالہ قابلِ انعام قرار دیا گیا۔ کُل پاکستان سائنس کانفرس میں بھی وہ ''بنیادی ذرّات'' پر اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں۔ بی۔ ایس سی۔ آنرز کے ایک اور طالب علم محمد انیس عالم نے سائنس کی ایک عام پسند کتاب Mr. Thompkin in Wonderland کا سلیس اُردو میں ترجمہ کیا۔ کالج کے دو اور طالب علم تبسّم کاشمیری اور گوہر نوشاہی اُردو میں اچھے پیمانے کا ادبی اور تنقیدی کام کر رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ آگے چل کر اُردو کے نامور ادیب بنیں گے۔ نثر کے علاوہ اِن دونوں کو نظم سے بھی شغف ہے اور اِس شغف میں کالج کے ایک اور ذہین طالب علم صابر کیفی بھی اُن کے ساتھ برابر شریک رہے۔ بی۔ اے۔ کے طالب علم وحید اطہر نے کالج کے رسالے کے لیے کئی پُر لطف مضامین لکھے جن میں سے ایک اِس سال کا بہترین مضمون قرار پایا ہے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ میں ڈراما اور مصوّری اِس سال خصوصیّت سے نمایاں رہے۔ اِس کالج میں ناٹک کی کوئی مستقل روایت نہیں ہے مگر ڈراما کلب نے اِس سال جو دو کھیل (''موم کے بت'' اور ''فوج سے واپسی'') پیش کیے وہ مقبول ہوئے اور ان میں ذوالفقار علی اور صوفی نیاز علی کا کام خاص طور پر پسند کیا گیا۔ ایم۔ اے۔ (فائن آرٹ) کے طالب علم غلام رسول نے کالج ہوسٹل میں اپنی تصویروں کی نمائش لگائی اور پھر امجد رشید اور محمود احمد کی مدد سے نقّاشی اور سنگ تراشی کی ایک کُل پاکستان انٹر کالجیئیٹ نمائش کا اہتمام کیا۔ یہ نمائش اِس وقت اِس ہال کے اوپر کی گیلری میں موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس تقریب کے خاتمے پر، چائے کے بعد، آپ تھوڑی دیر کے لیے اس نمائش کو دیکھنے اور نوجوان فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ہال کی گیلری میں تشریف لے جائیں گے۔

ڈراما کلب اور فائن آرٹ سوسائٹی کے علاوہ کالج میں اکثر

درسی مضامین کے نام پر تہذیبی مجالس قائم ہیں - ان میں بزمِ فروغِ اُردو اور اکنامکس، پولٹیکل سائنس، ہسٹری، جیاگرفی، اور فلاسفی سوسائٹیز وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا ثبوت دیتی رہیں - انگریزی کی سوسائٹی ولی فرڈ سٹڈی سرکل نسبتہً زیادہ سرگرمِ عمل رہی - یہ کارگزاری سرکل کی باہمّت خاتون سیکرٹری شناور خان کی کوشش سے ممکن ہوئی - شناور خان ایم - اے - (انگریزی) کی طالب علم ہیں - سٹڈی سرکل کی طرح ایک اور تہذیبی مجلس "ینگ رائٹرز" اپنے انگریزی نام کے باوجود اُردو ادب و تنقید کے لیے مستعدی سے کام کرتی رہی - اِن تہذیبی مجالس کی محفلوں میں کالج کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ ملک کے مشاہیر، پروفیسر وقار عظیم، مسٹر ممتاز حسن، میاں ریاض الدین احمد، مسٹر الطاف گوہر، پروفیسر انیس احمد عباسی، وغیرہ تشریف لاتے رہے - پاکستان سے باہر کے جن اہلِ علم نے اِن جلسوں میں شرکت فرمائی اُن میں مسٹر محمد فرید اور ڈاکٹر محمد مصطفیٰ مصر کے ثقافتی مرکز کی معرفت، مسز ڈبلیو - جے - کریگ برٹش کونسل اور مسٹر جے سٹیوارٹ، مسٹر پال اینگل اور ڈاکٹر ولیم - سی - کرک یونائیٹڈ سٹیٹس انفرمیشن سروس کے توسّط سے تشریف لائے - اِن سرگرمیوں سے قطع نظر، ہماری مجلسِ اسلامیات اِس سال نمائشِ کتبِ سیرت کا اہتمام کر رہی ہے - یہ نمائش اِس مہینے کے آخری ہفتے میں ہوگی -

سائنس کے مضامین فزکس، کیمسٹری، زوآلوجی اور باٹنی کی مجالس نے چودھری محمد علی، ڈاکٹر فوسٹر، ڈاکٹر ریاض الدین اور ڈاکٹر وولڈ جیسے صاحبِ علم حضرات سے استفادہ کیا - ان مجالس میں طلبہ بھی اپنے مختصر مقالات پیش کرتے ہیں - چنانچہ زوآلوجی کی مجلس میں محبوب احمد اور خالد وغیرھم نے مقالے پڑھے جو پسند کیے گئے - فزکس کی مجلس نے لاہور کے اٹامک انرجی سنٹر کے بعض ماہرین سے وعدہ لیا ہے کہ وہ اپنے اپنے خاص مضمون پر آنرز

کے طلبہ سے خطاب فرمائیں گے۔ ان مجالس کے علاوہ تمام کالج کی مشترک مجلس، کالج یونین، نے اِس سال بھی اپنا مفید کام جاری رکھا۔ محمد علی یونین کے نائب صدر، اور عبدالستار سیکرٹری منتخب ہوئے۔ یونین نے اِس مرتبہ بھی متعدّد دلچسپ مباحثوں کا انتظام کیا۔ منجملہ اِن مباحثوں کے، اُردو اور انگریزی کے سالانہ کُل پاکستان بین الجامعی انعامی مباحثے تھے جو بارونق رہے۔

کرکٹ میں اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے سالانہ مقابلے کو اب ایک ثقافتی میلے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ گزشتہ بارہ برس کے کھیل کے متعلق اگر کوئی بات مجموعی طور پر ہمارے حق میں کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ کہ ہم نے اِس میلے کی رونق میں کسی طرح کمی نہیں آنے دی۔ اس کے علاوہ جو بات قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ ۱۹۵۰-۱۹۵۱ کے کرکٹ میچ سے شروع کر کے سالِ رواں تک ہم ہر سال مسلسل ہارتے چلے آئے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۹۳۹ سے ۱۹۴۹ تک کے عرصے میں، یعنی مسلسل گیارہ برس تک، ہم گورنمنٹ کالج کو شکست دے کر یونیورسٹی کی کرکٹ چیمپئن ِشپ برابر جیتتے چلے گئے تھے۔ اِس بنا پر ہمارا خیال تھا کہ گیارہ برس کی مسلسل فتح کے بعد گیارہ برس کی مسلسل شکست ہمارے لیے مقدّر ہو چکی ہے۔ ۱۹۵۷ میں چونکہ میچ نہیں ہو سکا تھا اس لیے گزشتہ سے پیوستہ سال کرکٹ میں ہماری مسلسل شکستوں کا شمار صحیح عدد، یعنی گیارہ، تک پہنچ گیا۔ اب دونوں طرف حساب برابر تھا، اس لیے توقع کی جا رہی تھی کہ بارھویں برس مسلسل فتوحات کا گیارہ برس کا جشن پھر شروع ہوگا۔ مگر ثابت یہ ہوا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں۔ ہمیں پھر شکست ہوئی اور شکست بھی ایسی جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ گورنمنٹ کالج کی کرکٹ ٹیم کچھ ایسی ناقابلِ تسخیر ٹیم نہ تھی، اور پھر اس کے دو بہت اچھے کھلاڑی محض سوءِ اتفاق سے مقابلے

میں شامل نہ ہو سکے تھے - اس کے باوجود یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ٹیم بارھویں مرتبہ ہار کر تاریخ کے دانت کھٹے کرنے پر تُلی ہوئی تھی - یہ ٹیم لاہور سے کراچی تک فاتحانہ یلغار اور بے شمار مقابلوں میں کامیابی کے بعد واپس آئی اور خود اپنے تجویز کردہ میدان، لاہور سٹیڈیم، میں ۱۶۶ دوڑوں سے ہار گئی - خواتین و حضرات، یہ کرکٹ میچ میرے دو پیش رووں کے جگر کا ناسور بن گیا تھا اور اب یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ میں خود ایک داغِ حسرت لیے ہوئے اپنے جانشین کے لیے وہ وصیّت چھوڑ جاؤں گا جو خواجہ حالی نے دہلیٔ مرحوم کے بارے میں فرمائی تھی:

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت، اے سیّاح
دیکھ، اِس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور کشتی رانی کی شکستوں سے قطع نظر، ہم اِس سال کبڈی، والی بال اور کراس کنٹری ریس میں یونیورسٹی کے چیمپئن بنے - ہماری کبڈی ٹیم کے ارکان عبدالستار، محمد سعید اور محمد شریف نے فائنل میچ میں بہت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا - یونیورسٹی کے والی بال فائنل میں ہماری ٹیم نے گورنمنٹ کالج کو شکست دے کر یونیورسٹی کی ٹرافی جیت لی - ہماری ٹیم کے دو کھلاڑی خالد مسعود اور شوکت علی قومی مقابلوں میں شرکت کے لیے پنجاب کی ٹیم میں منتخب ہوئے، نیز خالد مسعود پنجاب یونیورسٹی ٹیم کے کپتان مقرر ہوئے - کراس کنٹری ریس میں ہمارے کھلاڑی فیاض محمود اول آئے اور یونیورسٹی ٹرافی ہمارے ہاتھ رہی - پنجاب یونیورسٹی ریلے ریسز اور ضلع لاہور کے اولمپک مقابلوں میں ہماری ٹیم دوسرے نمبر پر رہی - پنجاب یونیورسٹی ایتھلیٹکس میں ہم رنرآپ رہے - ہمارے کھلاڑی فیاض محمود ۴۰۰ میٹر کی رکاوٹوں کی دوڑ میں اور احمد سلیم اختر ۱۵۰۰ میٹر کی کھلی دوڑ میں اول آئے -

کالج کی کوہ پیما کلب حسبِ معمول اِس سال بھی مستعد رہی ، کلب کے تیرہ رکن گزشتہ موسمِ سرما میں وادیٔ کاغان کے ماؤنٹینیرنگ کیمپ اور مری یوتھ ہوسٹلنگ کیمپ میں شریک ہوئے ۔ کاغان میں پانچ میل کی دوڑ اور مری میں اٹھائیس میل کی ہائیک میں حصہ لے کر ہمارے طلبہ نے اپنی جفاکشی کا بہت اچھا مظاہرہ کیا ۔

جنابِ والا ، طلبہ کے متعلق اِن کوائف کے بیان کے بعد میں مختصراً اساتذہ کا بھی تذکرہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ اِس سال کے دوران میں میرے بعض رفقا مختلف حالات کے ماتحت کالج چھوڑ کر چلے گئے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی صدر شعبۂ فارسی کا یونیورسٹی اوریئنٹل کالج میں تقرّر ہو گیا ۔ اُن کی جگہ ہمارے صدر شعبۂ اردو افتخار احمد صدیقی صاحب فارسی کے صدر کے فرائض بھی بجا لا رہے ہیں ۔ مرزا محمد وسیم سول سروس میں گئے اور ان کی جگہ مسٹر ذوالفقار خاں کا تقرر ہوا ۔ ذوالفقار خاں صاحب نے ۱۹۶۰ میں اسی کالج سے ایم ۔ اے ۔ (انگریزی) کا امتحان دے کر نمایاں کامیابی حاصل کی تھی ۔ مسٹر فیاض الرحمٰن لیکچرار باٹنی کے مستعفی ہونے کے بعد ان کی خالی کی ہوئی اسامی پر ڈاکٹر رفیق احمد خاں کا تقرر ہوا ۔ ڈاکٹر رفیق احمد خاں علی گڑھ اور خود اسلامیہ کالج کے مشہور تجربہ کار اساتذہ میں ہیں ۔ اب وہ دیال سنگھ کالج کی پرنسپلی سے فارغ ہوئے تو ہم دوبارہ ان کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔

جنابِ صدر ، یہ تقریب اُس پنج سالہ دَور کی آخری تقریب ہے جو اِس کالج میں ایف ۔ اے ۔ کے حصّے کی علیحدگی کے بعد اپریل ۔ مئی ۱۹۵۸ سے شروع ہوا تھا ۔ مناسب ہے کہ اِس دَور میں جو تعمیری و تنظیمی کام ہوا اس کی مختصر کیفیت آپ کے گوش گزار کر دوں ۔

اِس دور کے آغاز ہی سے کالج میں مختلف تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا - مثلاً پہلے سال میں طلبہ کے لیے ایک خوب صورت چائے خانہ تعمیر ہوا ، گزشتہ سال بائیسکلیں رکھنے کے لیے ایک شیڈ بنا ، اور اِس دوران میں پورے کالج کی چمن بندی بڑے سلیقے سے تکمیل کو پہنچی - کالج ہوسٹل کا بڑا حصہ ، جو ناجائز قابضین کے تصرّف میں تھا ، بہ تدریج واگزار کرایا گیا - اور اس سال کے دوران میں وہ ۲۷ کمرے بھی کالج کے قبضے میں آ گئے جو اب تک پولیس کے استعمال میں تھے - پروفیسر غلام صادق ، جو ہوسٹل کے نگران بھی ہیں ، محنت اور تن دہی سے ہوسٹل کی اصلاح میں مصروف ہیں -

کالج کے کتب خانے کی تنظیم کا کام اِس سال نہایت توجہ اور قرینے سے ہاتھ میں لیا گیا ہے - یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ مرکزی وزارتِ تعلیم کے چار لاکھ روپے کے عطیّے کا ایک حصہ لائبریری کی مد پر صرف ہونے لگا - جون ۱۹۵۸ میں ۹۰۰۰ کتابیں کالج کے ریلوے روڈ والے کتب خانے سے موجودہ کتب خانے میں منتقل ہوئی تھیں - یہ کتابیں گزشتہ سال تک لائبریری کے بالا خانے کے فرش پر پڑی رہیں کیونکہ نہ الماریاں بنوانے کے لیے رقم میسّر تھی ، نہ وہ عملہ موجود تھا جو ٹیکنیکل طور پر ان کتابوں کی فہرست بندی کر کے انھیں قابلِ استعمال بنا سکے - بالآخر مرکزی حکومت کے عطیّے کی مدد سے کتب خانے کی تنظیم کے لیے گزشتہ سال شیخ محمد امین کا تقرّر عمل میں آیا - شیخ صاحب کالج کے پرانے لائبریرین اور اس سے بھی پرانے طالب علم ہیں - اُنھوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود نوجوانی کی ہمّت کے ساتھ اپنا کام سنبھال لیا ہے - کتابوں کے ڈھیر فرش سے اٹھ کر الماریوں میں پہنچ گئے ہیں - اس کے علاوہ امین صاحب نے سال ہا سال کے پرانے بل مرتّب کر کے متعلقہ کتب فروشوں کے حسابات بیباق کر دیے ہیں - بارہ ہزار سے زیادہ کتابوں کا اندراج

ایکسیشن رجسٹروں میں ہو چکا ہے ۔ اس سال ۱۹۵۵ کتابیں Classify اور ۷۹۱ Catalogue ہوئیں ۔ اگر کام کی یہی رفتار جاری رہی تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ دو سال کے عرصے میں لائبریری کا موجودہ جنگل مہذّب اور صاحبِ علم قارئین کے لیے صاف ستھرے مطالعہ خانے کی صورت اختیار کر لے گا ۔ اس سال ۷۵۰۰۰ روپے کی مزید کتابیں کالج لائبریری میں آئیں ۔ ان کتابوں کی خرید بھی مرکزی حکومت کے عطیّے سے ممکن ہو سکی ۔ حکومت کے عطیّے سے جو ۴۲ کمرے حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں وہ اسی مہینے سے اساتذہ کے استعمال میں آنے لگیں گے ۔

ان بیرونی تعمیرات کے علاوہ اِس عرصے میں کالج کی ذہنی تعمیر نظر انداز نہیں ہوئی ۔ اِس دوران میں کالج کے نظم و ضبط کو تعلیمی حلقوں میں نیک شہرت نصیب ہوئی ۔ کالج میں علمی زندگی کے پاکیزہ نصب العین کا حصول ، جس کے لیے جمعیّتِ خاطر پہلی شرط ہے ، ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہا ۔ کالج کے برآمدے شور و غوغا سے پاک رہے اور بے آئین زندگی کی جارحیّت کے مقابلے میں معلّم اور طالب علم دونوں کی حفاظت کی گئی ۔ حدودِ معیّنہ کے اندر آزادیِ فکر و عمل کا استحکام کیا گیا اور ہم دلی و ہم کاری کے لیے رفاقت کی سازگار فضا کی پرورش مسلسل ہوتی رہی ۔ اِس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے اسلامی جذبے اور قومی شعور کی تربیت ہوئی ۔ اور مجھے یقین ہے کہ ضرورت پڑی تو اِس کالج کے تربیت یافتہ نوجوان پاکستان دشمن طاقتوں سے بِھڑ جانے کے لیے ایک بار پھر اُسی طرح اُٹھیں گے جس طرح ۱۹۴۶ میں قیامِ پاکستان کی خاطر اِنھوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی ۔

جنابِ والا ، اب میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مستحق طلبہ کو اپنے ہاتھ سے انعامات دے کر مفتخر فرمائیں ۔

☆ ☆ ☆

چند ادبی اور لسانی مسائل

عمرانیات کی روشنی میں

یہ مضمون حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور، کے چوبیسویں سالانہ جلسے منعقدہ ۳ اپریل ۱۹۶۳ میں بطور خطبۂ صدارت کے پڑھا گیا۔

ارکانِ حلقہ، خواتین و حضرات،

ادیبوں کے اِس سالانہ جلسے میں میری طلبی کا جواز شاید اِس بنا پر پیدا ہوا کہ مجھے بحیثیتِ مدرّس پرانے ادب کے پڑھنے پڑھانے سے سروکار ہے۔ لیکن آج شام مجھے اردو، فارسی یا انگریزی ادب کے پرانے شاہکاروں کا ذکر مقصود نہیں ہے۔ اِس موقع پر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک بے تعلق تماشائی کی حیثیت سے آپ کو جدید اردو ادب کے بعض اہم کوائف پر متوجہ کروں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اِس مہینے اقبال کی رحلت کو پورے پچیس برس گزر جائیں گے۔ اگر آپ اِس ربعِ صدی میں اردو ادب کے نفع و نقصان کا حساب لگائیں تو مجھے یقین ہے کہ خسارے کی مد خاصی بھاری نظر آئے گی۔ اِس انحطاط کا ایک سبب ہر طفلِ مکتب کو معلوم ہے۔ ۱۹۳۹ سے بےاطمینانی کا ایک ایسا دور شروع ہوا کہ پندرہ برس تک ادب و فن زندگی میں اپنے صحیح مقام سے محروم رہے۔ اِس مدّت کے پہلے آٹھ برس دوسری عالمگیر جنگ کی افراتفری کی نذر ہو گئے۔ اِس ضمن میں ایک اور مصیبت یہ پیش آئی کہ اقبال کے

دورِ آخر کے نوجوان معاصرین کی ایک بڑی تعداد برطانوی ہند کی جنگی خدمات سے منسلک ہوگئی۔ سرکاری ملازمت کی گھٹن فکر و تخیّل کی آزاد حرکت کو روکتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف خلقِ خدا پر جنگِ عظیم کا قہر نازل ہوا، اور دوسری طرف وہ اُس روحانی تسلّی کا بڑا حصّہ بھی کھو بیٹھی جس کا سرچشمہ صرف ہم عصر قومی ادب ہوتا ہے۔ اِس کمی کے باعث ہمارے عوام کے شعور میں اُس ذہنی ناہمواری اور اخلاقی عدمِ توازن کا بیج بویا گیا جس کی فصل ہم اب کاٹ رہے ہیں۔ جنگِ عظیم ختم ہوئی تو ہمارے ادب کو سات برس کے ایک اور خلا کا سامنا کرنا پڑا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے سات سال، اور اُن کی لائی ہوئی تخریبی و تعمیری کاوشیں (جن کے اہم اجزا سازش، قتل، سیاسی جوڑ توڑ اور شہری آبادی کے فسادات تھے) ادبی بے حاصلی کی الگ داستان ہیں۔

لیکن اقبال کی وفات کے بعد کے پندرہ برس سے قطع نظر، سوال یہ ہے کہ گزشتہ دس برس کی مدّت، جس کے آخری حصّے سے ہم اِس وقت گزر رہے ہیں، ہمارے لیے کن ادبی کارناموں کی خبر لائی؟ ہماری فردِ عمل کچھ مختصر افسانے، چند ناول، تھوڑا سا علمی کام ضرور پیش کرتی ہے۔ لیکن شعر جو ادبی احساس کی بلندی کا صحیح معیار قائم کرتا ہے، ابھی تک اُس بے باک، بھرپور اور مطمئن لہجے کی تلاش میں ہے جو خود ۱۹۴۰ تک ہمارے ادب کو میّسر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بحث میں مراد ادبی کام کی مقدار سے نہیں بلکہ نوعیت اور منصب سے ہے، اور نوعیت اور منصب کا لحاظ کیجیے تو تخیّل کی جولانی اب طرح طرح کی نو ساختہ حد بندیوں سے دوچار ہے۔

اکبر اور اقبال کے دور میں مغربی تمدّن کا گھٹیا ہونا قومی شاعری کے اصولِ موضوعہ میں داخل تھا۔ اِسی طرح اپنے تمدّن اور

اخلاق کی خیالی عظمت کے اعلان کو جزوِ ایمان کی حیثیت حاصل تھی - استقلالِ پاکستان کے بعد اپنا تمدّن اور قومی اخلاق ، جیسے کچھ بھی ہیں ، واشگاف ہو کر سامنے آ گئے ہیں اور ان پر تکیہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - باقی رہا مغربی تمدّن ، سو اِس موضوع پر پھبتی کی تحریک صرف انگریزوں کی موجودگی تک جان دار اور با معنی معلوم ہوتی تھی - انگریزی حکومت کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو مغربیّت پر ادبی طنز کا سارا لطف کرکرا ہو گیا - الغرض تاریخ کے انقلاب نے نئے ادب کو ایک ایسی منزل پر لا ڈالا ہے جہاں وہ نہ تو حالی کی طرح اپنی گزشتہ سیاسی عظمت کا ماتم کرنے میں حق بجانب نظر آتا ہے ، یہ اکبر و اقبال کی طرح مغربی تمدّن پر سیر حاصل طنز کرنے کے قابل رہا ہے -

اِن ضمنی تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم تہذیبی پس منظر کا وہ انقلاب ہے جس نے ملک کے صاحبِ ذوق طبقے کو بھی مختلف خیالات اور مختلف عقائد کی متعدّد ٹکڑیوں میں بانٹ دیا ہے - کٹّر قسم کی مُلّائیت سے کٹّر قسم کی لادینی تک ، کٹّر قسم کی سرمایہ داری سے کٹّر قسم کی اشتمالیت تک ، کٹّر قسم کی قدامت پسندی سے ہلکی پھلکی لاآبالی تجدّد پرستی تک ، ہر رنگ اور ہر عقیدے کے متحارب فریق اب ہمارے ادب کے قدردانوں اور ناقدردانوں میں موجود ہیں - اِس قسم کا متفرّق معاشرہ ادبی تخلیق ، بالخصوص اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق ، کا محرّک نہیں ہو سکتا - میر و غالب ، اُس ناشادی و نامرادی کے باوجود جو اُن کی زندگی کا نمایاں عنصر رہی ، عہدِ حاضر کے پاکستانی ادیب سے زیادہ خوش نصیب تھے - اُن کا خطاب ایک ایسے ہم ذوق اور یک رنگ معرشرے سے تھا جس کی وحدتِ فکر و احساس شاعر اور قاری کے درمیان تقریر کی لذّت کو قائم رکھنے کا محکم وسیلہ تھی - مغلیہ معاشرے کے مخروط کی چوٹی اور بنیاد میں بڑا

فاصلہ تھا لیکن اِس مخروط کی ہر تراش اپنی جگہ پر جمی ہوئی ، ایک بے خلل تمدّنی روایت میں رچی ہوئی ، اپنی پُرسکون صلابت کا اظہار کر رہی تھی - ۱۸۵۷ کے بعد پرانے تمدّن میں ہر روز نئے رخنے پڑنے لگے ، تاآنکہ ایک سو برس کے اندر نوبت یہاں تک آپہنچی کہ وہ تمدّنی روایت جو ایک ہزار برس سے ہماری وحدتِ شعور کی بنیاد بنی ہوئی تھی ، بالآخر پارہ پارہ ہو گئی - اِس طرح شاعر اور قاری کے درمیان وہ گہری خلیج پھیلتی چلی گئی جس کو پاٹنے کے لیے ایک نئے تمدّن کی تخلیق اور ایک مشترک تہذیبی روایت کے رچنے کا انتظار کرنا ہوگا - خود اقبال کو بھی نصف صدی پہلے ، کسی نہ کسی حد تک ، یہی مصیبت درپیش تھی ، لیکن اُس وقت تک دینی عقائد کے اتّحاد کا وسیلہ ابھی باقی تھا - اقبال نے اِسی اتّحاد کو ذریعۂ افہام و تفہیم قرار دیا اور اپنے افکار کو نئے علوم کی چاشنی دے کر نئے قارئین کے لیے قابلِ قبول بنایا -

یہ نصف صدی پہلے کی بات تھی - اِس کے بعد بھی اپنی تمدّنی روایت سے ہماری روز افزوں مغایرت کا سلسلہ بدستور جاری رہا - انگریزوں نے عربی اور فارسی کو جو بُری بھلی جگہ اپنے بنائے ہوئے نظامِ تعلیم میں دے رکھی تھی ، وہ بھی بتدریج ختم ہونے لگی - گزشتہ پچاس ساٹھ برس کے عرصے میں ہم اپنی تینوں تہذیبی زبانوں سے دور ہوتے گئے ہیں - پہلے ہم نے عربی کو چھوڑا ، پھر فارسی سے قطع تعلق کر لیا ، اب اُردو کی باری ہے - یہ میں اِس لیے کہتا ہوں کہ ملک کے چیدہ و برگزیدہ اصحاب کا مقتدر اور غیر متغیّر طبقہ تو پہلے سے انگریزی کو اپنی مادری زبان بنائے ہوئے ہے ، اب ایک اور طبقے نے ملک کے اندر نئی قسم کی مادری زبانوں کی تلاش شروع کر دی ہے - اگر ہماری تمام مادری زبانوں کا دائرۂ عمل اِسی رفتار سے وسیع ہوتا رہا تو یقین رکھنا چاہیے کہ قومی زبان اور

قوم کی وحدتِ شعور کے فروغ کے لیے کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔

خواتین و حضرات، یہ مسئلہ بجائے خود بہت اہم ہے، لیکن میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ فی الحال میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ مذہب، معاشرت اور زبان کے معاملے میں ہمارے سمٹتے ہوئے تہذیبی پس منظر کے باوجود تخلیقی کام کی راہیں ابھی ہم پر بند نہیں ہوئیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخِ ادب صرف ہومر، فردوسی اور شیکسپیئر کے کارناموں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ بلاشبہ اِن تینوں عظیم شعرا میں سے ہر ایک کا کام ایک پختہ تہذیبی روایت کا ثمر تھا، لیکن دوسری طرف اُن زندۂ جاوید فنکاروں کو نہ بھولیے جنھوں نے ناسازگار ماحول کے باوجود اپنی اپنی قوم کے سامنے زندگی کی ایک نئی تصویر رکھ دی۔ اگر ہومر نہیں تو یوریپیڈیز، اگر فردوسی نہیں تو سعدی، اگر شیکسپیئر نہیں تو ملٹن یا ورڈزورتھ بن جانا ہمارے ادیبوں کے لیے کیوں دشوار ہے؟ یہ آخرالذکر لوگ وہ ہیں جو اپنی اپنی قوم کے لیے آئینۂ زندگی نہیں تو شمعِ ہدایت ضرور بنے۔

خواتین و حضرات، مجھے اِس محفل میں شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے دل میں اُردو کے ادیبوں کا بے حد احترام ہے، لیکن میں بصد ادب اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ گزشتہ دس برس میں ہمارے ادیبوں نے اپنا عظیم الشان منصب کماحقہٗ پورا نہیں کیا۔ اقبال، اکبر اور حالی کا ہاتھ قوم کی نبض پر تھا۔ موجودہ ادیب نے قوم کی اُمنگوں کا ترجمان بننے کے بجائے فقط اپنی ذاتی نجات کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی انفرادیت کے ننھے منے شیش محل کو ایک محدود حلقے کی زیارت گاہ بنانا فی نفسہٖ ایک ہنر ہے، لیکن قوم کے سوادِ اعظم کے دل پر خدا کی آواز بن کر گرنا ایک بلند تر کمال کا ثبوت ہے۔

سب مانتے ہیں کہ پاکستان کا حصول صرف مال و دولت یا

مادّی فائدے کے لیے نہیں ہوا تھا ۔ پاکستانی قومیّت کی بنیاد ایک دینی عقیدے پر قائم ہے ۔ مگر اقبال کے بعد اُردو ادب میں اِس دینی عقیدے کا سراغ لگانا کچھ ایسا آسان نہیں رہا ۔ اِس سے میری مراد خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے ادیبوں نے شریعت کے اوامر و نواہی پر نظمیں ، افسانے یا ڈرامے کیوں نہیں لکھے ، لیکن جن معنوں میں یہ کہا گیا ہے کہ انگریزی ادب کے بہترین حصے کا مفہوم مسیحیّت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے ، نیز جن معنوں میں شیکسپیئر کے ایک نئے شارح نے اُس کے المیہ ڈراموں کے متعلق یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ اُن کے ذریعے سے شیکسپیئر نے شاعرانہ زبان میں اپنے دور کی مسیحی تہذیب کی صداقت پر گواہی دی ہے ، اُنھی معنوں میں پاکستانی ادیبوں کے تخلیقی کام سے اسلام کی حقّانیت پر گواہی کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ انسانی مساوات ، معاشرتی انصاف ، خدمتِ خلقِ خدا ، حق گوئی و بے باکی ، ذوقِ ایثار ، ہمدردیِ ابنائے جنس ، کتنے وسیع میدان ہیں جو پروازِ تخیّل کا تقاضا کر رہے ہیں ! ہمارا معاشرہ طرح طرح کی پریشانیوں اور ناہمواریوں کا شکار ہے ۔ دولت کی نامساوی اور غیر منصفانہ تقسیم ، جہالت اور تعصّب اور نفس پرستی کا دَور دَورہ ، خلوص اور دیانت کا قحط ، انسانی ضمیر کا شبانہ روز قتل ، جمہوریت کا خون ، یہ سب کچھ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے ادیبوں کو قلمی جہاد کی دعوت دیتا ہے ۔ اگر ہمارے ادیب اپنی اپنی الگ ڈفلی سنبھالے منفی قسم کی پریشاں سرائیوں میں مصروف رہے تو پاکستان اُس نظریاتی جنگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا جو اِس وقت ہماری سرحدوں کے اندر اور باہر دونوں جگہ لڑی جا رہی ہے ۔ یہ شاید ایک جسارت ہے مگر میں عرض کروں گا کہ سب سے پہلے آپ اپنی سمت کا تعیّن کیجیے ، اپنے ضمیر کی روشنی کو کچھ اور روشن کر دیجیے ، قوم کے گونگے عوام کی زبان

بنیے - وہ گھبرائے ہوئے ہیں - آپ کی روح کی گہرائی سے تسلّی کا جو لفظ نکلتا ہے، وہ ان کے لیے نامحدود اخلاقی قوّت کے خزانے کھول دیتا ہے - خدا کی دی ہوئی اِس دولت کے لٹانے میں بخل نہ کیجیے - اسلام اور پاکستان کے نام پر ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈالیے تاکہ اپنے بنیادی حقوق کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک درخشاں مستقبل کی معیّن صورت سامنے نظر آئے -

لیکن، خواتین و حضرات، عالمِ شعر صرف عالمِ اخلاق سے عبارت نہیں ہے - یہاں حواس سے سمیٹا ہوا لطف و سرور بھی قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتا ہے - اِس خاص لطف و سرور کے شعبے بے شمار ہیں - میں صرف ایک کا ذکر کروں گا - ہماری قومی اور علاقائی زبانوں نے ابھی تک مغربی پاکستان کے جغرافیائی حسن کا احاطہ نہیں کیا - جو کچھ اب تک کہا گیا ہے اُس سے اِس موضوع کے بے حساب امکانات کا حق ادا نہیں ہوا - ہمارے پہاڑ اور دریا، ہمارے جنگل اور پھول اور پرندے، ہمارے سہانے ریگ زار، ہمارے دیہات و قصبات، سبھی اپنے انکشاف اور ظہور کے لیے ہمارے ادیبوں کی محبت آمیز نگاہوں کو ڈھونڈھ رہے ہیں - ہمارے ادب میں پیرس اور لندن اور سٹریٹ فرڈ کے حسن کی داد موجود ہے - لیکن یقین جانیے کہ صرف ہماری آنکھ کے کھلنے کی دیر ہے ورنہ ہمارے اپنے شہروں اور قریوں، ان کے پیچ در پیچ گلی کوچوں، گنجان مکانوں اور جھکے ہوئے بالاخانوں کا پُراسرار حسن خود یورپ سے آنے والے سیّاح کو مست کر دیتا ہے - ٹھٹھہ، پشاور اور چنیوٹ، سیالکوٹ، پھالیہ اور پسرور کی آب و تاب آپ کے قدموں میں پڑی ہے اور آپ کی حبِّ وطن سے تقاضا کرتی ہے کہ اس وطن کو اہلِ وطن کے لیے زیادہ خوب صورت اور زیادہ دل کش بنائیے -

اخلاقی اور حِسّی تجربے کے بیان کے علاوہ ہمارے قومی ادب

کے لیے ایک تیسری قسم کی تعمیری کوشش کا راستہ بھی کھلا ہے، اور وہ ہے قومی زبان کو مستحکم اور وسیع بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش - یہ زبان اِس برِّ عظیم میں صدیوں سے ہماری قومی ہستی اور تہذیبی آمنگوں کی ترجمان رہی ہے - گزشتہ دو سو برس میں اردو کے وجود کا تسلسل ہمارے قومی وجود کے تسلسل کی تاریخ ہے - اب اس زبان کو نئے ملکی حالات، اور بیسویں صدی کے مقتضیات کے ساتھ ترکیب دینے کا فرض ہمارے نوجوان ادیبوں کے سر پر آ پڑا ہے، اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ اِس فرض سے فتح مندانہ انداز میں عہدہ برآ نہ ہوں -

یہ سب کو معلوم ہے کہ اردو مغربی پاکستان میں پیدا ہوئی - مسعود سعد سلمان کے عہد کی اردو اور پنجابی میں کوئی فرق نہ تھا - بلکہ اس زمانے تک یہ دونوں علیحدہ نام پیدا بھی نہ ہوئے تھے - چودھویں صدی تک زبان کی یہ وحدت بدستور قائم رہی - چنانچہ دکنی اردو پر پنجابی اردو کی چھاپ، جو اب بھی موجود ہے، اسی بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے - چودھویں صدی کے بعد دلّی نے اپنی اصل "پنجابی اردو" کے ساتھ مقامی روزمرہ کو ملانا شروع کیا اور جب اٹھارھویں صدی میں اردو کو دلّی کی ادبی زبان کا مرتبہ ملا تو وہاں کا علاقائی محاورہ محکم طور پر زبان میں دخیل ہوگیا - سو برس اور نہ گزرے تھے کہ لکھنؤ کی ادبی زبان کی حیثیت سے اردو میں کچھ اور تبدیلیاں رونما ہوئیں، اور اس طرح یہ زبان پنجاب کی اپنی مقامی بولی سے کچھ اور دور ہوگئی - لیکن اب تاریخ کے انقلاب نے اردو کو پھر اپنی زاد بوم کی طرف لوٹایا ہے - مجھے یقین ہے کہ جس طرح دکن، دہلی اور لکھنؤ کا علاقائی محاورہ اردو کا جزوِ بدن بنا، اسی طرح زندگی کے اس نئے دور میں خود اپنی مادرِ وطن کا لب و لہجہ اردو کے لیے ایک نئی قوّت اور وسعتِ بیان کا ذریعہ بنے گا - یہ عمل تاریخ کے

اٹل بھاؤ کے ساتھ ایک دن ہو کر رہے گا، لیکن لازم یہ ہے کہ ہم خود بھی ایک ترقی پسندانہ قدم اٹھائیں اور اپنی ادبی سرگرمی سے اِس تاریخی عمل کی رہنمائی کریں۔ آپ سے، اے ارکانِ حلقۂ اربابِ ذوق، اہلِ علم و ادب یہ توقّع وابستہ کیے ہوئے ہیں کہ آپ اِس نئی ادبی و لسانی تحریک کی دانش مندانہ قیادت کریں گے۔ جس طرح تیس برس پہلے آپ کی ادبی فراست اور سلامتِ ذوق نے ایک مشکل وقت میں قومی ادب کو سہارا دیا تھا، اُسی طرح آج کل کے بدلے ہوئے حالات میں آپ کے خلوص و ہمّت سے یہ اُمید ہے کہ آپ اپنی اپنی بولیوں کا تازہ لہو اردو کے رگ و پے میں دوڑا دیں گے۔

اردو کو پاکستان کی سب علاقائی زبانوں پر یکساں حق حاصل ہے لیکن پنجابی کے ساتھ اس کا تعلق اتنا قریبی ہے کہ پنجابی کے لغات و محاورات کا اردو میں کھپ جانا کسی کاوش کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ ادب زندگی کے ہنگامے سے اُلجھا رہے تو زندہ رہتا ہے، ورنہ مر جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کو کتابوں سے نکال کر کوچہ و بازار میں لائیے۔ ہماری عوامی، دیہاتی اور شہری، زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جو لفظوں کے قالب میں جلوہ گر ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان کے بیان کے لیے دہلی اور لکھنؤ کا بنا ہوا سانچا مکتفی نہ ہو سکے گا اور زبان میں نئے اسما و افعال کو لازماً دخل دینا ہوگا۔ یہ عمل ذوقِ سلیم کی روشنی میں بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا سکتا ہے، اور آپ کی جماعت سے بہتر کون سی ہر دل عزیز جماعت ہے جس کے سپرد یہ کام کیا جائے؟

اِس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی آپ کی توجہ چاہتا ہے۔ انگریزی زبان و ادب سے اردو نے بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا ہے لیکن اس قسم کے استفادے کا دائرہ انگریزی یا فارسی تک محدود کرنا کیا ضرور ہے۔ پنجابی ادب کا بہتر حصہ ہمارے زرعی نظامِ معیشت کی

پیداوار ہے - اس بدلتے بلکہ مٹتے ہوئے نظامِ معیشت کے بعض پہلو اس قابل ہیں کہ اردو میں منتقل اور محفوظ کیے جائیں - اِسی طرح پنجاب کے بے مثال لوک گیت ، مضمون اور ہیئت دونوں لحاظ سے ، اردو کے ادیب کی توجہ پر اپنا خاص حق رکھتے ہیں - ان لوک گیتوں میں جو بحریں استعمال ہوئی ہیں ، اُن کی روانی اور تموّج کو اردو کی متداول بحروں سے ربط دینے کی کوشش بہت مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے -

خواتین و حضرات ، خاتمۂ کلام سے پہلے مجھے ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ، بعض تلخ حقیقتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے - مذہب کے بعد اگر کوئی چیز اِس ملک کی سالمیّت کو برقرار رکھ سکتی ہے تو وہ اردو زبان ہے - میں دلی افسوس کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں کہ اربابِ حکومت میں سے بعض کے منہ سے کبھی کبھی کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جس سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اِن صاحبوں کو قومی زندگی کی وحدت کے برقرار رکھنے میں زبان کی بنیادی اہمیت کا دھندلا سا شعور بھی میسّر نہیں ہے - جب تک حکومت کے اعلیٰ مقامات پر قومی زبان کے مسئلے کی اصولی حیثیت تسلیم نہیں ہوتی ، یارانِ سرِ پُل سوئے فتنوں کو جگانے کی کوشش میں لگے رہیں گے - حال میں رائٹرز گلڈ نے پنجابی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ اٹھایا تو اکثر لوگ حیران ہوئے - رائٹرز گلڈ ایک ادبی جماعت ہے ، سیاست کاری کا اکھاڑا نہیں ہے - پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ مغربی پاکستان کے موجودہ لسانی اور تعلیمی توازن کو برہم کر کے کس قسم کے نئے توازن کا قیام مدّ ِنظر ہے - مجھے انتشار پسند اور تخریب نواز عناصر سے کوئی بحث نہیں ہے - لیکن اہلِ علم کے اس اجتماع سے مکرّر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وحدتِ زبان کو ملّتوں کی بقا و استحکام کے ساتھ ایک تاریخی تعلّق ہوتا ہے - اسلام کے دَورِ آغاز

میں پوری قوم کی زبان کچھ عرصے تک عربی تھی مگر تین صدیاں نہیں گزری تھیں کہ سلطنت کی روز افزوں وسعت نے نظامِ حکومت کو غیر متوازن کر دیا ۔ سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے ، اور زبان کے بھی ۔ عالمِ اسلام کے مغربی حصّوں کی زبان اگرچہ بدستور عربی رہی مگر اقصائے مشرق کی زبان فارسی قرار پائی ۔ صدیوں تک ایران ، توران اور ہندوستان کی یہ نئی تہذیبی وحدت برقرار رہی ۔ لیکن آخرکار سیاسی زوال کا عمل ایک بار پھر نئے تفرقوں اور نئی حد بندیوں کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ فارسی کا دور ختم ہوا اور اردو کا دور شروع ہوا ۔ اردو کی مرکزیّت پاکستان کی مرکزیّت و سالمیّت کی علامت بنی ۔ اِس موقع پر میں پوچھتا ہوں کہ اب تاریخِ عالمِ اسلام کے اِس تیسرے دور میں جو لوگ پاکستان کی رہی سہی لسانی مرکزیّت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں ، وہ کس نظامِ زندگی کی تباہی اور کس نئے نظامِ زندگی کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہیں ؟ تاریخ کا قدیم دستور ہے کہ وہ زبان کے شیرازے کے ساتھ حکومت کا شیرازہ بھی برہم کرتی ہے ۔ لاطینی مسیحیّت اور لاطینی زبان کے زوال کی داستان بڑی عبرت آموز ہے ۔ جب لاطینی مسیحیّت کی دی ہوئی یورپی وحدت پارہ پارہ ہو گئی تو نئی لسانی و نسلی قومیتّوں کو بے شمار خوں ریز جنگیں لڑنے کے بعد ایک ناپائدار سی آسودگی نصیب ہوئی ۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں لاطینی کی حیثیت مغربی پاکستان میں اردو کی حیثیت سے بالکل مختلف تھی ۔ اردو صرف علما کی زبان نہیں ہے ۔ ہر طبقے اور ہر خطے کے لوگ اسے سمجھتے اور بولتے ہیں ۔ اس کے علاوہ پاکستان کا معاملہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ سائنسی ایجادات کی نئی دنیا میں مغربی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے لسانی علاقوں کا ایک علمی اور سرکاری زبان کے مرکزی ربط کے بغیر زندہ رہنا ناممکنات سے ہے ۔ ذرا غور

فرمائیے کہ جس زبان کو تعلیمی زبان کے منصب سے ہٹانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں اُس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ سرکاری زبان بن سکے گی محض اپنی طفلانہ نافہمی کا ثبوت مہیّا کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

خواتین و حضرات، پچھلے دنوں ہمارے صوبے کے وزیرِ مالیات نے جب اُردو کو ذریعۂ تعلیم کے مقام سے ہٹانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو وہ یہ بھول گئے کہ اِس مسئلے پر زبان کھولنے کا حق دراصل ہماری واجب الاحترام وزیرِ تعلیم کو پہنچتا تھا۔ بہرحال اُن کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گو اُردو کے بجائے پنجابی کے ذریعۂ تعلیم بن جانے سے قوم کی سالمیّت کا حصار متزلزل نہ ہو، لیکن پھر بھی یاد رہے کہ اُردو وہ اینٹ ہے جس کو دیوار میں چننے کے لیے سید احمد خاں، اقبال اور قائدِ اعظم کے ہاتھ اُٹھے تھے۔ اس ایک اینٹ کے اُکھڑنے کے منظر کو قوم خاموشی سے برداشت نہیں کرے گی۔

سچ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں زبان و ادب کے تمام متعلقہ مسائل کے سلسلے میں ابھی نافہمی و ناعاقبت اندیشی کے علاوہ فتنہ انگیزی کی گنجائش بھی موجود ہے۔ میں نے اِن مسائل کا تجزیہ حلقۂ اربابِ ذوق کے ہم عقیدہ ارکان کے سامنے اِس اُمید پر پیش کیا ہے کہ وہ ایک زندہ اور فعّال جماعت کی حیثیت سے قومی زبان و ادب کی خدمت کے لیے کوئی صحیح قدم اُٹھائیں گے۔

خواتین و حضرات، میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اِن معروضات کو توجہ سے سنا۔

☆ ☆ ☆

لفظوں کا صحیح استعمال

۱۰- جولائی ۱۹۶۴ کو میں نے ریلوے پبلک سکول، ایبٹ آباد، کے طلبہ کے سامنے مذکورۂ بالا موضوع پر تقریر کی۔ یہ تقریر "ٹیپ" کے ذریعے سے محفوظ رہ گئی۔ اس کی نقل ذیل میں درج ہے۔

عزیزو اور دوستو،

یہ عجیب بات ہے کہ زندگی کی بعض نعمتیں جو ہمارے لیے نہایت ضروری ہیں اُن کی قدر سے ہم بالعموم غافل رہتے ہیں۔ پانی کو دیکھیے یا ہوا کا خیال کیجیے۔ ہم میں سے کم لوگ کبھی یہ سوچتے ہیں کہ پانی خدا کی عطا کی ہوئی بڑی نعمت ہے اور ہوا اس سے بھی بڑی نعمت، جس کے بغیر زندگی کا پل بھر بھروسا نہیں ہوتا۔ اِسی طرح سے انسان کی آنکھیں اور کان ہیں۔ یہ بھی بڑی نعمت ہیں۔ اِن کے بغیر زندگی کا، اور اُس قسم کی زندگی کا جیسی ہم آپ بسر کرتے ہیں، تصوّر نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود، حالت یہ ہے کہ جب تک ہم میں سے کوئی بدقسمتی سے اندھا نہیں ہو جاتا، یا ہماری سننے کی طاقت زائل نہیں ہو جاتی، ہمیں خیال نہیں ہوتا کہ یہ سننا اور یہ دیکھنا بہت بڑی نعمت ہے جس کے لیے انسان کو ہر وقت خدا کا شکر گزار رہنا چاہیے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ بعض نعمتیں (جیسی وہ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا) خداداد ہیں۔ بعض اور نعمتیں ہیں جو انسان نے اپنے لیے خود پیدا کی ہیں، اگرچہ ذرا سوچیے تو انھیں بھی خدا ہی کی

دین سمجھنا چاہیے - اِس دوسری قسم کی نعمتوں میں میرے نزدیک کوئی نعمت لفظوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی - یہ اختیار کہ میں آپ سے بات کر سکتا ہوں ، آپ مجھ سے اور ہم سب آپس میں گفتگو کرنے کی قابلیّت رکھتے ہیں ، ایک بہت بڑا عطیّہ ہے جس کے بغیر جینا دوبھر ہو جاتا - ایسی زندگی کا تصوّر کیجیے جس میں انسانوں کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کو الفاظ نہ ہوں ، اور ہمارے منہ سلے ہوئے ہوں یا زبانیں بند ہوں - اس صورت میں بنی آدم کو کس قسم کی تاریخ نصیب ہوتی اور کس قسم کا تہذیب و تمدّن دنیا میں رونما ہؤا ہوتا ؟ یہ جو کچھ ہزارہا سال سے تختۂ زمین پر نظر آ رہا ہے ، یہ کرشمہ ہے اِس بات کا کہ ایک انسان اپنے دل کی بات دوسرے انسان سے کہہ سکا - جو کچھ انسان نے سیکھا وہ اپنے بیٹے کو اور پوتے کو بتا گیا اور اِس طرح زندگی کا تجربہ ہزاروں برس بعد آنے والے انسانوں کے لیے محفوظ ہونے لگا -

الغرض اگر الفاظ نہ ہوتے تو نہ شعر ہوتا نہ فلسفہ - نہ سائنس ہوتی نہ نت نئی ایجادات - نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا ، نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو - ہماری زندگی مکروہ اور گھناؤنی ، حیوانوں کی سی ، اور چند روزہ ہوتی ! ہمیشہ یاد رکھیے کہ اچھی زندگی ہمیں لفظوں کے طفیل نصیب ہوئی -

تو غور کیجیے کہ لفظوں جیسی نعمت سے ہم جس بے پروائی کا سلوک کرتے ہیں ، کیا وہ اُسی طرح کی غفلت نہیں ہے جیسی پانی یا ہوا کی نا قدرشناسی ؟ ممکن ہے آپ کہیں : کیا مصیبت ہے کہ ہم ہر وقت یہ سوچتے رہیں ”ہوا بڑی نعمت ہے !“ اس قسم کا خیال کیے بغیر بھی تو ہم سانس لیتے اور صاف ہوا کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں ! بالکل درست - لیکن اگر آپ آس پاس کی ہوا کی پاکیزگی اور کمرے کی ہوا کی تازگی کا خیال نہ رکھیں اور صرف سانس لیتے رہیں تو آپ

اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ آپ کو ہوا کی صحیح قدر و قیمت کا شعور نہیں ہے ۔ اسی طرح گو ہم اکثر بولتے ہوئے پائے جاتے ہیں ، اور اپنے ساتھیوں سے ضرور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں ، لیکن کیا ہماری باتوں میں وہی رکھ رکھاؤ اور ہمارے لفظوں میں وہی قرینہ ہے جو سمجھ بوجھ والے ، شائستہ ، آدمیوں کی گفتگو میں ہوتا ہے ؟

جو قومیں تہذیب کی منزل میں داخل ہو چکی ہیں اُن میں زندگی کے ضابطے کی پابندی کے ساتھ ساتھ زبان کے ضابطے کی پابندی بھی ضرور پائی جاتی ہے ۔ ممکن ہے آپ یہ خیال کریں کہ ہم نے کبھی پانی اور ہوا کی طرح لفظوں کی ناقدری تو نہیں کی ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کے متعلق جتنی ناقدری کا ثبوت ہم پاکستان کے لوگ دیتے ہیں ، دنیا کی کوئی اور قوم شاید ہی دیتی ہو ۔ جن الفاظ سے ہمیں دن رات سروکار رہتا ہے ، ہم نہ اُن سے صحیح طور پر واقف ہوتے ہیں ، نہ اُن کے برتنے میں مناسب قسم کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں ۔ جو الٹم غلٹم لفظ زبان پر آ گیا ، اُسی سے کسی نہ کسی حیلے مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگر بات پوری نہیں ہوئی تو سمجھتے ہیں کہ ہاتھ کی حرکت سے ، آنکھ کے اشارے سے ، بدن کی کسی عجیب و غریب جنبش سے ، مطلب دوسرے کی سمجھ میں آ جائے گا ۔ آدھا جملہ کہہ ہی دیا ہے ۔ اب اتنی بھی کیا مصیبت کہ انسان ہر جملے کو سنار کی طرح پوری احتیاط سے ڈھالنے کی کوشش کرے ! الغرض ہم سستی یا بے پروائی کے مارے لفظوں کو صرف ٹالتے اور ٹرخاتے رہتے ہیں ۔ بجائے اس کے کہ لفظوں کے مفہوم کو سمجھیں اور اُن کے استعمال کا صحیح طریقہ سیکھیں ، ہم کہتے ہیں کہ چلو دوسرے نے ہمارا برا بھلا مطلب سمجھ تو لیا ! یعنی جب ہم نے پانی مانگا ، اور اُس نے پانی دینے کے بجائے ہمیں کچھ اور ، مثلاً طوطا نہیں دیا ، تو یہ بالکل کافی ہے کہ ”پانی دو“ نہ کہیں ۔ جیسا

بھی جملہ چاہیں گھڑ لیں -

اس طوطے نے مجھے اپنا یہ دعویٰ کہ ہم لفظوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ، ایک اور طرح پیش کرنے کا موقع دیا - ہمارے مدرسوں میں بچوں کو محاورے یاد کرائے جاتے ہیں اور ایک محاورہ ہے ''ہاتھوں کے طوطے اڑ جانا'' - میں نے بعض ایسے لوگوں کو جو الفاظ کی صحت سے بے پروا ہیں ، یہ کہتے سنا ہے کہ ہاتھ پاؤں کے طوطے اڑ گئے - ان لوگوں کو یہ اندازہ نہیں رہتا کہ محاورے میں کسی قسم کا تصرّف نہیں کیا جا سکتا - محاورے میں طوطے جتنے بھی ہوں ، ''ہاتھوں کے'' تو ہوتے ہیں ''پاؤں کے'' نہیں ہوتے اور پھر صرف ''ہاتھوں کے'' ہوتے ہیں ، ''ہاتھ کے'' کبھی نہیں ہوتے -

ایک اور عام محاورہ لیجیے : ''دل باغ باغ ہونا -'' مطلب ہے : ''پھولا نہ سمانا ، از حد خوش ہونا'' - چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جب ننّھے نے پہلا قدم اٹھایا تو ماں کا دل باغ باغ ہو گیا - لیکن فرض کیجیے کوئی شخص یہ کہے کہ جب صدر ایوب خاں نے تربیلا بند کا معائنہ کیا تو اُن کا دل باغ باغ ہو گیا - یہاں محاورے کا استعمال بے احتیاطی سے کیا گیا ہے - مراد صرف یہ ہے کہ وہ بہت مُطمئن ہوئے یا وہ بے حد خوش ہوئے - جس شخص نے اُن کا دل باغ باغ دیکھا ، اُسے اندازہ نہ تھا کہ دل کے باغ باغ ہونے کا صحیح استعمال کس موقع پر ہوتا ہے -

محاورے کے علاوہ زبان کے روزمرّہ کا لحاظ بھی ضروری ہے ، ورنہ یوں معلوم ہوگا جیسے ہم کوئی بے معنی بات یا اچنبھے کی بات کر رہے ہیں - مثلاً اردو میں ہم ''بہت بہت شکریہ'' کہتے ہیں - محض ''بہت شکریہ'' (جو غالباً انگریزی کا لفظی ترجمہ ہے) اردو زبان کے دستور کے خلاف ہے - انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں سے بعض کی زبانی میں نے ایک عجیب مضحکہ خیز غلطی سنی ہے - کہتے ہیں :

"میں صبح صرف ایک انڈا لیتا ہوں" اور مراد ہوتی ہے: "کھاتا ہوں" - اسی طرح ہمارے اخبارات اکثر لکھ جاتے ہیں: "فلاں صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی" - یہ انگریزی کا لفظی ترجمہ ہے - اُردو میں تجویز "رکھی" نہیں جاتی، پیش کی جاتی ہے - اسی طرح کی ایک اور ترکیب ہے "بہت زیادہ" جو اُردو کے اخبارات ایک عجیب طریقے پر بکثرت استعمال کرتے ہیں - مثلاً "میرے والدِ ماجد آپ سے مل کر بہت زیادہ خوش ہوں گے" یا "پاکستان اور ترکی میں بہت زیادہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے -" حالانکہ "بہت زیادہ" کے معنی ہیں: "ضرورت سے زیادہ" یا "اتنا جتنا نہیں ہونا چاہیے -" ایسے موقعوں پر "بہت ہی خوش ہوں گے" اور "حد درجے کا اعتماد پیدا ہو گیا ہے" لکھنا صحیح ہے - یوں دیکھیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ "بہت زیادہ" کا غلط استعمال آج کل بہت زیادہ ہو گیا ہے - اور یہی اس ترکیب کو برتنے کی صحیح صورت ہے -

ایک اور دلچسپ ایجاد ہے جس سے زبان کے طالب علم کو ضرور بچنے کی کوشش کرنی چاہیے - انگریزی سے ہم نے بہت فائدے اُٹھائے ہیں مگر یہ کیا ضرور ہے کہ ہر بات میں انگریزی کی اندھا دھند نقل کی جائے - اگر ہم ایک زبان کے روزمرّہ کو لفظی ترجمے کے ذریعے سے دوسری زبان میں منتقل کریں تو ہماری بات تماشا بن کر رہ جاتی ہے - یہ کبھی نہیں کرنا چاہیے کہ جس طرح کوئی لفظ یا ترکیب انگریزی میں گھڑی گئی ہے، بالکل اسی طرح کی ترکیب ہم اُردو میں گھڑ لیں - مثلاً انگریزی میں سب کا جانا پہچانا لفظ last ہے جس کے معنی "گزشتہ" کے بھی ہیں اور "آخری" کے بھی - مثلاً last meeting سے "گزشتہ ملاقات" بھی مراد ہو سکتی ہے اور "آخری ملاقات" بھی - لیکن بعض بے احتیاط لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کا لفظ "آخری" بھی انگریزی last کی طرح مبہم ہے اور

ایک کے بجائے دو معنی رکھتا ہے۔ ''آخری'' کا مطلب ''گزشتہ'' ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے کسی سے یہ کہنا غلط ہے (بجز اس صورت کے کہ کہنے والا مرنے کے قریب ہو) ''میرا آخری خط تمھیں مل گیا ہوگا۔'' ''میرا گزشتہ خط'' کہنا چاہیے۔ اسی قسم کی ایک اور غلطی، جو انگریزی کی طرف سے اردو میں آئی ہے، یہ کہنا ہے کہ ''وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔'' انگریزی میں ایسے موقع پر لفظ for کا استعمال رائج ہے لیکن اردو میں اس موقع پر ''کے لیے'' کہنا غلط بھی ہے اور بے معنی بھی۔ ''وہ لاہور روانہ ہو گیا'' کہنا چاہیے۔

ایک اور عام غلطی ہے جو آپ نے اکثر لوگوں کی زبانی سنی ہوگی، مثلاً کہتے ہیں ''کافی'' تشویش ہوئی یا ''کافی'' عذاب ہؤا۔ لیکن ''کافی'' وہ چیز ہوتی ہے جو ''حسبِ ضرورت'' ہو۔ اب تشویش یا عذاب کی کس کو ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ اس مصیبت کے ''کافی'' ہونے کی تمنّا کرے! کہنا چاہتے ہیں ''بہت'' تشویش یا ''سخت'' عذاب اور کہتے ہیں ''کافی''۔ اسی طرح کی بے احتیاطی لوگ کبھی کبھی ''امید ہے'' کے استعمال میں کر جاتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں: ''امید ہے کہ پنڈت نہرو آئندہ ہفتے روس جائیں گے۔'' حالانکہ کہنا صرف یہ چاہتے تھے: ''خیال ہے کہ پنڈت نہرو . . .'' یا ''غالباً پنڈت نہرو . . .۔'' امید صرف کسی اچھی چیز کی باندھی جاتی ہے۔ جس اخبار نے پنڈت نہرو کے متعلق مذکورہ جملہ لکھا اُسے صاحبِ موصوف کے روس جانے کی کوئی آرزو نہ تھی۔

آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ جب زبان میں اچھے بھلے لفظ اور ترکیبیں موجود ہیں اور اُن کے معنی مقرر ہیں تو آخر اُن کا غلط استعمال کیوں شروع ہو جاتا ہے؟ میرا جواب ہے کہ سب سے پہلے کوئی نہ کوئی بے احتیاط یا ناواقف شخص غلط لفظ یا غلط ترکیب ایجاد کرتا ہے۔ پھر دوسرے بے احتیاط یا ناواقف لوگ اس کا استعمال شروع کر

دیتے ہیں ۔ مثلاً ''تخمیناً'' یا ''تقریباً'' کے بجائے ''اندازاً'' کہنا (اور لکھنا) اسی قسم کی غلط پسندی یا بے خبری کا ثبوت ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نکتہ آپ انگریزی گریمر کے حوالے سے بہ آسانی سمجھ جائیں گے ۔ ''تنوین'' عربی صرف کا ایک قاعدہ ہے جو ہم noun کو adverbial صورت دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ یعنی noun کے ساتھ ''ن'' کی آواز بڑھا دیتے ہیں اور اس کے لکھنے کی صورت یہ ہوتی ہے : ''اً'' مثلاً عربی میں ''آن'' کے معنی ہیں ''گھڑی'' یا ''پل'' اور ہم کہتے ہیں ''آناً فاناً'' (پل بھر میں) ۔ ''تخمین'' ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں قیمت لگانا ، اندازہ کرنا ۔ اسی طرح ''تقریب'' کے معنی ہیں کسی گنتی یا خاصیت یا کیفیت کے نزدیک ہونا ۔ چنانچہ جب ہم ''تقریباً'' یا ''تخمیناً'' کہتے ہیں تو مراد ہوتی ہے کسی خاص صورت حال کے قریب قریب یا اندازے سے ۔ ''اندازہ'' ایک فارسی لفظ ہے اور فارسی لفظوں پر تنوین کا عمل نہیں ہوتا ، صرف عربی لفظوں پر ہوتا ہے ۔ لیکن جس شخص کو لفظوں کے غلط استعمال کا شوق ہے ، وہ تقریباً اور تخمیناً کے معنی اپنے سامنے فارسی زبان میں رکھ لیتا ہے اور پھر فارسی میں اپنی غلط عربی (اور غلط فارسی !) ''اندازاً'' کہہ کر ہانک دیتا ہے ۔ یہ مضحکہ خیز لفظ نہ عربی میں ہے ، نہ فارسی میں ، نہ ترکی میں ۔ مگر اردو بولنے والوں میں آپ کو بہت سے لوگ مل جائیں گے جو تقریباً یا تخمیناً کے بجائے ''اندازاً'' کہتے ہیں ۔

لفظوں کے غلط استعمال کے شائقین کبھی کبھی صرف غلط املا کا سہارا لے کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں ۔ ''دونوں'' لکھنے کے بجائے ''دونو'' لکھتے ہیں لیکن اس لفظ میں سے نون غنہ غائب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تینوں'' اور ''چاروں'' کو ''تینو'' اور ''چارو'' لکھنا ۔ یہ حضرات ''پروا'' کو ''پرواہ'' اور ''بے پروائی'' کو ''بے پرواہی'' لکھ کر دو زبانوں یعنی اردو اور فارسی پر ستم توڑنے کی کوشش کرتے

ہیں کیونکہ یہ لفظ اردو میں فارسی سے آیا ہے ۔ لطف یہ ہے کہ جو زائد ''ہ'' وہ ''پروا'' میں جمع کرتے ہیں وہ بلاتکلف ''قہقہہ'' سے تفریق کر لیتے ہیں اور اس لفظ کو غلط کرنے کے لیے اسے ''قہقہ'' لکھتے ہیں ۔ اسی طرح بعض عربی الاصل الفاظ کے پیچھے ''ہ'' کا دم چھلا لگا کر ان کا حلیہ بگاڑتے ہیں مثلاً

مع کو معہ لکھتے ہیں

برقع کو برقعہ لکھتے ہیں

موقع کو موقعہ لکھتے ہیں

حالانکہ صحیح املا ''مع''، ''برقع'' اور ''موقع'' ہے ۔

غلط نگار حضرات کی ایک اور عام عادت ''اٹھارھویں'' کو ''اٹھارویں'' لکھ ڈالنا ہے ۔ لیکن اس طریقے پر اگر ہم ''سترھویں'' کو ''سترویں'' لکھ جائیں تو بتائیے اردو میں seventeenth اور seventieth کا فرق کس طرح دکھایا جائے گا ؟ لکھنے کی عام غلطیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ سب کا شمار اس مختصر تقریر میں نہیں کرایا جا سکتا ۔ بہرحال بعض چھوٹی چھوٹی باتیں اِس قابل ہیں کہ یاد رکھی جائیں ۔ ''معمّا'' ''ا'' سے لکھا جاتا ہے، ''ہ'' سے ''معمّہ'' لکھنا غلط ہے ۔ جہاں ''مرتبے پر فائز ہونا'' لکھا ہو وہاں ''فائز'' ''ز'' سے لکھنا چاہیے، ''ض'' سے ''فائض'' غلط ہے ۔ اسی طرح ''حیرانگی'' اور ''درستگی'' لکھنا غلط ہے ۔ صحیح لفظ ''حیرانی'' اور ''درستی'' ہیں ۔ بعض لوگ ''ازدحام'' کو اژدحام'' لکھتے ہیں لیکن اس کا کوئی جواز نہیں ہے ۔ کچھ اس سے بھی زیادہ ناجائز بلکہ مہمل اُن لوگوں کی روش ہے جو غصّے کے جوش کے لیے ''غیض'' کا لفظ لکھتے ہیں (غیض و غضب) ۔ یہاں صحیح لفظ ''غیظ'' ہے ۔ اس کے ساتھ اگر لفظ ''غضب'' کا اضافہ ضروری ہو تو ''غیظ و غضب'' لکھنا چاہیے، نہ کہ ''غیض و غضب'' ۔

خیر ، اب لکھنے کا خیال چھوڑ کر بولنے کی طرف آئیے - دراصل صحیح لکھنے سے کچھ زیادہ مشکل صحیح بولنا ہے - یہ جملہ سنیے : ''شیر دہاڑتا ہؤا جنگل سے نکلا -'' اسے بعض لوگ شیر ''دھاڑتا ہؤا'' کہتے ہیں - ''دہاڑ'' کبھی کبھی دو چشمی ھ سے ''دھاڑ'' لکھا ہؤا ملتا ہے ، مگر شیر کی ''دہاڑ'' اور چیز ہے اور لُچّوں لفنگوں کی مار دھاڑ اور چیز - ایک اور عام غلطی ''مسمّٰی'' (مُسم ما) کو مسمّی (مُسم می) کہنا ہے - آپ نے سنا ہوگا کہ قانونی معاملات میں اکثر اس قسم کا ذکر آ جاتا ہے : ''ایک شخص مسمّٰی اللہ بخش . . .'' جو لوگ ''مسمّی (مُسم می) اللہ بخش'' کہتے ہیں ، غلط کہتے ہیں - تلفّظ کی بعض اور غلطیاں جتنی عام ہیں اتنی ہی عجیب و غریب بھی ہیں - ''خَلِیق'' اور ''حَسِین'' کو بعض لوگ ''خُلیق'' اور ''حُسین'' کہتے ہیں - انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اگرچہ ''خُلق'' اور ''حُسن'' دونوں صحیح لفظ ہیں (دونوں میں پہلے حرف پر پیش کا نشان لگا کر) مگر ان سے جو اسم صفت بنتے ہیں اُن کا تلفّظ ''خَلِیق'' اور ''حَسِین'' ہے ، یعنی دونوں کے حرفِ اوّل پر پیش غلط اور زبر صحیح ہے - بعض لوگ ''مُملِکَت'' کہتے ہیں - صحیح ''مَملُکَت'' یا ''مَملَکَت'' ہے - اس کی جمع ''مَمالِک'' ہے اور جو لوگ ''مُمالِک'' کہہ جاتے ہیں ٹھیک نہیں کرتے - ''خطِ اِستِوا'' کو ''خطِ اَستُوا'' کہنا اتنا ہی غلط ہے جتنا ''بُحَیرہ'' کو ''بُحِیرہ'' کہنا - تلفّظ کی سب سے پُرلطف غلطی نون غنّہ سے بھانْجا اور بھانْجی کہنا ہے - بھانجا کا تلفّظ ''بھان جا'' ہے اور بھانجی کا ''بھان جی'' - انھیں ''بھاں جا'' اور ''بھاں جی'' کہنا سراسر غلط ہے - یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جب ہم نون غنّہ سے ''بھانجی'' کہتے ہیں تو مراد ہوتی ہے ''خلل یا رخنہ'' - چنانچہ ''بھانْجی مارنا'' کا مطلب ہے ''رخنہ ڈالنا'' - اب بچاری بھانجی کا کیا قصور کہ اُس کا نام لیتے ہم صاف ستھری بات چیت میں

بھانجی ماریں ! یہ اعلانِ نون اور نون غنّہ کا معاملہ ذرا سی احتیاط سے درست ہو سکتا ہے۔ جب ہم ''بھانجا'' اور ''کنبا'' کہیں تو اعلانِ نون ضروری ہے (کُم با غلط ہے اور ''کُن با'' صحیح) لیکن ''بھونچکّا'' نون غنّہ سے ہے۔ اس میں اعلانِ نون غلط ہے۔ ''بھون چکّا'' نہیں، ''بھوں چکّا'' کہیں گے۔ اسی طرح کے بہت سے اور بھی الفاظ ہیں جن میں نون غنّہ کی جگہ اعلانِ نون غلط ہے۔ ہنسا، دھنسا، بھنور، ان سب کا تلفّظ نون غنّہ سے ہے۔ (ہن سا، دھن سا، بھن ور، غلط ہے)۔

ایک اور عجیب سی غلطی ہے جو ہم میں سے بعض لوگ پنجابی گفتگو میں تو بھول کر بھی نہیں کرتے لیکن اگر وہی بات اُردو میں کہیں تو اُردو کے تکلّف میں آ کر ضرور غلط کہتے ہیں۔ مثلاً یہ جملہ سنیے: ''مشاعرہ کی شام کو بارش ہونے لگی''۔ کہنا یوں چاہیے تھا: ''مشاعرے کی شام کو بارش ہونے لگی''۔ اسی طرح یاد رکھیے کہ ''مسلم لیگ کے جلسہ میں'' غلط، ''جلسے میں'' درست۔ ''لڑکوں کے مدرسہ کا دروازہ'' غلط، ''مدرسے کا دروازہ'' درست۔ ''جہانگیر کے مقبرہ کو'' غلط، ''مقبرے کو'' درست۔ ''اولیا کے سلسلہ نے'' غلط، ''سلسلے نے'' درست۔ ''کلکتہ سے شملہ تک'' غلط، ''کلکتے سے شملے تک'' درست۔

اب آپ کو اندازہ ہؤا ہوگا کہ میں نے بات شروع کرتے ہوئے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم لفظوں کو نعمت نہیں، بلکہ کوئی گری پڑی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ واقعہ اکثر پیش آتا ہے کہ جب ہمارے علاوہ دوسرے لوگ، بولنے اور لکھنے والے لوگ، لفظوں کا اچھا یا بُرا استعمال کرتے ہیں تو ہم اِس استعمال کی برائی یا اچھائی سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دوسرے شخص نے کوئی اچھا جملہ کہا یا بُرا، صحیح زبان استعمال کی یا غلط۔ بار ہا یہ صورت

پیش آتی ہے کہ جلسے میں کوئی یاوہ گو اور کور ذوق مُقرّر اُلٹے سیدھے لفظ لڑھکانا شروع کر دیتا ہے اور سادہ لوح سامعین جھوم جھوم کر کہتے ہیں : واہ ، سبحان اللہ ! حضرت نے کیا اچھی تقریر کی ! یہ مضحکہ خیز صورت اس لیے پیش آتی ہے کہ بعض لوگ لفظوں کے آب و رنگ اور چمک دمک سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں - جہاں چمکیلے لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں چمکیلا لفظ جڑتے ہیں اور آرائشِ بیان سے وہاں کام لیتے ہیں جہاں طبیعت بے اختیار سادگی اور برجستگی کا تقاضا کرتی ہے - یاد رکھیے کہ الفاظ ہیرے اور جواہرات ضرور ہیں مگر صرف اُن لوگوں کے لیے جو موتیوں کی طرح اِن کی قدر کرتے ہیں - ناقدر دانوں کے دامن میں اِن موتیوں کو راکھ بنتے دیر نہیں لگتی -

میرے عزیزو ، آج کی گفتگو کے لیے میں نے کیوں یہ موضوع تجویز کیا ؟ اس لیے کہ آپ کی عمر میں لفظوں کی پرکھ کا شوق دل میں پیدا کر لینا ایک بڑا انعام ثابت ہوتا ہے اور اگر اِس سے غفلت کی جائے تو ذہن کے کئی خانے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں - آپ نے سنا ہوگا کہ بعض لوگوں کو رنگ (پھول پتّوں کے ہرے اور پیلے اور لال رنگ) نظر نہیں آتے - جدید نفسیات نے اُن کے لیے ''رنگ نابیں'' یا ''رنگ کور'' کی اصطلاح تجویز کی ہے - اسی طرح ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی جماعت ایسے ''لفظ کور'' لوگوں کی ضرور ہوتی ہے جو اچّھے بُرے یا صحیح و غلط لفظوں میں تمیز کر ہی نہیں سکتے - لیکن شکر ہے کہ اس قسم کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں - شاید سیکڑوں لوگوں میں ایک آدمی ''لفظ کور'' ہوتا ہو - اِن خال خال لوگوں کو چھوڑ دیجیے - آپ میں سے ہر ایک میں یقیناً یہ صلاحیت ہے کہ لفظوں کو پرکھنے کی عادت ابھی سے ڈال لے اور پھر ذوق و شوق اور غور و فکر کی ایک نئی دنیا خود اپنے اندر موجود پائے -

اس دنیا میں داخل ہونے کے لیے ذہن کی وہ آنکھ کھلی رکھیے جو لفظوں کو دیکھتی ہے۔ اگر آپ کی یہ حس بیدار رہی تو آپ کو ہمیشہ خبر رہے گی کہ لفظ کس طرح صحّت سے ادا ہوتے ہیں اور کس طرح انھیں صحیح جملوں میں ڈھالا جاتا ہے۔

پہلا سبق یہ یاد رکھیے کہ بہت زیادہ رنگین ترکیبوں اور فالتو الفاظ سے پرہیز ضروری ہے۔ مثلاً جہاں کہیں آپ کو "صحّت و عافیت" یا "امن و امان" وغیرہ نوعیّت کی ترکیبیں ملیں، یہ غور ضرور کیجیے کہ کیا یہاں دونوں لفظوں کی ضرورت ہے یا ایک ہی کافی ہوگا؟ مثلاً امن سے مراد ہے فساد کا نہ ہونا اور امان سے مراد ہے کسی کی پناہ میں ہونا۔ اگر صورتِ حال کے لیے دونوں لفظ درکار ہیں تو بخوشی "امن و امان" کہیے ورنہ ایک ہی لفظ کافی ہے۔ یہی حال "صحّت و عافیت" کا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ صحّت ہو اور عافیت نہ ہو۔ یا عافیت ہو اور صحّت نہ ہو۔ پھر کیوں نہ ہم وہی کہیں جو فی الحقیقت مراد ہے؟ سکّہ بند مگر بے معنی لفظوں کے استعمال سے نہ ہمارا بھلا ہوتا ہے، نہ دوسروں کے پلّے کچھ پڑتا ہے۔ آپ نے اردو اخبارات میں اکثر دیکھا ہوگا کہ "فلاں صاحب نے کرسیٔ صدارت کو زینت بخشی" (یا اسی قسم کا کوئی اور کمال کیا)۔ یہ صریحاً لفظوں کا ناواجب استعمال ہے۔ اس جملے کا کسی غیر زبان میں ترجمہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ قول کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔ یا پھر یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ "فلاں صاحب نے صدارت کے فرائض انجام دیے"۔ اگر صدارت کے فرائض یوں انجام دیے جا رہے ہیں کہ اس طرف سے شیر حملہ کر رہا ہے اور اُس طرف سے ریچھ، صدرِ جلسہ اِدھر بھی لڑتا ہے اور اُدھر بھی، اور برابر صدارت کیے جا رہا ہے، تو یہ کہنا درست ہوگا کہ صدارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ورنہ یہ کہیے کہ "فلاں صاحب صدر تھے" اسی طرح خبر

کا عنوان ہوتا ہے : ''گداگر خاتون کا قتل -'' مراد تو ہے ''بھیک مانگنے والی عورت'' کا قتل ، مگر نامہ نگار کو ''خاتون'' اور ''عورت'' کا فرق معلوم نہیں ، اس لیے وہ بلا ضرورت لفظ ''خاتون'' استعمال کرتا ہے - یہ آپ نوجوانوں کی نسل کا کام ہوگا کہ آپ اردو کو اس عذاب سے نجات دلوائیں جو feudal دور سے بطور ورثے کے اسے ملا ہے ، اور جس نے نیک و بد کی تمیز اور حقیقی و غیر حقیقی کی پہچان ہم سے چھین لی ہے - یہ کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہونا ، یہ ہر برگشتہ بخت عورت کا لازماً خاتون ہونا ، اب فراموش کرنا چاہیے ، تاکہ ہم زبانوں کی عالمگیر برادری میں شامل رہ سکیں - اب اس نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا فرض ہے کہ اردو نثر کو اس قابل بنائیں کہ وہ موجودہ حالات پر اسی طرح پوری اترے جس طرح انگریزی اور جرمن اور رُوسی نثر پوری اتر رہی ہے -

یہ تقریر ختم کرنے سے پہلے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ زبان ایک جمہوری ادارہ ہے - اس جمہوری ادارے کے اصول و قوانین قوم کے خواص و عوام کی باہمی رضامندی سے طے ہوتے ہیں ، اور جب ایک بار طے ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی رضا مندی کے بغیر بدلتے نہیں - جب میں نے زبان کو ''جمہوری ادارہ'' کہا تو مراد یہ ہے کہ لفظوں اور محاوروں کے معنی قوم کے کروڑوں افراد نے مقرّر کیے ہیں اور ہماری قوم اور اس کے بزرگوں نے صدیوں میں ان کو وہ صورت دی جو آج نظر آتی ہے - آنے والی نسلیں اس موجودہ صورت میں تبدیلیاں پیدا کریں گی ، جس طرح چار سو برس پہلے ، تین سو برس پہلے ، دو سو برس پہلے کی زبان میں تبدیلیاں ہوئیں ، یا جس طرح گزشتہ صدی کی زبان میں خود ہم نے تبدیلیاں کیں - مگر یاد رکھیے کہ زبان کا روزمرّہ نہ حکومت کے فیصلے سے بدل سکتا ہے ، نہ عوام الناس کے فساد سے - جو کوئی اس آئین کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ آپ اپنا

نقصان کرتا ہے - جب الفاظ و محاورات کو بدلنا ہوتا ہے تو مجھ سے آپ سے پوچھے بغیر چپ چاپ بدل جاتے ہیں - لیکن جب تک یہ بدل نہیں جاتے ان سے بغاوت ہمارے سوچ بچار میں حائل ہوتی ہے اور قومی ترقی" کے میدان کو مصیبت انگیز طور پر ناہموار بنائے رکھتی ہے - لفظوں کا صحیح استعمال قومی زبان سے محبت کا ثبوت ہے - قومی زبان کا احترام اپنے آبا و اجداد کا احترام ہے جنھوں نے ہمارے غور و فکر، اور قوم کے ذہنی تجربات و حسیّات کے اظہار، کے لیے یہ عظیم الشان ذریعہ وضع کیا - ہم لوگوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے کہ اپنی تہذیبی زندگی میں قومی زبان کی تاریخی اہمیت کو پہچانیں کیونکہ ہماری قومی زبان ہماری سرکاری زبان نہیں ہے - یہ کبھی نہ بھولیے کہ لفظوں کا صحیح استعمال انسان کی ترقی کا ضامن ہے، اور قومی زبان سے بے نیاز ہو کر قومیں زندہ نہیں رہتیں -

☆ ☆ ☆

تعلیمی ادارے

اور

قومی اخبارات و نشریّات

اخبارات کا بڑا کام بلاشبہ یہ ہے کہ جمہور قوم کو قتل و غارت، سیلاب و ہلاکت اور صلح و جنگ کے حوادث سے باخبر رکھیں۔ لیکن بعض اور معاملات جو اخبارات میں شہ سرخیاں تو نہیں بناتے، قومی صحافت کی توجّہات گاہ گاہی کے مستحق ضرور ہوتے ہیں۔ ان امور میں شہر کی صفائی، سڑکوں پر آمد و رفت کا قرینہ، قوم کی رفتارِ صحت کا اندازہ، نظامِ تعلیم میں فرد اور جماعت کی ضروریات کے کوائف، اور اسی طرح کے دوسرے نسبتاً کم ہنگامہ خیز مسائل آتے ہیں۔ معلّم اور متعلّم دونوں کو قوم کے ضمیر کے آئینے میں اپنی شبیہ کا جائزہ لینے کی ضرورت رہتی ہے، اور اگر نہیں رہتی تو رہنی چاہیے۔ تعلیمی برادری کے اس جاعتی احساس کو اخبار اور ریڈیو اپنے اپنے انداز میں بیدار رکھتے ہیں۔ اربابِ تعلیم کو لازم ہے کہ تمام ذرائعِ ابلاغ سے (جن میں مخاطبت و ملاقات بھی شامل ہیں) شبانہ روز کام لیتے رہیں۔

ذیل کی فصل میں اسی نوعیت کی تین متفرّق تحریری و تقریری یادداشتیں شامل کی جا رہی ہیں جن کا زمانہ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۶ کی دو سالہ مدت ہے۔ پہلی یادداشت روزنامہ "امروز" (لاہور) کے نام یونیورسٹی کی طرف سے ایک پیغام ہے۔ اخبارِ مذکور نے ۱۹۶۴ میں پنجاب یونیورسٹی کے تعلیمی و انتظامی احوال و امور کے متعلق ایک ہفتہ وار ضمیمہ شائع کرنے کا ارادہ کیا اور راقم الحروف سے فرمایش کی کہ اس سلسلے کے

افتتاحی شمارے کے لیے ایک خاص پیغام لکھ کر بھیجوں ۔ ''امروز'' کا یہ تعلیمی ضمیمہ کسی وجہ سے جاری نہ ہو سکا لیکن میرے لکھے ہوئے پیغام کی ایک نقل محفوظ رہ گئی ۔ یہ پیغام ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

دوسری یادداشت شاید دو ایک سال بعد ریڈیو پاکستان (لاہور) کے لیے قلم بند ہوئی ، اگرچہ اس کی صحیح تاریخِ تحریر محفوظ نہیں ہے ۔ یہ مختصر تقریر غالباً ۱۹۶۵-۱۹۶۶ میں ریڈیو پاکستان کے اِس سوال کے جواب میں نشر ہوئی کہ ''آپ کے لیے زندگی کی سب سے اچھی چیز کون سی ہے ؟''

تیسری یادداشت روزنامۂ ''مشرق'' (لاہور) کے نامہ نگار سے ایک ''انٹرویو'' ہے جو اواخرِ دسمبر ۱۹۶۶ میں دیا گیا اور ۹ جنوری ۱۹۶۷ کے ''مشرق'' میں شائع ہؤا ۔ یہ انٹرویو محمد بشیر صاحب طالب علم گورنمنٹ کالج ، لاہور نے نامہ نگارِ ''مشرق'' کی حیثیت سے لیا ۔ سننے ، سمجھنے اور روایت کرنے میں ایک آنچ کی جو کسر ہمیشہ رہ جاتی ہے وہ تو لامحالہ یہاں بھی موجود ہے ، تاہم یہ ''انٹرویو'' اچھی خبر رسانی کا ایک قابلِ تعریف نمونہ ہے ، اور بعض خفیف تصحیحات کے ساتھ بہ شکریۂ ''مشرق'' یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔

(۱)

روزنامۂ ''امروز'' کے نام پیغام

یونیورسٹی ایک تعلیمی ادارہ ہے لیکن اِس جداگانہ خانقاہی حیثیت کے باوجود ، اُن سرکاری محکموں کی طرح جو خالصتاً امورِ عامّہ سے متعلق ہیں ، یونیورسٹی کو بھی قوم کے سوادِ اعظم سے صحیح رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت رہتی ہے ۔ صحیح رابطہ سچّی اور مفیدِ عام اطلاعات کی اشاعت سے قائم ہوتا ہے ، کیونکہ اس طرح عوام الناس کو شعبۂ متعلقہ کے حدود و ممکنات کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی

ہے - مصیبت یہ ہے کہ روکھے پھیکے حقائق کے بیان سے گرمیٔ بازار کے تقاضے پورے نہیں ہوتے - تعلیمی اداروں کے معمولات کی روداد (آن اضافوں کے بغیر جو زیبِ داستان کا کام دے سکیں) بے آب و رنگ معلوم ہوتی ہے - اس بے آب و رنگ روداد کو جو کبھی اہلِ مدرسہ کی سعیِ مشکور اور بارہا سعیِ نامشکور پر مشتمل ہوتی ہے، اشتعالِ خاطر کے بجائے سکونِ قلب پیدا کرنے کے لیے استعمال کرنا بڑے مجاہدے اور ایثار کا کام ہے -

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ادارۂ "امروز" نے جمہورِ قوم کو یونیورسٹی کے تعلیمی اور انتظامی مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے ایک باقاعدہ مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے - کسی مسئلے کا وسیع پیمانے پر سمجھ لیا جانا اکثر اُس مسئلے کے حل کی راہ بھی متعیّن کر دیتا ہے - اس لیے امید رکھنی چاہیے کہ "امروز" کی یہ کوشش نہ صرف اخباری حیثیت سے کامیاب ہوگی بلکہ اُس سے یونیورسٹی کی کارکردگی پر بھی مفید اثر پڑے گا -

۱۸ نومبر ۱۹۶۴ء

حمید احمد خاں
وائس چانسلر

(۲)

دنیا کی سب سے اچھّی چیز

سوچتا ہوں کہ کس اچھی چیز کو دوسری اچھی چیزوں پر ترجیح دوں! مجھے بزرگوں کی شفقت، عزیزوں کی محبت، دوستوں کی مروّت، سبھی نعمتوں سے حصّہ ملا - لیکن شاید سب سے پرانا اور سب سے پائدار لطف وہ ہے جو اچھّی کتاب کی رفاقت میں نصیب ہؤا - کتابوں کے ساتھ میری دوستی لڑکپن میں قائم ہوئی اور پھر عمر بھر کی دوستی بن گئی - شعر، افسانہ اور ڈراما، تاریخ اور فلسفہ، ان میں

سے ہر موضوع کی کتاب بارہا میرے لیے جاودانی مسرّت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔

گھر کے اندر کتاب ہو اور گوشۂ تنہائی یا کتاب ہو اور ابر و باد، اور گھر کے باہر کتاب ہو اور سبزہ زار و چمن، اس سے بڑھ کر مجھے کوئی اچھی چیز معلوم نہیں ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے میرے لیے نئی کتاب کو چھونا اور سونگھنا بھی ایک لطفِ خاص رکھتا تھا۔ آوزپنسکی کی ''ٹرشیم آرگینم'' سے پہلی ملاقات اِسی قسم کی تھی۔ بریڈلے کی ''شکسپیرین ٹریجیڈی'' سے لطف اندوز ہونے میں دماغ اور حواس کی سبھی قوّتیں برابر کی شریک تھیں۔ غالب و اقبال کے کلام میں جو مزہ ملا، اور اب تک ملتا ہے، وہ غالب کے اس شعر کا مصداق ہے:

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے

ایسا ہی ایک لطف ہے جو مجھے اعلیٰ درجے کے تصورات کا مفہوم نوجوانوں کے ذہن تک پہنچانے کی کوشش میں میسّر ہوا۔ تعلیم و تدریس میرے لیے زندگی کی دوسری اچھی چیز رہی ہے۔ وہ لطف ایک عجیب و غریب لطف ہے جس میں دو دماغ برابر کے شریک ہوں۔ تدریس کی اس کوشش نے خود میرے لیے معنی رسی کے نئے باب کھولے۔ اچھے استاد اور اچھے شاگرد دونوں میرے اس احساس میں شریک ہوں گے کہ تعلیمی زندگی کے بہترین لمحے وہی ہیں جن میں استاد کی فطری اور اکتسابی صلاحیتوں کے طفیل درسگاہ کے در و دیوار ایک نئی روشنی سے جگمگانے لگتے ہیں اور پوری فضا ایک ایسے برقی پیغام سے لرزتی ہے جو استاد کے دل و دماغ سے نکلتا اور شاگرد کی روح تک پہنچتا ہے، یا شاید یہ کہنا بہتر ہو کہ شاگرد کی روح سے نکلتا اور استاد کی روح تک پہنچتا ہے۔

اچھی کتاب گوشۂ تنہائی میں پڑھنا اور اچھی کتاب نوجوانوں کے ساتھ مل کر پڑھنا ، مجھے یہی دو باتیں زندگی کی سب سے اچھی باتیں معلوم ہوئیں ۔

(۳)

روزنامۂ "مشرق" کے نامہ نگار سے انٹرویو

(مرتّبہ محمد بشیر ، گورنمنٹ کالج ، لاہور)

شام کے پانچ بج رہے تھے ۔ مجھے پروفیسر حمید احمد خاں ، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ، سے ملنا تھا ۔ میں نے اِس انٹرویو کا منصوبہ کئی مہینے سے بنا رکھا تھا اور میری آج کی شام اِسی کام کے لیے وقف تھی ۔ میں وائس چانسلر کے سیکرٹری کے کمرے میں محوِ انتظار تھا ۔ اتنے میں یوسف امین تشریف لے آئے ۔ یوسف صاحب میرے ایک مخلص دوست اور ہم مکتب ہیں ۔ اِس انٹرویو کے لیے میں نے انھیں اس لیے بلایا تھا کہ وہ نوٹس لینے میں میری معاونت فرمائیں گے ۔ میں نے پروفیسر صاحب سے اجازت لے کر یوسف امین کو بھی اندر بلا لیا ۔ ان کے آنے پر انٹرویو کا آغاز ہؤا ۔ میں نے بلا تاخیر پہلا سوال کیا :

"آپ کس حد تک ملک کے موجودہ نظامِ تعلیم سے مطمئن ہیں ؟"

پروفیسر حمید احمد خاں نے قدرے توقّف کے بعد کہنا شروع کیا : "جو نظامِ تعلیم اِس وقت رائج ہے وہ برطانوی حکومت نے خاص ضرورتوں کے پیشِ نظر نافذ کیا تھا ۔ جب برطانیہ کا تسلّط ختم ہؤا تو اس طریقۂ تعلیم میں لازماً تغیّر و تبدّل کا عمل ہونا چاہیے تھا ۔ چنانچہ اس میں ایک حد تک تبدیلیاں ہوئی بھی ہیں ۔ مثلاً اسلامیات کو بطور

ایک مضمون کے ہم نے خود شاملِ نصاب کیا ہے ۔ لیکن محض دو ایک نئے مضمونوں کو نصاب میں شامل کرنا کسی نظامِ تعلیم میں تبدیلیاں پیدا نہیں کرتا ۔ ایک بڑی کمی جو ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں ہے ، وہ اس طرح بیان کی جا سکتی ہے کہ نہ اس کی جڑیں پاکستان کی سرزمین میں پیوست ہیں ، نہ اس کے برگ و بار کا تعلق برطانیہ ہی کی آب و ہوا سے ہے ۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ پرانی دنیا کا ہر قومی نظامِ تعلیم صدیوں کے مسلسل ارتقا سے پیدا ہوا ہے ۔ مثلاً انگلستان کو لیجیے ، جہاں خانقاہوں اور گرجاؤں سے مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں بنیں ۔ یہ عمل ایک ہزار برس سے اوپر تک جاری رہا اور آج انگلستان کی پرانی اور نئی یونیورسٹیاں خود بخود ارتقا کے اس عمل کے ذریعے سے تعلیم و تدریس کی ایک پرانی روایت سے وابستہ ہیں ۔

"ہماری بھی ایک تعلیمی روایت تھی ، جو آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں ، بلکہ اس سے بھی پہلے ، شروع ہوئی ۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ہم نے یک بہ یک اس ہزار سالہ روایت سے قطعِ تعلق کیا اور ایک نئی روایت سے ناتا جوڑا ۔ یہ کہتے ہوئے میں تعلیم کے موضوعات ، درسی کتب ، اندازِ تدریس ، استاد و شاگرد کے باہمی ربط اور تعلیم کی زبان ، سبھی کو شامل کر رہا ہوں ۔ ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کی جڑیں کسی لحاظ سے ہماری قدیم قومی روایت تک نہیں پہنچتیں ۔ اس کے برعکس انگلستان ، فرانس اور جرمنی کے نظام ہائے تعلیم کو ان اقوام کی مسلسل تہذیبی روایت سے براہِ راست تعلق ہے ۔

"جو کچھ میں نے ابھی کہا ہے ، اس کی روشنی میں میرا تمہیدی بیان شاید آسانی سے سمجھ میں آ سکے کہ ہماری تعلیم کی بنیادیں نہ برطانیہ کی علمی اور عمرانی روایت پر قائم ہیں ، نہ اپنی علمی اور تہذیبی روایت پر ۔ دنیا کے مہذب ملکوں کو پاکستان اِس لحاظ سے سامانِ عبرت بہم پہنچاتا ہے کہ اِس نے ایک ہزار برس بلکہ اس سے

کچھ زیادہ عرصے کے پیدا کیے ہوئے نظام تعلیم سے منہ موڑ کر تعلیم کے مضامین ، تعلیم کی زبان ، نصابِ درس اور تدریس کے طریقے ایک ایسی قوم سے مستعار لے لیے جس کا تعلق اس کے ساتھ ڈیڑھ دو سو برس سے زیادہ کا نہ تھا ۔

''ہم اپنے بچّوں کو پہلے بارہ برس میں جو کچھ پڑھاتے ہیں ، اُس کا تعلّق تعلیم کی آخری منزل یعنی یونیورسٹی تک یوں تو قائم رہتا ہے کہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم دونوں کا سانچا برطانیہ نے ہمارے لیے تیار کیا ، لیکن تعلیم کے یہ دونوں درجے اُس گہرے ربط سے محروم ہیں جو اِنھیں ہماری قوم کی علمی روایت سے منسلک کر دے ، یا ہمارے کالجوں کو ہمارے قدیم مدارس کی ترقی یافتہ شکل بنا دے ۔ اِسی وجہ سے تعلیمی دنیا میں اساتذہ اور طلبہ دونوں ایک ناآسودگی محسوس کیے بغیر نہیں رہتے ۔ اساتذہ کو گلہ ہے کہ معاشرہ ان کی صحیح قدر و قیمت سے بےخبر ہے اور طلبہ شکوہ سنج ہیں کہ انھیں اپنے اُستادوں کی طرف سے وہ توجّہ اور شفقت میسّر نہیں آتی جس کے بغیر تعلیم ایک کھوکھلا اور میکانکی عمل بن جاتا ہے ۔''

اِس جواب میں وائس چانسلر صاحب نے کتنے ہی تلخ حقائق کے چہرے سے نقاب اُلٹ دی تھی ۔ یہ ایک المناک داستان ہے کہ برطانوی سامراج نے ہمارے افکار کے زاویوں کو بدل کر نہایت بےدردی کے ساتھ ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا ، مگر اس سے زیادہ درد ناک منظر ہماری آزادی کے اُنیس سال پیش کر رہے ہیں ، جن میں ہم پہلے سے کہیں زیادہ مغرب‌زدہ ہو چکے ہیں ۔ عام طرزِ زندگی کے علاوہ اگر ہم اپنے علمی افکار کے سانچوں کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم جب بھی مستقبل کی بابت سوچتے ہیں ، ہمارے پیشِ نظر وہ خوبصورت خطّہ ہوتا ہے جو انگلستان کے نام سے موسوم ہے اور جسے ہم اپنی علمی امنگوں کا مرکز سمجھتے ہیں ۔

ملک کے موجودہ نظامِ تعلیم پر وائس چانسلر کی بے اطمینانی کا اظہار ایک فطری بات ہے ۔ میں نے ان کے نظریات کا قریب سے مطالعہ کرنے کے لیے سوال اٹھایا کہ تعلیم کی ترقی کے بارے میں ان کے پروگرام کے اہم نکات کیا ہیں ؟ اس پر وہ یوں گویا ہوئے :

''اِس سوال کا جواب میرے پہلے جواب مین موجود ہے ۔ ہمیں بتدریج اپنے موجودہ نظامِ تعلیم کو ایک قومی نظامِ تعلیم بنانا ہے ، جس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کا عمل ہماری قومی زندگی کے عام دھارے سے ہٹ کر کوئی ایسی تحریک نہ بنا رہے جسے ہم نے غیروں کی خوشی کی خاطر اختیار کر لیا ہے ، خواہ وہ اغیار نیکی ، پاکیزگی اور ذہانت کے پتلے ہی کیوں نہ ہوں ۔ اگر پڑھنے والا اور پڑھانے والا خود بخود اس احساس میں شریک ہو سکیں کہ دونوں مل کر قومی ترقی کے نصب العین کے قریب آ رہے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ ہم نے ایک قومی نظامِ تعلیم وضع کرنے کی راہ نکال لی ہے ۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال بڑی احتیاط ، بڑی کاوش اور بے حد غور و فکر سے بتدریج پیدا ہو سکتی ہے ۔ میری رائے میں سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک غیر ملکی ذریعۂ تعلیم کو چھوڑ کر کسی قومی ذریعۂ تعلیم کو اختیار کریں ۔ میں اس منزل کو پہلی منزل اس لیے قرار دیتا ہوں کہ میرے نزدیک تحصیلِ علم میں ، استاد اور شاگرد کے باہمی تعلّق کو مستحکم کرنے میں ، اور علمی موضوعات کو قومی روایت سے منسلک کرنے میں ، کسی قومی زبان کا استعمال پہلی اور بنیادی شرط ہے ۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ میں نے اُردو کا نام نہیں لیا ، نہ کسی خاص قومی زبان کے استعمال کی سفارش کی ہے ۔ مغربی پاکستان میں اُردو زبان سے بہتر ذریعۂ تعلیم تصوّر میں نہیں آ سکتا ۔ لیکن خدا نخواستہ ہمیں یہ سہولت میسر نہ ہوتی تو بھی میں پنجابی یا بلوچی یا سندھی یا پشتو یا بنگالی کو بطورِ ذریعۂ تعلیم انگریزی پر ترجیح دیتا ۔ انگریزی زبان کی

بنیادوں میں ہماری قومی زندگی کی حرکت شامل نہیں ہے، لیکن پشتو یا کسی دوسری پاکستانی زبان کی بنیادوں میں ہماری قومی زندگی کا اثر موجود ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں کیوں اُردو کو مغربی پاکستان کے لیے موزوں ترین اور خداداد ذریعۂ تعلیم و تدریس قرار دیتا ہوں۔

''آپ نے میرے تعلیمی پروگرام کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس پروگرام کا آغاز اس شِق سے کیا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی تصوّرات کا استحکام [جس کے بغیر نہ علم سیکھا جا سکتا ہے نہ سکھایا جا سکتا ہے] میرے پیشِ نظر ہے اور اس سلسلے میں معاشرتی اصلاح حبِ وطن اور حبِ اسلام کے نام پر جو کوشش مجھ سے اور میرے رفقائے کار سے ممکن ہے، وہ شب و روز جاری ہے۔''

اب میں نے سوال کیا کہ ''وائس چانسلر کا عہدہ قبول کرنے کے بعد آپ کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان کے مقابلے میں آپ نے اپنے آپ کو کہاں تک کامیاب پایا ہے؟'' اِس سوال کے بعد میں مُتجسّس نگاہوں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوتے دیکھ کر میں ذرا پریشان سا ہوگیا۔ تاہم انھوں نے جواب دیا: ''کوئی اصلاحی کام شدید مزاحمت پر غالب آئے بغیر سرانجام نہیں پاتا۔ ابھی اصلاحی جد و جہد کا مرحلہ طے نہیں ہؤا، اس لیے مناسب ہے کہ میرے کام اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا حساب مستقبل پر اٹھا رکھا جائے۔''

اب میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے پوچھا: ''آپ نے میرے نام مکتوب میں لکھا تھا کہ سائنس میں ہمارا تخلیقی کام اُسی وقت شروع ہوگا جب ہمارے فکر و بیان کے سانچے اپنی زبان میں تیار ہو جائیں گے۔ کیا آپ یہ فرمائیں گے کہ یہ سانچے کب تیار ہوں گے،

اور اس دوران میں ہم کیا کریں گے؟''

پروفیسر صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا: ''یہ سانچے اِس وقت بھی تیار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم دوسروں کے خیالات اور انکشافات پر انحصار کرنے کے بجائے خود سوچنا شروع کر دیں۔ سوچنے کا عمل حقیقی ضروریات کے احساس سے شروع ہوتا ہے اور اگر ہم سوچ بچار سے کوئی نئی بات پیدا کریں گے تو اس کے اظہار پر ہماری اپنی زبان خود بخود پوری اترے گی۔ فکر و بیان کے سانچوں کے لیے کوئی خاص مدت یا تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ اب بھی تیار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اجتہادی سوچ بچار سے کام لیں۔ اور یہ کبھی تیار نہیں ہو سکتے، اگر ہم دوسروں کی مہیّا کی ہوئی معلومات کو اپنا منتہائے نظر قرار دیتے رہیں۔''

میں نے اِس ضمن میں ایک اور سوال کیا: ''کیا یہ ضروری ہے کہ سائنس کا معیارِ تعلیم بلند کرنے کے لیے تمام سائنسی علوم کو اپنی زبان میں منتقل کیا جائے؟''

اس کے جواب میں وائس چانسلر نے کہا: ''یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام علوم کا سرمایہ پہلے اردو میں منتقل ہو اور اِس کے بعد ہم اردو میں سائنسی کام شروع کریں۔ اس وقت انگریزی کو ہمارے نظامِ تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمیں اس زبان میں اِتنی استعداد ضرور حاصل کرنی چاہیے کہ ہم سائنس کی دنیا کے گزشتہ و موجودہ کارناموں سے باخبر رہ سکیں۔ لیکن سائنس کی ہر کتاب اردو میں نہیں ہے تو ہمارے لیے یہ کہاں لازم ہے کہ ہم سیم اور تھور کے کوائف کو اپنی زبان میں بیان نہ کریں۔ اگر بنیادی سائنسی تحقیقات اردو میں ہوتی رہے تو تھوڑے ہی عرصے میں وہ دن خود بخود آ جائے گا، جب اکثر مضامین اردو کے لباس میں موجود ہوں گے۔''

آردو زبان کے بارے میں وائس چانسلر صاحب کے نقطۂ نظر کو دیکھ کر میں نے ایک نازک سوال ان سے پوچھ لیا: ''یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ اپنی زبان کو ابھی تک ملک کی دفتری زبان کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی - اور پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں یہ بات تو خصوصاً زیادہ اہم ہے، کیونکہ آپ آردو زبان کے زبردست حامی ہیں - اس کے باوجود یونیورسٹی کی دفتری زبان اب بھی انگریزی ہے - کیا آپ اس امر پر روشنی ڈالیں گے کہ آپ کو اس بارے میں آخر کیا مشکل در پیش ہے؟''

وائس چانسلر صاحب نے جواباً فرمایا: ''مجھے تسلیم ہے کہ تعلیمی زبان اور دفتری زبان کے درمیان قدرۃً ایک ربطِ باہمی ہے - اِس بنا پر میں دفتری زبان میں انگریزی کے استعمال کو اُسی طرح غلط سمجھتا ہوں جس طرح تعلیم میں - آپ شاید جانتے ہیں کہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ہماری صوبائی حکومت نے گزشتہ سترہ برس سے ایک مجلسِ زبانِ دفتری قائم کر رکھی ہے جہاں کچھ عرصے پہلے بارہ چودہ مترجم کام کر رہے تھے - اس وقت تک مجلسِ زبانِ دفتری نے ہزارہا اصطلاحات کا ترجمہ کر لیا ہے - اب دفتری زبان کو بدلنا آتنا ہی آسان یا مشکل ہے جتنا تعلیم کی زبان کو -

''رہا میرے اپنے دفتری طریقۂ کار کا قضیہ، تو آپ کو شاید معلوم نہیں کہ جہاں یونیورسٹی کے اعلی امتحانات میں انگریزی کے بجائے آردو کے استعمال کا اختیار ہر طالب علم کو دے دیا گیا ہے، وہاں دو برس سے یونیورسٹی کے دفتر میں ہر اہل کار کو کامل آزادی حاصل ہے کہ جب چاہے اپنا کوئی نوٹ یا مراسلہ آردو میں لکھے، بلکہ میں اپنے دفتری رفقا کو ترغیب دیتا ہوں کہ مختلف مسائل کا بیان آردو زبان میں کریں - اس طرح یہ بالکل واضح ہے کہ میں نے دفتری مکاتبت میں انگریزی کے استعمال کو ترک کرنے کا حق

یونیورسٹی کے ہر اہل کار کو دے دیا ہے - میں خود بارہا اس حق کا استعمال کرتا ہوں اور اِس وقت اِس فائل میں اپنے ڈپٹی رجسٹرار کا لکھا ہوا نوٹ آپ کو دکھاتا ہوں (فائل دکھاتے ہوئے جس کی تحریر اُردو میں تھی) لیکن میں کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ انگریزی کے رسمی دفتری انداز تحریر کو لازماً چھوڑ دے - میرا اپنا اندازہ ہے کہ جونہی بڑے بڑے سرکاری دفتروں کی زبان بدلے گی ، یونیورسٹی کے دفتر میں لوگ ملک کے عام دفتری رواج سے خود بخود متاثر ہوں گے -"

یہ پہلے دن کے انٹرویو کی تفصیلات ہیں - دوسرے سوالات اور ان کے جوابات کے لیے میں دوسری بار پھر وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوا - سوال اور ان کے جواب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں -

میں نے ایک نازک تعلیمی مسئلے کی بابت سوال کیا : "جو طریقۂ امتحان ہمارے یہاں رائج ہے ، اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

وائس چانسلر نے کہا : "جو طریقۂ امتحان اس وقت رائج ہے ، وہ قابلیت کی شناخت کا بہترین طریقہ نہیں ہے - لیکن بحالاتِ موجودہ اس کے سوا چارہ نظر نہیں آتا کہ اس طریقۂ کار کو کچھ عرصے جاری رکھا جائے اور اس میں بتدریج اصلاحیں کی جائیں - ہمارے پرانے نظامِ تعلیم میں مغربی نمونے کا کوئی تحریری امتحان نہ تھا - مثلاً جس قسم کی تعلیم سرسید نے اُنیسویں صدی کے اوائل میں حاصل کی اُس میں انگلستانی طرز کا کوئی امتحانی پرچہ نہ تھا - شاگرد پانچ یا دس یا زیادہ برس مختلف اساتذہ سے تحصیلِ علم کرتا تھا اور پھر فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں اپنی قابلیت کا ثبوت دیتا تھا - اب بھی کسی شخص کی قابلیت کو پرکھنے کے لیے اُس کے عمل کو

دیکھنا ضروری ہے ، لیکن عام طور پر ڈگری سامنے رکھ کر لوگ زندگی کے فائدے حاصل کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں ، خواہ علمی قابلیت کے لحاظ سے اور ذاتی طور پر کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے ہوں - جب تک بی - اے - یا ایم - اے - کی ڈگری کسی شخص کی قابلیّت کا قطعی ثبوت نہ بنے ، اُس وقت تک ہم اپنے طریقۂ امتحان کو ناقص ہی قرار دیتے رہیں گے - مگر یہ طریقۂ امتحان اساتذہ کی قلّت اور شاگردوں کی کثرت کی وجہ سے چار و ناچار اختیار کرنا پڑا ہے -''

میں نے اس جواب سے اپنے آپ کو غیر مطمئن محسوس کرتے ہوئے سوال کو ایک اور رخ پر موڑ دیا : ''جن خامیوں کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ، ان کا حل کیا ہے ؟''

وائس چانسلر نے بے تأمّل جواب دیا : ''ان خامیوں کا علاج ہمارے نظامِ زندگی اور نظامِ تعلیم میں بعض بنیادی اصلاحات کے نفاذ سے ہوگا - ہم دفتری کاروبار میں ایک غیرملکی زبان استعمال کرتے ہیں - اس بنا پر چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے لیے ڈگری کا حصول پہلی شرط ہے - غیر ملکی زبان کا یہ استعمال اگر ترک کر دیا جائے تو ڈگری دفتری ملازمت کے حصول کا ذریعہ قرار پانے کے بجائے فضیلت علمی کی علامت سمجھی جانے لگے گی ، جیسی دنیا کے اکثر ممالک میں سمجھی جاتی ہے -

''اساتذہ کی شدید کمی کو پورا کرنے کے لیے صیغۂ تعلیم پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے - میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کی اہمیت دفاع کے برابر ہونی چاہیے -''

میں نے تصویرِ درد بنتے ہوئے وائس چانسلر صاحب سے دریافت کیا : ''ہمارے بہت سے ڈاکٹر ، انجنیئر ، سائنس داں بیرونی ممالک میں سکونت پذیر ہیں ، جب کہ ہمارے عوام کو ان کی خدمات کی اشد ضرورت ہے - آپ کے خیال میں کیا ان لوگوں میں حُبّ الوطنی کے

جذبے کا فقدان ہے یا ہمارے ملکی حالات ہی انھیں صحیح معیارِ زندگی بخشنے میں بے بس ہیں ؟"

وائس چانسلر نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا : "جن اسباب کا ذکر آپ نے اس سلسلے میں کیا ہے وہ دونوں مل جل کر ہمارے موجودہ حالات کے ذمہ دار ہیں ۔ بعض سائنس داں اپنے ملک میں ریسرچ کی سہولتیں نہ پا کر غیر ملکوں میں جا بسے ہیں ۔ دوسری طرف بہت سے قابل پاکستانی غیر ممالک سے واپس آنے پر تیار ہیں ، لیکن انھیں پاکستان میں موجود اہل کاروں کے مقابلے میں دو ڈھائی سو روپے زیادہ تنخواہ دی جائے تو پہلے سے موجود اہل کاروں میں بے دلی بڑھنے لگتی ہے ۔"

باتوں کا جو سلسلہ شروع ہؤا تھا ، اس کے پیشِ نظر میرے ذہن میں چین کا نام اُبھرا ۔ میں نے بر سبیلِ تذکرہ وائس چانسلر صاحب سے پوچھ لیا : "چین کو ہم سے دو سال بعد آزادی ملی تھی ، مگر اس کا شمار آج عالمی طاقتوں میں ہو رہا ہے اور ہماری کیفیت ہنوز روزِ اوّل کی سی ہے ۔ آپ چین کے ساتھ اپنے ملک کا موازنہ کن حقائق کی روشنی میں کریں گے ؟"

پروفیسر صاحب نے سوال کو بغور سنا اور فقط اتنا کہا : "چین کا نظامِ حیات اور نظامِ تعلیم پاکستانی قوم کے نظامِ حیات اور نظامِ تعلیم سے مختلف ہے ۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ہم اپنی زندگی میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کریں گے ، ہمیں چین کی سی ترقی نصیب نہ ہوگی ۔"

میں نے موضوع کو بدلتے ہوئے پروفیسر صاحب سے کہا : "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کی ترقی کا انحصار سائنس پڑھنے والوں کی زیادہ تعداد پر ہوتا ہے ؟"

انھوں نے کہا : "کسی قوم میں سائنسی ترقی اگرچہ ذہین اور

قابل سائنس دانوں کے تخلیقی کام پر منحصر ہوتی ہے لیکن ذہین اور قابل سائنس داں اسی قوم کو نصیب ہوتے ہیں جس کے عوام سائنسی اندازِ فکر اور سائنسی معلومات سے وسیع طور پر واقف ہوں - ہمارے عوام سائنس کے بنیادی تصوّرات سے کوسوں دُور ہیں -''

یہاں کے طریقۂ تعلیم پر وائس چانسلر صاحب کھل کر باتیں کر چکے تھے - جب میں نے کیمبرج کے طرزِ تعلیم کی بابت سوال اٹھایا تو انھوں نے اس سے اپنے ملک کے نظامِ تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے فقط اتنا کہا : ''ہمارا اپنا طریقۂ تعلیم کیمبرج یونیورسٹی کے طریقۂ کار کا مسخ شدہ اور دھندلا سا خاکہ ہے -''

میں نے آرٹس اور سائنس والوں کے مختلف نظریّات کی بنا پر یہ سوال کیا : ''پروفیسر صاحب ! اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ آرٹس اور سائنس کی علاحدہ علاحدہ یونیورسٹیاں قائم کر دی جائیں ؟''

وائس چانسلر نے اس رائے کی مخالفت کرتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ کہا : ''اس سے تعلیم کو نقصان ہوگا - یونیورسٹی کے قیام کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی تعلیم ایک جگہ پر ہو اور ان علوم و فنون کے اساتذہ ایک دوسرے سے استفادہ کریں - سائنس کو موسیقی یا شعر سے قطعی طور پر علاحدہ کر دینا ، سائنس کے لیے بھی بُرا ہے اور شعر و موسیقی کے لیے بھی -''

اسلامی عقائد سے متصادم ایک نہایت اہم تعلیمی مسئلے کو چھیڑتے ہوئے میں نے وائس چانسلر صاحب سے دریافت کرنا چاہا : ''یونیورسٹی میں آپ نے جو مخلوط تعلیم رائج کر رکھی ہے ، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں ؟ اور آپ اسے اپنے معاشرے کے لیے کہاں تک صحت مند اور مستحسن خیال کرتے ہیں ؟''

پروفیسر صاحب نے اس کے جواب میں کہا : ''یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم میں نے رائج نہیں کی ، یہ برسوں پہلے سے موجود تھی

—اُس وقت سے جب یونیورسٹی کی انتظامیہ سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ کسی اسلامی معاشرے میں مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط صحیح نہیں ہے - لیکن موجودہ صورتِ حال میں بھی ہم اس نصب العین کے پیش نظر چند جزوی کوششیں کر چکے ہیں - یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں طالبات کے بیٹھنے کے لیے الگ کمرے مخصوص کیے گئے ہیں - بعض لیکچر روم ایسے ہیں جن میں لڑکیاں پردے کے پیچھے بیٹھ کر لیکچر سنتی ہیں -

"اس احتیاط کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے باوجود میں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھنے کے حق میں نہیں ہوں - آپ ذرا اس صورتِ حال کا جائزہ لیجیے جو پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی رونما ہوئی - شہروں میں بے شمار خواتین ایک دم پردے سے باہر آ گئیں - عورتوں کے لیے خودآرائی اور خود نمائی کے نئے طریقے وضع ہوئے - سڑکوں، کلبوں اور رقص گاہوں میں ہماری عورتیں پہلی مرتبہ نمودار ہوئیں - ایک ایسی سوسائٹی میں، جس نے ایک دم ایک نیا طریقِ زندگی اختیار کر لیا ہے، کسی ایک گوشے کی صورتِ حال بدل دینے سے کیا ہوگا؟ یونیورسٹی سے لڑکیوں کو خارج کرکے بھی سوسائٹی کی موجودہ مخلوط حیثیت، جسے آزاد پاکستان نے فروغ دیا، بدستور قائم رہے گی - ایک مخلوط معاشرے کو تسلیم کرنا مگر مخلوط تعلیم پر اعتراض کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا -"

اب میں نے وائس چانسلر صاحب کے خیالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے سامنے خواتین کی علٰحدہ یونیورسٹی کا مسئلہ رکھ دیا - جس کے بارے میں انھوں نے کہا: "یہ ممکن العمل نہیں ہے - زنانہ یونیورسٹیوں کے لیے علوم و فنون کے محققین کہاں سے آئیں گے جب کہ مخلوط تعلیم کی یونیورسٹیوں میں بھی اُن کا قحط ہے؟ سائنس کے تجربہ خانوں اور سائنسی آلات کا بھی یہی عالم ہے - پھر ایک فاقہ کش

ملک میں نئی یونیورسٹیوں کے نئے کتب خانے وغیرہ بھی ایک الگ مسئلہ بن جائیں گے ۔"

میں نے آخری سوال کیا : "ہمارا نوجوان طبقہ روز بروز مذہب سے دُور ہوتا جا رہا ہے ۔ ان میں صحیح اسلامی روح پیدا کرنے کے لیے کیا آپ کے تعلیمی پروگرام میں کوئی گنجائش موجود ہے ؟"

وائس چانسلر صاحب اس سوال پر مسکرا دیے اور پھر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگے : "تسلیم کہ ہمارا نوجوان طبقہ اسلامی تعلیمات و روایات سے غفلت برت رہا ہے ، لیکن اس صورتِ حال کو محض نوجوان طبقے کا قصور قرار دینا صحیح نہیں ہے ۔ نوجوانوں کے بزرگوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اسلامی تصّورِ حیات سے بیگانۂ محض ہے ۔ پھر یہ بھی غور کیجیے کہ جو لوگ بظاہر اسلام کا نام لیتے ہوئے پائے جاتے ہیں ، وہ خود کس حد تک سچی اسلامی زندگی کا نمونہ ہیں اور ان کی ذات نوجوانوں کے لیے کس حد تک باعثِ کشش ہے ؟ باقی رہا ایک اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کا سوال ، سو جب سے لارڈ میکالے کا تجویز کیا ہؤا نظامِ تعلیم ہم نے قبول کیا ، ہم بتدریج اس منزل سے دُور ہوتے چلے گئے جس کی طرف آپ قوم کو دوبارہ لے جانا چاہتے ہیں ۔ اس نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کا شامل ہونا ہمیں پھر مشرّف بہ اسلام کرنے کے لیے ضروری ہے ۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ہمارے نظامِ تعلیم میں وہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں جن کی ایک آزاد قوم کے نظامِ تعلیم کو ضرورت تھی ۔ تعلیمی زبان اور تعلیمی زبان کے ثقافتی پس منظر کو نوجوان طالب علم کی ذہنی افتاد بنانے میں بڑا دخل ہے ۔ جب تک ہم کوئی ایسی زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار نہ کریں گے جس کا پس منظر اسلامی ہو ، نوجوان طالب علموں کی نگاہیں اسلامی نقطۂ نظر سے بیگانہ رہیں گی ۔"

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی کے طلبہ اور محنت مشقّت کے کام

مدرسے سے یونیورسٹی تک تعلیم کی ہر منزل میں محنت مشقّت کی اہمیّت اب دنیا بھر میں تسلیم کی جاتی ہے۔ کتاب خوانی کے علاوہ، خارجی دنیا میں کوئی معیّنہ کام سرانجام دینا (چھوٹا ہو یا بڑا) طالب علم کی شخصیت کی تکمیل کے لیے بالعموم ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ اس سے قطع نظر، یہ ظاہر ہے کہ اگر اربابِ تعلیم کی رائے میں طبقاتی تفریق سے طالب علم کا محفوظ رہنا مستحسن ہو تو وہ درس گاہ کے نظامِ کار میں محنت مشقّت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور شامل کرتے ہیں۔ اس کے بغیر طلبہ میں محنت کی تکریم کا احساس پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کا معاشرہ ہر کہ و مہ کی تعلیم کا معاشرہ ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے)۔ اس لیے مسلمانوں کے نظریۂ تعلیم میں اگر دماغ کی محنت کے ساتھ ہاتھ کی محنت کی گنجائش نہ ہو تو یہ نظریہ اسلامی نظریۂ تعلیم ہونے کی حد تک بر خود غلط ہوگا، کیونکہ تعلیم اگر سب کے لیے ہے تو اس میں کسی نہ کسی حد تک ہاتھ کی محنت کا شامل ہونا عملی طور پر ناگزیر ہے۔

میرا اپنا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ معلّم و متعلّم اگر کسی بامقصد جسمانی کاوش میں ایک دوسرے کے رفیق نہ ہوں تو کسی ذہنی کاوش میں بھی رفاقت کا پورا حق ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ طالب علم کی اخلاقی تربیت کے علاوہ، عقلی تربیت بھی کسی نہ کسی حد تک، اس قسم کے معاشرتی کام میں اُستاد شاگرد کے اشتراک سے وابستہ ہوتی ہے۔ اتفاق سے میں فطرۃً مدرس ہی نہیں، ایک کارکُن بھی ہوں، جس کے لیے ہاتھ سے کام کرنا (اپنا کام ہو یا دوسروں کا کام) باعثِ انشراحِ خاطر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامیہ کالج اور پنجاب یونیورسٹی میں میری صدارت کے گیارہ برس (۱۹۵۸ - ۱۹۶۹) بارہا اس طرح

کے موقعے پیدا کرتے رہے کہ اساتذہ و طلبہ مل کر کالج کے کسی شکستہ حصے کی تعمیر اور صفائی کا دن مناتے یا یونیورسٹی کی طرف سے، معماروں اور مزدوروں کی طرح، کسی کارِ خیر کی مہم پر نکل جاتے۔ مگر یونیورسٹی میں کبھی کبھی یہ صورت بھی پیش آتی کہ میں قصور یا سیالکوٹ جا کر رضاکارانہ مشقّت کرنے والوں کے جیش میں شامل ہونے سے محروم رہ جاتا، حالانکہ اس نوعیت کی تقریبات کا افتتاح میں خود کیا کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر ذیل کا پیغام لکھ کر بھیجا گیا۔

پیغام

(سماجی بہبود کیمپ، قصور، کے افتتاح کی تقریب پر)

۲۵ جون ۱۹۶۵ء — پنجاب یونیورسٹی، لاہور

میں اپنے اُن دوستوں اور عزیزوں کو مبارک باد کا پیغام بھیجتا ہوں جو آج حدّتِ گرما سے بے پروا ہو کر خدمتِ خلق کی مہم شروع کرنے کے لیے رضاکارانہ طور پر جمع ہوئے ہیں۔ میرا جی بہت چاہتا تھا کہ میں اس نیک کام کے آغاز میں اِن عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خود بھی شامل رہوں مگر بعض مجبوریوں نے مجھے آج لاہور سے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ تاہم میرے احباب و اعزّہ یقین رکھیں کہ جسمانی علاحدگی کے باوجود میرا دل ان کے ساتھ ہے۔ خدا نے چاہا تو میں چند ہی روز میں خود حاضر ہو کر انھیں ذاتی طور پر مبارک باد دینے کی مسرّت حاصل کروں گا۔

گزشتہ ایک سو برس سے ہم پر یہ اُفتاد آ پڑی ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ہماری قوم کے علم اور عمل کے درمیان ایک خلیج حائل کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوئی کہ ہماری تعلیمی زبان اور ہمارا تعلیمی نصاب ہماری اپنی اخلاقی روایت سے قطعاً بے تعلق

ہوگئے - نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ طبقہ قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر ایک علاحدہ جماعت بن گیا جسے عوام الناس کے دکھ درد سے بے خبر رہنے کے باعث صحیح اخلاقی شعور میسّر نہ رہا -

ایک ہی قوم کے مختلف حصوں کے درمیان علاحدگی کی خلیج کو پاٹنا اساتذہ اور طلبہ کا بنیادی فرض ہے - ہمیں ایک طرف اپنے نصابِ تعلیم نیز تعلیم و تدریس کی زبان میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنی ہیں اور دوسری طرف ایک متوازی حرکت کے ذریعے سے طلبہ کو عملی طور پر نیک مقاصد کی تکمیل اور خدمتِ خلق کی راہ میں مشقّت برداشت کرنے کے جذبے سے وابستہ کرنا ہے - اس موقع پر کوئی شخص شاید کہے کہ یہ ایک بظاہر حقیر سی کوشش ہے لیکن یقین مانیے کہ آج کی دھوپ میں آپ کا جو پسینہ بہے گا وہ آپ کی روح کی طہارت کا سامان ہے - آپ آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئی راہ کھول رہے ہیں - آپ دنیا کو بتا رہے ہیں کہ علم سے عمل کی تفریق ممکن نہیں ہے اور پڑھے لکھے لوگ صرف کیمیا کے گُر یا واقعات کی تاریخیں ہی یاد نہیں رکھتے ، نیک عمل بھی کرتے ہیں - جن قوموں میں پڑھے لکھے لوگ نیکو کاری پر اصرار نہیں کرتے وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں -

میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی ہمتوں میں برکت دے اور آپ کی اس چودہ روز کی مشقّت کو دوسرے نوجوانوں کے لیے جو یہاں موجود نہیں ہیں ، شمعِ ہدایت بنائے -

حمید احمد خاں

وائس چانسلر

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی کے کنبے کی ایک جھلک
دورانِ جنگ میں

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارتی فوج نے ناگہاں لاہور پر چڑھائی کر دی - تین مہینے کی تعطیلات ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں - اس لیے سربراہانِ تعلیم کو فوری طور پر متعدّد اہم فیصلے کرنے پڑے جن میں سے بعض کا ذکر مقالۂ ذیل میں آتا ہے - پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بھی صورتِ حال کے پیشِ نظر چند انتظامات بہ سرعتِ تمام پورے کیے - ان میں سے کچھ تو یونیورسٹی کی املاک کی حفاظت کے لیے ضروری تھے اور کچھ یونیورسٹی کے کنبے کے جان و مال کے بچاؤ کے لیے - مثلاً یونیورسٹی لائبریری کی گران قدر مطبوعہ اور قلمی کتابوں کو، تہ خانوں اور بم باری سے محفوظ جگہوں میں، جلد از جلد منتقل کرنے کی تدبیر کی گئی - سائنس کی تجربہ گاہوں میں قیمتی آلات اور آتش گیر کیمیائی مواد کو دشمن کی ہوائی تاخت سے بچانے کے لیے مناسب صورتیں اختیار کی گئیں - بجلی کے مہیا نہ رہنے کی صورت میں (اور یہ کیفیت مسلسل کئی دن تک پیش آ سکتی تھی) طلبہ کے اقامت خانوں (یعنی شہر کے متفرّق مقامات پر کرائے کی کوٹھیوں وغیرہ) میں پانی کی بہم رسانی کے متبادل انتظام پر توجہ کی گئی - مقیم طلبہ میں مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے طلبہ بھی تھے، جو قدرۃً خاص توجہ کے مستحق تھے - ان دنوں کی ایک دلچسپ کارروائی یونیورسٹی کے تدریسی اور انتظامی عملے کے وہ مشاورتی اجلاس تھے جو کثرت و تواتر سے منعقد ہوتے رہے - ان جلسوں میں ان گنت معاملات زیرِ بحث آئے جن میں گولہ باری سے بچنے کے لیے یونیورسٹی کے دفاتر اور شعبہ جات کے گرد ٹیڑھی ترچھی خندقوں کی کھدائی کا مسئلہ

بھی تھا - سینٹ ہال کے مقابل کے چمن کی کھدائی اسی قسم کی کسی مشاورت میں طے ہوئی تاکہ خطرے کا سائرن ہو تو سینٹ ہال کے چمن میں کھدی ہوئی یہ خندق دورانِ کار میں بطور جائے پناہ کے کام آ سکے - ایک اور اہم مسئلہ جنگ میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور اُن کے کنبوں کی سلامتی کا مسئلہ تھا - یونیورسٹی کے اساتذہ کے مکانات شہر بھر کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے - دشمن کے ہوائی حملے بالعموم رات کے اندھیرے میں ہوتے تھے - اس لیے جان کو ایک روگ اُن دنوں یہ لگا رہتا تھا کہ ریلوے لائن کے متّصل یا چھاؤنی کے نواح یا ماڈل ٹاؤن کے اطراف میں رہنے والے اساتذہ کے علاقوں پر اگر حملہ ہو گیا تو اُنھیں اور ان کے لواحقین کو مدد پہنچانے کی کیا صورت ہوگی - ''نئے کیمپس'' کی بستی ابھی آباد نہیں ہوئی تھی - وائس چانسلر نے سب اساتذہ کے گھروں کے پتے بالتفصیل مہیا کر لیے تھے اور اُن تک رات کے اندھیرے میں پہنچنے کے لیے موٹر کا ''کرفیو پاس'' بھی حاصل کر لیا تھا، تاکہ بلا تاخیر نقل و حرکت میں بوقتِ ضرورت روک ٹوک نہ ہو اور یونیورسٹی کا کوئی رکن یونیورسٹی کی بری بھلی مدد سے محروم نہ رہ جائے - وائس چانسلر کا اپنا قیام بیگم روڈ پر تھا، مگر اُس کے کان اطرافِ شہر کی گھن گرج اور چیخ پکار پر لگے رہتے تھے کہ خدا جانے کب، کس طرف سے ہوائی بم باری کی خبر آ جائے -

ذیل کی تقریر ریڈیو پاکستان (لاہور) سے ستمبر ۱۹۶۵ میں نشر ہوئی -

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ عالمِ انسانی کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ''یوں بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں کوئی چیز بری لگے اور وہ چیز (حقیقت میں) تمھارے لیے اچھی ہو'' - خدا کے اس قول کی سچّائی جس طرح اس ستمبر کے مہینے میں پورے پاکستان کے ضمیر پر روشن ہوئی ہے، شاید ہی کسی لکھی ہوئی تعبیر یا تفسیر سے ہو

سکتی - ۶ ستمبر کی صبح کو ہمیں معلوم ہؤا کہ بھارت کے چھپے ہوئے ہاتھ کا خنجر رات کے اندھیرے میں ہماری شہ رگ کے قریب پہنچ گیا تھا - وہ امن پسند لوگ ، جو کسی نہ کسی مفید کام میں لگے ہوئے تھے ، قدرۃً برہم ہوئے - میرا اپنا شمار بھی اُن لوگوں میں تھا جنھیں امن توڑنے والا یہ نیم شبی حملہ ناگوار ہؤا - لیکن صبح کے آفتاب نے دن کی منزل ابھی طے نہیں کی تھی کہ مجھ پر اور لاہور کے بے شمار شہریوں پر یہ راز کھلا کہ یہ موقع بے چین ہونے کا نہیں ہے - یہ موقع قومِ پاکستان کو خدا کا شکر بجا لانے کی ایک دعوت ہے - ہمیں اب معلوم ہؤا کہ دشمن کے گھناؤنے حملے کے ساتھ ہی اللہ کی رحمت ہمیں چاروں طرف سے پکارتی ہوئی پہنچی کہ آؤ اور صفیں باندھ کر حق کی راہ میں ایک ہو جاؤ ! خدا کا شکر ہے کہ ہمارے تمام اختلافات اور تفرقے ایک دم ختم ہو گئے اور پشاور سے چاٹگام تک قوم اتنی ہی متّحد اور منظّم اور مضبوط نظر آئی جتنی آج سے اٹھارہ اُنّیس برس پہلے تھی - ہمیں اب معلوم ہؤا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی چیز بُری لگے اور وہ چیز حقیقت میں ہمارے لیے اچھی ہو -

جس دن بھارت نے شرارت کی ، اُس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد پنجاب یونیورسٹی کو تین مہینے کی تعطیل کے بعد کھلنا تھا - میرے بعض رفقا نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم اس مطلب کا ایک اعلان شائع کریں کہ یونیورسٹی اور اُس کے تمام تعلیمی شعبے ۱۳ ستمبر کو ضرور کھلیں گے - میں نے فوراً جواب دیا : ”یونیورسٹی ۱۳ ستمبر ہی کو کھلے گی ، مگر یہ اعلان تو تین مہینے ہوئے ہم کر چکے ہیں“ - یہ میں نے اس لیے کہا کہ میرے نزدیک اس قسم کا اشارہ کہ بھارت کی شرارت سے ہماری زندگی کے معمولات میں فرق آ سکتا ہے ، ہمارے اساتذہ و طلبہ کے دماغ کی صحت اور ضمیر کی راستی کی

توہین ہے - چنانچہ یونیورسٹی وقت پر کھلی ، ایم - اے - اور آنرز میں نئے طلبہ کا داخلہ ہؤا ، اور پرانے طلبہ کو ٹائم ٹیبل کے مطابق لیکچر دیے گئے -

مگر اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہؤا - طلبہ کی ٹولیاں صدرِ پاکستان کے فرمان پر لبّیک کہہ کر تحفّظِ پاکستان فنڈ کے لیے اپنے ہم جاعتوں کی جیبیں خالی کرانے کے لیے نکل کھڑی ہوئیں - طلبہ کے انبوہ مشیرِ امورِ طلبہ کے دفتر کے سامنے جمع ہو گئے کہ مجاہدینِ پاکستان کے لیے اپنے خون کا عطیہ دینے والوں کی فہرست میں نام درج کرائیں اور اگر ممکن ہو تو شہری دفاع کی اُن کمیٹیوں میں شامل ہوں جو حملے کے دنوں میں لاہور کی پُر امن زندگی کو معمول پر رکھنے کے لیے قائم کی جا رہی ہیں - جب میں نے یونیورسٹی کے اساتذہ سے درخواست کی کہ مہینے میں ایک دن کی تنخواہ تحفّظِ پاکستان فنڈ کے لیے وقف کر دیں تو ایک نہیں کئی آوازیں برسرِ اجلاس اُٹھیں کہ یہ ایک دن کی تنخواہ کیا چیز ہے ، ہم اپنی تنخواہ کا دس فیصد یا اِس سے زیادہ حصہ کٹوانے کو تیّار ہیں - چند روز بعد ایک صاحب نے (جن کی تنخواہ چار سو کے قریب ہے) مجھے لکھا کہ میں اُنھیں اُن کی تنخواہ میں سے ایک سو روپے ماہوار تحفّظِ پاکستان فنڈ میں وضع کرانے کی اجازت دوں - میں نے جواب میں اُن سے کہا کہ بھائی ! میری غیرت اور میرے صدہا رفقائے کار کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ تم ہم سب کے بچاؤ کے لیے اپنے آپ پر اپنے حصے سے اس قدر زیادہ بوجھ ڈالو - جب یہ نوبت آئے گی کہ ہم سب (یا ہم میں سے اکثر) اپنی ماہوار آمدنی کا چوتھا حصہ قومی بچاؤ کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر میں اجازت دوں گا کہ اب اگر چاہو تو خدا کی راہ میں مجھ سے اور میرے رفقا سے ایک قدم آگے رہو -

لیکن جہاں اُن دنوں ایثار اور جذبۂ خدمتِ قوم کے ان مظاہروں سے میں بارہا متاثر ہوتا رہا ، وہاں ایک واقعہ ایسا بھی پیش آیا جس نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر رقّت طاری کر دی ۔ میرے ایک غیر ملکی رفیق نے ، جو برطانوی شہری ہیں ، تحفّظِ پاکستان فنڈ کے لیے پچاس پونڈ کا عطیہ بھیج کر ثابت کر دیا کہ جہاں حق و باطل کا معرکہ درپیش ہو وہاں خدا کا خاندان نسل و رنگ کی تمیز میں نہیں پڑتا اور ثابت کر دیتا ہے کہ ہم سب آدم کی اولاد ہیں ۔ میرے برطانوی دوست[1] نے پچاس پونڈ کے چیک کے ساتھ مجھے ایک خط بھی بھیجا ۔ اس کا ایک حصہ میں اصل انگریزی میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں :

Dear Vice-Chancellor,

My wife and I have been discussing your appeal for the defence and other funds and our attitude to the whole question.

We feel most strongly that our home in Lahore has been defended by the young men of Pakistan from an invader who does not have the moral sense to distinguish between mere legality and true justice. This is therefore, no time for mere neutralism.

اب آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں اس مبارک گھڑی کو پاکستان کی معراج کی ساعت بلکہ عالمِ انسانی کی معراج کی ساعت کیوں کہتا ہوں ۔ ہم اہلِ لاہور کو فخر کرنا چاہیے کہ ہم اِس عظیم الشان ساعت کو دیکھنے کے لیے موجود تھے ۔

یاد رکھیے ، یہ جنگ وحشیانہ قوت کے بل پر نہیں جیتی جائے گی ۔ بالآخر حق و صداقت کے نام کا ڈنکا بجے گا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی نے لاہور کی زبان بن کر سال ہا سال پہلے

۱۔ یہ برطانوی دوست اُس وقت یونیورسٹی کے صدرِ شعبۂ ارضیات تھے ۔

اعلان کر دیا تھا :

کبھو کرے گا حفاظت مری خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا
خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ
تو ذرّہ ذرّۂ عالم ہے آشنا میرا
غرور اُنھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب اُن کا ہے اور خدا میرا

☆ ☆ ☆

آزاد کشمیر کے ایک ملحقہ کالج کی نئی عمارت کا افتتاح

آزاد کشمیر کی متعدد درس گاہیں پنجاب یونیورسٹی کے دائرۂ الحاق میں شامل ہیں - چنانچہ وائس چانسلر پر لازم آتا ہے کہ وہ پنجاب سے باہر جا کر آزاد کشمیر کے ملحقہ کالجوں کے حالات سے بھی باخبر رہے - جنوری ۱۹۶۶ میں جب گورنمنٹ کالج میر پور کی طرف سے دعوت آئی کہ خود آ کر کالج کی نئی عمارت کا افتتاح کروں تو میں نے یہ دعوت بہ خوشی قبول کی - یہ وہ زمانہ ہے جب منگلا بند کی تعمیر کے بعد پرانا میر پور غرقاب اور نیا میر پور آباد ہو چکا تھا - نئے میر پور کے مکانات کے ساتھ سرکاری کالج کی نئی عمارت بھی تیار ہو چکی تھی - ۶۵ع کی جنگ کے بعد ستم رسیدہ کشمیری مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد میر پور کے اردگرد بے گھر پڑی تھی اور انھیں ضروریات زندگی ابھی مہیا کی جا رہی تھیں -

میں ۲۳ فروری ۱۹۶۶ کی شام کو میر پور پہنچا - کالج کے افتتاح کی تقریب اگلی صبح ۲۴ فروری ۱۹۶۶ کو منعقد ہوئی -

محترم پرنسپل صاحب ، اساتذۂ کرام ، عزیز طلبہ و طالبات ، خواتین و حضرات ،

آج کی تقریب میں میری شرکت کا ذکر کرتے ہوئے پرنسپل صاحب نے جو کلمات میرے متعلق فرمائے ، ان کا سرچشمہ میری ذات کے بجائے خود اُن کی بے پایاں محبت اور خلوص کا جذبہ ہے - اسی بنا پر انھوں نے یہاں میری حاضری کو ایک مہتم بالشان واقعہ قرار

دیا ہے - میں اُن کی عنایات اور مہمان نوازی کے لیے بے حد ممنون ہوں اور ان سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ در اصل شکریہ تو مجھے ادا کرنا تھا کہ آپ نے اس مبارک تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دے کر مجھے اس عظیم درس گاہ کے دیکھنے اور اس کے اساتذہ و طلبہ سے ملنے کا موقع بہم پہنچایا - یوں تو عام حالات میں بھی میرا یہاں آنا میرے لیے عین مسرت کا باعث ہوتا لیکن اب جب کہ آپ ایک بہتر فضا میں منتقل ہو کر ایک نئے عزم کے ساتھ کام کرنے کی تیاری کر رہے ہیں میری دلی مسرت کا یہ احساس کچھ زیادہ گہرا ہو گیا ہے - مجھے یقین ہے کہ اس فضا میں علم و دانش کی تحصیل ذہنی کشادگی اور تزکیۂ نفس کے بے شمار نئے مواقع فراہم کرے گی - میں آپ سب خواتین و حضرات کو اس نئی عمارت کے تیار ہو جانے پر دلی مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو وہ عقلی اور اخلاقی خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے جن کی بجا آوری تعلیم و تعلّم کا حقیقی مقصود و منتہا ہے -

خواتین و حضرات ، تعلیم گاہوں میں اساتذہ و طلبہ کے یک جا رہنے سے حُسنِ تربیت کے لیے جو ساز گار ماحول میسر آتا ہے اس میں معیارِ تعلیم کا خود بخود بلند ہو جانا ایک مسلّمہ حقیقت ہے - پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعمیرات کے جو نئے منصوبے مرتّب کیے گئے ہیں ، ان میں یہ بات خصوصیت سے مد نظر رکھی گئی ہے کہ طلبہ کے علاوہ اساتذہ کو بھی قیام کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں - پشاور اور کراچی کی یونیورسٹیوں میں اس منصوبے کو عملی صورت دی جا چکی ہے اور پنجاب اور سندھ کی یونیورسٹیوں میں یہ منصوبہ تکمیل کے مختلف مرحلوں سے گزر رہا ہے - آپ سب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اس اہم تعلیمی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے مناسب عملی اقدامات کیے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس

مثال کو دوسرے تعلیمی ادارے مشعل راہ بنائیں گے۔

مجھے آپ سے یہ بات سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کی درس گاہ میں اساتذہ اور طلبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی سرگرمیوں کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے، نیز یہ بات باعث مسرت ہے کہ اس ادارے میں طالبات بھی زیرِ تعلیم ہیں اور وہ بھی تہذیبی سرگرمیوں میں برابر کا حصہ لیتی ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں، دیدہ ور اور بیدار دل اساتذہ کے زیرِ اثر، طلبہ کے ساتھ طالبات کی موجودگی سے تہذیبِ نفس کی احترام آمیز فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس فضا میں طلبہ اپنے طرزِ عمل کو شرافت اور شائستگی کے اعلیٰ معیاروں کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز اس صورتِ حال میں طالبات پر ایک دہری ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ انھیں نہ صرف اپنے ذہنوں کو علم سے منور کرنا ہے، بلکہ اپنے نسوانی کردار کی پاکیزگی سے ایک ایسی مثال قائم کرنی ہے جو طلبہ پر ایک صحت مند اخلاقی اثر ڈال سکے۔

مالی وسائل کی کمی کے باوجود آپ نے اپنی درس گاہ میں تعلیم و تدریس کا جو صحیح معیار قائم کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ سچ یہ ہے کہ دولت کی فراوانی اور تحصیلِ علم کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ہرگز نہیں ہے۔ دولت سے دنیا میں سب کچھ خریدا جا سکتا ہے سوائے علم کے۔ علم مال و دولت سے نہیں دل کی لگن سے حاصل ہوتا ہے۔ گزشتہ ایک سو برس میں برّ عظیم کے مسلمانوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی قومی درس گاہیں محدود مالی وسائل کے باوجود وہ علمی اور تہذیبی خدمت انجام دیتی رہیں جسے ہم آج بڑے فخر سے پاکستانی فکر اور پاکستانی تہذیب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اداروں سے قطعِ نظر، خود طالب علموں کی زندگی سے متعلق میرا ذاتی مشاہدہ عرصۂ دراز سے یہ ہے کہ اچھے طالب علم اکثر و بیشتر وہ

نوجوان ہوئے ہیں جنھیں برق و فانوس کی روشنیاں میسّر نہیں آئیں اور جنھوں نے کڑوے تیل کے دیے جلا کر علم کے خزانوں تک رسائی حاصل کی -

خواتین و حضرات ، یہ بات روز مرہ کی پہچانی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں آج کل ایک خاص طرح کی ذہنی ناآسودگی کے آثار ملتے ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذہنی آسودگی جس کی طلب ہم میں سے ہر ایک کو ہے ، صرف اُس نظامِ معیشت میں حاصل ہو سکتی ہے جو اسلام کے معاشرتی انصاف کی بنیاد پر قائم ہو - جب تک ہم اپنے معاشی نظام میں ایسی انقلابی تبدیلیاں پیدا نہ کریں گے جو اسلام کے تصورِ معیشت سے مطابقت رکھتی ہوں ، تعلیم یافتہ طبقہ اُسی ذہنی ناآسودگی کا شکار رہے گا جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے - یقین کیجیے کہ اس طرح کے نظام کی تعمیر کیے بغیر ہماری تعلیم گاہوں میں علم و تہذیب کی وہ شمعیں روشن نہیں ہو سکتیں جن کی شعاعیں اسلامی دنیا سے نکل کر مغرب کو روشن کرتی رہی ہیں - تعلیم کے موجودہ نظام میں اُستاد اُس وقار سے محروم ہو گیا ہے جو فقر اور درویشی کے باوجود اسے قوم کی معاشرتی زندگی میں حاصل تھا - تعلیم کے نظام میں ایک بار پھر اُسی صورتِ حال کی ضرورت ہے جس میں اُستاد کو اُس کا کھویا ہؤا وقار از سر نو مل سکے - اگرچہ ہم سب کو مل جل کر اس طرح کا نظام پیدا کرنا ہے لیکن اگر آپ میری جسارت معاف فرمائیں تو میں گزارش کروں گا کہ یہ نظام اور یہ فضا معلّمین کی جماعت خود اپنے لیے پیدا کرے گی - میری رائے میں کسی اور کے بجائے یہ کام اساتذہ کے اپنے کرنے کا ہے - کوئی شخص جو سیرت و کردار اور علم و فضل کے لحاظ سے قابل تعظیم نہیں ہے ، شاگردوں میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو ہم اپنے اساتذہ کے لیے پیدا کرنا چاہتے ہیں - استاد کو معاشرے میں وقار حاصل کرنے کے لیے دراصل

اپنی عزتِ نفس بحال کرنے کی ، اپنے ساتھ انصاف کرنے کی ، اپنا فرض پہچاننے کی ، ضرورت ہے ۔

یہ بات عام طور سے کہی جاتی ہے کہ ہمارے معاشرے کا استاد غریب ہے ۔ لیکن یہ بات کہتے ہوئے اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں استاد ایک نسبتاً غریب شخص ہوتا ہے ۔ سچ پوچھیے تو یہ بات صرف ہمارے زمانے کے لیے مخصوص نہیں ، اُستاد زندگی کے ہر دور میں مالی حیثیت سے غریب ہی رہا ہے لیکن اُس کی اصل دولت اور ثروت اس کی وہ تکریم ہے جو اس کے اعلیٰ کام کی بنا پر اسے ہمیشہ حاصل رہی ہو ۔ تکریم کا یہی احساس استاد کو اپنی نظر میں معزّز اور محترم بناتا ہے اور اِسی احساس کا عکس لازماً اُن لوگوں پر پڑتا ہے جن سے اُسے زندگی میں سابقہ رہتا ہے ۔

پرنسپل صاحب ، آپ نے اپنے خطبے میں بجا طور پر یہ فرمایا ہے کہ آج کل طالب علم عموماً سیاست کی الجھنوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی مجالسِ اتحاد علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بجائے سیاسی رہنمائی کو اپنا فرض سمجھنے لگتی ہیں ۔ اس سلسلے میں مجھے عرض کرنا ہے ، اور میں یہ بات جب بھی موقع ملے کہتا ہوں کہ کسی تعلیمی ادارے کی مجلسِ اتحاد مزدوروں کی یونین ہرگز نہیں ہوتی ۔ مغربی دنیا میں بھی ، جہاں کے ہر دستور کی تقلید اتفاق سے ہم پر فرض ہوگئی ہے ، طلبہ کی مجالس اپنی سرگرمیوں کو علمی اور تہذیبی مشاغل کے لیے وقف رکھتی ہیں ۔ البتہ انھیں تقریروں اور مباحثوں کے ذریعے سے زندگی کے مسائل کے متعلّق اظہارِ خیال کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے ۔ اپنی بات اپنے بڑوں تک پہنچانے کے لیے جلوس نکالنا اور نظم و نسق کی قوتوں سے نبرد آزما ہونا میرے نزدیک طالب علموں کا شیوہ ہرگز نہیں

ہے - یہ راستہ انتشار اور تخریب کا راستہ ہے - اس راستے پر چلنے والے اپنے اصل راستے سے بھٹک کر ہلاکت اور بربادی کے ویرانے کی طرف نکل جاتے ہیں - اس لیے طالب علموں سے جو مجھے ہمیشہ اپنے گھر کے بچوں کی طرح عزیز رہے ہیں ، میری مشفقانہ استدعا ہے کہ وہ اپنے آپ کو عملی سیاسیات کی الجھنوں میں ڈالے بغیر حصولِ علم کا وہ فریضہ انجام دینے میں مصروف رکھیں جو اُن کا حقیقی منصب ہے کہ یہ چیز صرف اُن کے اپنے مستقبل کے لیے نہیں بلکہ قوم اور ملک کے مستقبل کے لیے بھی ضروری ہے - عزیزانِ من ، مجھے یقین ہے کہ آپ کے پرنسپل صاحب اور آپ کے اساتذہ قدم قدم پر آپ کو یہ بتا سکیں گے کہ کس طرف چلنا مفید ہے اور کدھر کا رخ کرنا مضر — لیکن یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ استاد اور شاگرد اپنے آپ کو ایک ہی برادری ، ایک ہی خاندان کے افراد سمجھیں — اور یہ صورتِ حال اس ماحول میں پیدا ہونی بہت آسان ہے جس کی ابتدا آپ آج کے دن کر رہے ہیں - اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب و کامران کرے اور آپ کو سچے مسلمانوں کی زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے -

☆ ☆ ☆

آستاد اور شاگرد کے عقلی و جذباتی تعلّق کا نفسیّاتی جائزہ

یہ گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے جلسۂ عطائے اسناد و انعامات کا خطبۂ صدارت ہے۔ تاریخِ تقریب : ۲۰ مارچ ۱۹۶۶ء۔

جناب پرنسپل صاحب ، اساتذۂ کرام ، عزیز طلبہ ، حضرات ،

جب میں نے اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دلی شکریے اور مسرّت کے احساس سے قبول کی تو اس کا سبب پرنسپل صاحب کے ساتھ میرے دیرینہ روابط کے علاوہ اس کالج کے اساتذہ و طلبہ کا وہ محبت آمیز بلاوا بھی تھا جو انھوں نے پرنسپل صاحب کے توسّط سے مجھے بھیجا۔ لیکن ایک اور کشش مجھے اس وجہ سے ہوئی کہ یہ تقریب فی نفسہٖ ایک نو عمر کالج کا پہلا جلسۂ عطائے اسناد ہے، جس میں مجھ سے کہنہ سال مدرّس کی حاضری بجائے خود ایک خاص لطف رکھتی ہے۔ حضرات ، تعلیمی دنیا کے مجتہد میرے بعض قدامت پسندانہ نظریات پر کبھی کبھی چیں بجبیں ہو جاتے ہیں ، لیکن اپنی تہذیبی روایت کی پاسداری کے باوجود میں بھی دراصل اتنا ہی جدت شناس ، نو نواز اور تازہ کار ہوں جتنے وہ لوگ جو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ، آندرے ژید اور پیران دیلو کا دم بھرتے ہیں ، اور ٹیلی ویژن اور ٹیوسٹ اور سپوٹنک اور لا دینیت کا نام لے کر جیتے ہیں۔ ترقی کا ہر قدم جو قوم کو منزلِ مقصود کے قریب لے جائے ، اور ہر وہ انقلاب جو ایک بہتر زندگی کا پیغام لائے ، میری رگ و پے میں بھی حرارت

کی وہی لہر دوڑا دیتا ہے جس کے اثر سے میرے نوجوان سامعین میں سے ہر ایک کا دل اپنی اپنی با وقار عبائے فضیلت کے اندر دھڑک رہا ہے - پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ آپ کے جواں سال کالج کے جواں سال اساتذہ و طلبہ کی یہ محفل مجھے کشاں کشاں لاہور سے جوہر آباد لے آئی -

جناب والا ، یہ فضا جو ہجوم خلائق کی آلودگیوں سے پاک اور فرسودہ رسم پرستی کے تہ بر تہ جالے کی گھٹن سے ابھی تک آزاد ہے ، بلاشبہ تعلیم و تعلّم کی صحیح فضا ہے - یہاں نئے انداز فکر اختیار کرنے کی راہیں ابھی ارزاں چالاکیوں اور ذہانت کش ہتھکنڈوں نے بند نہیں کیں - یہاں ذہن کے تموّج کے لیے کچھ نہ کچھ گنجائش ابھی باقی ہے - اپنی اِس بے بہا دولت کی حفاظت کیجیے - یہ نہ ہو کہ بڑے شہروں کی وبائیں جو استاد اور شاگرد کے ضمیر میں شریفانہ محنت کی خواہش اور دیانت داری سے حاصل کیے ہوئے درجہ و مقام کی طلب کو گھن کی طرح کھائے جاتی ہیں ، آپ کی اس پاک و صاف فضا کو مسموم کر دیں - اگر آپ اپنے کالج میں کام کی لگن اور علمی راست روی کو معیار فضیلت قرار دینے کی روایت قائم کر سکے تو یقین رکھیے کہ آپ نہ صرف اپنے آپ کو گرد و پیش کے ہلاکت بار جراثیم سے محفوظ کر لیں گے بلکہ ساتھ ہی ملک و قوم کی ایک بڑی خدمت بھی سر انجام دیں گے -

حضرات ، اگرچہ اس وقت میری توجہ کا مرکز میرے وہ نوجوان احباب ہیں جو تحصیلِ علم کے بعد میدانِ عمل میں نکلنے والے ہیں ، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ معروضات اساتذۂ کرام کے لیے بھی وقف کروں جنھوں نے سند پانے والی اس شاندار جماعت کو تیار کیا - سچ پوچھیے تو اس معاملے میں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان تفریق کرنا عملاً محال ہے ، اور آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اساتذہ سے بات کرتے

کرتے میرا روئے سخن خود بخود طلبہ کی طرف پھر گیا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ تعلیم و تعلّم بھی فنونِ لطیفہ کے انداز کا ایک فنّ شریف ہے۔ یہ فن جس واسطے میں کام کرتا ہے، وہ واسطہ پتھر اور رنگ اور آواز سے کہیں زیادہ لطیف و نازک اور پگھلے ہوئے لوہے سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد انسانی شعور سے ہے جس کی صورت گری فنِ تعلیم کا خاص موضوع ہے۔ جو لوگ اس فنّ شریف کا صحیح ذوق رکھتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ انسانی شعور کے واسطے میں یہ فنکاری جس کا ذکر میں کر رہا ہوں، اپنا خاص لطف اور اپنا خاص اجر رکھتی ہے۔ تعلیم کی دنیا کا فنکار سقراط کی طرح جان دے دیتا ہے لیکن اپنے فن سے، جو اس کے لیے بمنزلۂ تلاشِ حقیقت ہے، دست کش نہیں ہوتا۔

حضرات، آپ کو معلوم ہے کہ تعلیم کی تاریخ چھ ہزار برس پیچھے تک جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تاریخِ انسانی کے سب سے پہلے معلّم حضراتِ انبیا تھے، اور اب بھی معلّمی میں پیغمبری کا ایک جزو شامل ہے۔ جو معلّم اپنے کام کو محض ذریعۂ معاش سمجھتا ہے، وہ اپنے بنیادی شرف اور اپنے پیشے کی قدیم تریں روایت کو جھٹلاتا ہے۔ ڈھائی تین ہزار برس گزرتے ہیں کہ تعلیم کے مضمون کا دنیوی حصہ بتدریج نمایاں ہؤا اور اس کے ساتھ اجرت پر تعلیم دینے کی روایت شروع ہوئی۔ پھر بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس نئے پیشہ ورانہ انداز تعلیم نے تعلیمی دنیا کی قدیم تر تبلیغی روایت کو یکسر ختم کر دیا۔ یہ سلسلہ افلاطون و ارسطو سے غزالی اور ابنِ رُشد تک اور قرونِ وسطیٰ کے اساتذہ سے شبلی و اقبال تک بدستور قائم رہا۔ آج کی دنیا میں بھی ایسے معلّمین موجود ہیں جو اپنے مشاہرے کی مقدار سے بے نیاز ہو کر بلند تریں مقاصدِ حیات سے

لو لگائے ہوئے ہیں - با ایں ہمہ مجھے اس وقت استاد اور شاگرد کے باہمی تعلق کے روحانی پہلوؤں پر زور دینا مقصود نہیں ہے - میں یہاں اس نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس پر تعلیم و تعلّم کے عمل کی بنیاد ہے -

جناب والا ، عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عملِ تعلیم کی ماہیت صرف یہ ہے کہ معلّم پیہم کوشش سے اپنا علم مُتعلّم کے ذہن کے اندر یوں ڈالتا ہے جیسے سقّا اپنی مشک کا منہ کھولے اور کسی شخص کا پیالہ پانی سے بھر دے - ذرا غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ استاد کی فاعلی اور شاگرد کی انفعالی حیثیت کا یہ تصوّر عملِ تعلیم کے ساتھ انصاف نہیں کرتا - دراصل اس عمل میں شاگرد کی حیثیت محض انفعالی نہیں بلکہ استاد کے برابر فاعلانہ ہے ، اگرچہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ استاد و شاگرد دونوں کی فاعلیت کا انداز جدا جدا ہے - کیفیت کے اس فرق کے باوجود ، حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک مشترک سرگرمی میں حصہ لے رہے ہیں - دونوں کی کامیابی ایک دوسرے کے تعاون پر منحصر ہے - دونوں میں سے ایک کو غائب کر دیجیے تو دوسرے کا وجود باقی نہیں رہتا - یہ میں اس لیے عرض کرتا ہوں کہ افہام اور تفہیم اپنی اصلیّت کے لحاظ سے ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں - یوں دیکھیے تو یہ بالکل واضح ہو جائے گا کہ دو فریق جن میں سے ایک معلّم ہے اور دوسرا متعلّم ، ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے دو مختلف سمتوں سے سرگرمِ عمل ہیں - لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کی سرگرمی دوسرے کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی - دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے - اس قسم کی اور مثالیں بھی زندگی کے کاروبار میں موجود ہیں ، جیسے خرید و فروخت ، داد و ستد ، سوال و جواب - ان صورتوں میں سے ہر ایک کے لیے دو فریق درکار ہیں اور گو ان مثالوں میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک

فریق دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سرگرم ہے، پھر بھی اُن کے باہمی رشتے کو فاعلیّت اور انفعال کے تقابل سے تعبیر کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے۔ استاد کے سبق کو مداری کے کرتبوں سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی، جنھیں شاگرد الگ تھلگ بیٹھا ہؤا دیکھتا رہتا ہے۔ استاد کا سبق در حقیقت سورج کی روشنی کے رخ پر ایک اور دریچہ کھولنے کی کوشش کا نام ہے جس میں معلّم اور متعلّم دونوں مل کر زور لگاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ سقراط کا طریق تعلیم تنہا استاد کے لکچر پر نہیں، استاد و شاگرد کے مکالمے پر مبنی تھا، یعنی استاد سوال کرتا تھا اور شاگرد جواب دیتا تھا اور اسی سوال و جواب کے ذریعے سے تعلیم کا عمل پورا ہوتا تھا۔ اب آپ اس سقراطی طریق کار کا تصور کیجیے کہ استاد اپنے شاگرد کی ذہنی حالت کا اندازہ کر کے ایک مناسب سوال وضع کرتا ہے جس پر ذرا سا غور کر کے شاگرد کا ذہن مناسب جواب تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک استاد اور شاگرد عقلی صداقت کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ جاتے۔ اِس عمل میں معلّم و متعلّم دونوں کی فکری کاوش برابر کی شریک ہے، خواہ معلّم کے فکر کی نوعیت رہبرانہ اور متعلّم کے فکر کی نوعیت مقتدیانہ ہی کیوں نہ ہو۔ استاد و شاگرد کے درمیان کامل اشتراکِ عمل کی حد یہ ہے کہ استاد اُسی صورت میں اچھا استاد بنتا ہے جب اُسے اچھے شاگرد میسر ہوں، اور اچھے شاگرد صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں اچھا استاد ملا ہو۔ تعلیم کے پورے عمل کی اساس یہ ہے کہ متعلم کا ذہن پیش نظر مسئلے کی اہمیّت پر حاوی اور اس کے صحیح حل کی تلاش پر قادر ہو جائے۔ اچھے استاد کا ذہین شاگرد سے صحیح سوال کا صحیح جواب نہ پانا بالکل ایسا ہے جیسے مقناطیس لوہے کے ٹکڑے کو حرکت میں نہ لا سکے یا چقماق اور فولاد کی رگڑ سے شرار پیدا نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ تعلیم کے عمل میں معلّم و متعلّم کا عقلی تعاون، جس کی نفسیاتی حقیقت پر میں نے اس قدر زور دیا، کن حالات میں بروئے کار آتا ہے؟ میں اب اس جذباتی تعاون، یا موانست، کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے بغیر عقلی تعاون کی طرف ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہوتا ہے۔ قدرت کے کارخانے کا یہ انتظام بے وجہ نہیں ہے کہ احساس و ادراک کے اولیں سبق ہمیں ماں کی محبت کی روشنی میں ملتے ہیں۔ اور انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ علم کا سرمایہ جمع کرنے کی یہ پہلی شرط بچپن سے لے کر بڑھاپے تک قائم رہتی ہے۔ ہمارے بہترین اُستاد وہ ہیں جنھوں نے علم کے خزانے لٹانے سے پہلے ہم پر اپنی محبت کے خزانے لٹائے۔ یقین مانئے کہ یہ محض ایک شریفانہ طریق کار کی تلقین کی کوشش نہیں، ایک امر واقعی کا بیان ہے۔ استاد کے لیے لازم ہے کہ اپنے شاگردوں میں سے ہر ایک فردِ بشر کو بطور ایک فردِ بشر کے پہچانے، اور یہ پہچان بجز سچی ہمدردی کے حاصل نہیں ہوتی۔ دلی شفقت اور موانست کے بغیر استاد اور شاگرد کا رشتہ، خواہ اس میں کتنی ہی مقدار علم داخل کی جائے، کھوکھلا اور مصنوعی رہتا ہے۔ تعلیم کی بنیاد لفظوں کے ڈھیر پر نہیں، ایک ذاتی تعلق پر قائم ہوتی ہے، اگرچہ بعد میں اسی ذاتی تعلق کی بنیاد پر الفاظ و معلومات کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ بچہ اپنے والدین کی مدد سے گرد و پیش کی دنیا کو پیدا کرتا ہے لیکن خود اپنی ذات کی تخلیق میں اسے استاد سے مدد ملتی ہے۔ اچھا استاد شاگرد کے ظاہر سے واقف ہونے پر اکتفا نہیں کرتا، وہ اس کے باطن کو سمجھتا ہے اور اس کی پوری شخصیت کا احاطہ کرتا ہے اور اس طرح خود اپنے نفس کو بھول کر ایک اور نفسِ انسانی کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ خود فروشی اور خود فراموشی کے اس عمل میں استاد اپنے صحیح مقام و منصب کو پہنچتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں

شاگرد استاد سے سیکھتا ہے اور استاد شاگرد سے۔

اے اساتذۂ کرام! میں نے یہ سب تفصیل ایک فریاد کی حیثیت سے آپ کے اور آپ کے طلبہ کے سامنے پیش کی ہے۔ اگر آپ اپنے طلبہ کے لیے وہ طریقِ کار مہیا نہیں فرمائیں گے جو تعلیم و تدریس کی پہلی شرط ہے، یعنی استاد و شاگرد کے درمیان کامل عقلی تعاون اور اشتراکِ عمل، تو قدرت کا تقاضا، جو ایک نفسیاتی حقیقت کے طور پر مقدر ہو چکا ہے، کس طرح پورا ہوگا؟ اور پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ قدرت کا یہ اٹل تقاضا تبھی پورا ہوگا جب آپ عملِ تعلیم کی دوسری ناگزیر شرط، اپنے طلبہ کے ساتھ کامل جذباتی تعاون، کا لحاظ کریں گے۔ پس اگر آپ کی روش انسانی فطرت کے ان مقررہ اصولوں سے ہٹی ہوئی ہے تو آپ نظامِ تعلیم میں ایک ایسا خلا پیدا کر رہے ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت پاٹ نہیں سکتی۔ قومیں معاشرے کے اس خلا کو پُر کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ خدا کے لیے قوم کی تعلیم میں اس بڑھتی ہوئی خلیج کو استاد و شاگرد کے درمیان حائل نہ رہنے دیجیے ورنہ یاد رکھیے کہ ہماری سرحدوں کے باہر سے کسی غنیم کا حملہ ہماری زندگی کو خطرے میں ڈالے یا نہ ڈالے، ہمارا تعلیمی خلفشار ہمیں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا۔ میں نے بارہا یہ کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ ایشیا کی قسمت کا فیصلہ ایشیا کی یونیورسٹیوں میں ہوگا۔ ہمارے ممالک ہمارے طلبہ کی روشنیٔ ضمیر اور قوتِ عمل سے زندہ رہیں گے یا پھر انھی طلبہ کے ہنگامۂ تخریب و انتشار سے پارہ پارہ ہو کر فنا ہو جائیں گے۔ اے اساتذۂ کرام، آپ اپنے طلبہ کو اپنے دل میں جگہ دیجیے تاکہ تعلیم کی راہیں، اور اس ذریعے سے قومی تعمیر کی راہیں، ہموار ہو سکیں۔ وقت کے اندھیرے کی جو غلیظ چادر مجھے دُور سے نظر آتی ہے، میں آپ کو اس سے ڈرا نہیں رہا ہوں، بلکہ آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ خود آپ کے ہاتھ

میں وہ شعاعِ نور ہے جو کوندے کی لپک بن کر اس سیاہ چادر کو تار تار کر دے۔

اور اب ، اے میرے عزیز طلبہ ، جو آج زندگی کے ایک نئے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں ، خدا آپ کے اس سفر کا آغاز و انجام مبارک کرے۔ آپ کے سفر کی ہر منزل میں میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے نیک مقاصد میں ، اور ان مقاصد کی تمام تفصیلات میں ، کامیاب و بامراد کرے۔ اس وقت آپ کو خدا حافظ کہتے ہوئے نصیحت کا ایک کلمہ آپ سے کہنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ بطور زاد راہ اسے دامن میں باندھ سکیں۔ یہ نصیحت ایک سیدھی سادھی بات ہے جسے درست باور کرنے میں آپ کو مطلق تامل نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب تک آپ اپنی زندگی کے نصب العین کا کوئی واضح تصور قائم نہیں کر لیں گے ، آپ کے لیے اس تصور کی عملی تشکیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اگر آپ نے مدرسے اور کالج کے زمانے میں اپنے معلمین کے ساتھ کامل ذہنی تعاون کیا ہے ، اور ان کی عزت و محبت آپ کے دل میں جاگزیں رہی ہے تو زندگی کے نصب العین کا واضح تصور قائم کرنا آپ کے لیے دشوار نہ ہوگا۔ یہ دشواری اس انسان کو پیش آتی ہے جس نے صحت مندانہ تعلیمی ماحول میں پرورش نہیں پائی۔ یہ صحت مندانہ تعلیمی ماحول ، جیسا میں نے ابھی وضاحت کی تھی ، محض استاد کی کوشش سے قائم نہیں ہوتا ، اس میں شاگردوں کے اشتراک عمل کے بغیر فلاح کی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ کا ذہنی تعاون اور دلی لگاؤ اگر استاد کو نصیب نہیں ہؤا تو خود آپ اپنی مدد سے محروم رہے ہیں۔ گزشتہ دس بیس برس سے ہمارے ملک میں طلبہ کی تنظیمیں کچھ اس انداز سے حرکت میں آ رہی ہیں جیسے علم کی دولت کو استاد پر یلغار کر کے چھیننا ضروری ہو گیا ہے۔ علم کی دولت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب

تک استاد اور شاگرد باہمی تعاون کی فضا میں بیٹھ کر ایک مشترک کوشش کے ذریعے سے تعلیم کے عمل کی بنیادی صورت کی تکمیل نہ کریں - تعلیمی مسائل کے حل میں طاقت کا استعمال بے معنی ہے - مزدوروں کی یونین سرمایہ دار سے اپنے حقوق منوانے کے لیے ہڑتال اور دوسرے حربوں سے کام لے تو بات سمجھ میں آتی ہے - لیکن مجلسی زندگی کے متعلق طلبہ کی یونین کوئی مزدور یونین نہیں ہے جس کی راہِ نجات صرف مقابلے اور مجادلے میں ہو - ہنگامہ و خلفشار میں شمعِ معرفت روشن نہیں ہوتی ، بجھ جاتی ہے - ہمارے لیے وہ دن بُرا ہوگا جس دن ہمارے مدرسہ و خانقاہ میں شمع معرفت بجھ گئی اور معلّم و متعلّم کا صحیح رشتہ ٹوٹ گیا - تعلیم و تعلّم کی بھلائی نیم سیاسی نیم مزدور یونینوں کے فسادات سے نہیں ، بلکہ دلوں کے اتحاد اور ذہنوں کے اشتراک سے پیدا ہو گی - فساد اور بغاوت کے جراثیم اگر فضائے گرد و پیش کو آلودہ کر رہے ہیں تو آپ پر کچھ اور زیادہ لازم ہے کہ اپنے نئے کالج میں ایک ایسے نئے دستور ، ایک ایسی نئی رسم و راہ کا آغاز کریں کہ مریض ذہن بھی دیکھ کر صحت یاب ہو جائیں -

درائے نو ، جرسِ نو ، دل و ارادۂ نو
نوا بزن کہ قدم می‌زنم بجادۂ نو

☆ ☆ ☆

قومی آزادی کی حفاظت
اور
تہذیبِ نفس

یہ مقالہ اسلامیہ کالج ،گوجرانوالہ ، کے سالانہ جلسۂ عطائے اسناد و انعامات منعقدہ ۱۴ اپریل ۱۹۶۶ع میں بطور خطبۂ صدارت پڑھا گیا -

محترم پرنسپل صاحب ، اساتذۂ کرام ، عزیز طلبہ ، حضرات ،

آپ سے خطاب کرنے کے لیے اٹھا ہوں تو اپنے دل کو خوشی سے معمور پاتا ہوں - گوجرانوالہ میرے دوستوں اور عزیزوں کا شہر ہے - اس شہر کی کاروباری چہل پہل نے میری اپنی زندگی کی بے شمار یادوں کو آب و رنگ دیا ہے - اسی آسمان و زمین نے حافظ آباد اور احمد نگر اور وزیر آباد کے مضافات میں دو سو برس سے اوپر تک میرے آبا و اجداد کے پیہم آباد و برباد ہونے کا منظر دیکھا ہے - الغرض جسم و جان کا ہر رشتہ مجھے اس شہر اور اس شہر کی آبادی سے وابستہ کرتا ہے - میرا یہاں حاضر ہونا یوں ہے جیسے کوئی شخص لمبے سفر کے بعد اپنے گھر میں واپس آئے - ہجوم کے شور و شغب کو پیچھے چھوڑ کر میں تھوڑی دیر اپنے بھائیوں کی آنکھوں کی روشنی میں بیٹھنے کے لیے یہاں پہنچا ہوں - پھر کیا عجب ہے کہ میں نے پرنسپل صاحب کی اجازت سے اپنی ان گزارشات کے لیے انگلستان کی قومی زبان کو پسِ پشت ڈال کر پاکستان کی قومی زبان

کو پسند کیا ہے ۔

حضرات ، منجملہ اُن روابط کے جو مجھے آج سہ پہر دست و پا بستہ یہاں لائے ہیں ، ایک ربطِ خاص ایسا ہے جس کا ذکر ذرا وضاحت سے کرنا چاہتا ہوں ، اور وہ ہے اس کالج کے پرنسپل کی ذاتِ گرامی کے لیے میرا دیرینہ اور مخلصانہ جذبۂ احترام[1] ۔ تیس برس سے زیادہ ہوئے جب میں نے ملک احمد حسین صاحب کی اخلاقی فضیلت کا شہرہ سنا ۔ میں خود ایک غیر معروف اور نا آزمودہ کار مدّرس تھا اس لیے مجھے اپنی ارادت مندی کے برملا اظہار کا کوئی جواز نظر نہ آیا ، اور یوں ملک صاحب کو میری نیاز مندی کی خبر تک نہ ہو سکی ۔ آج کی مبارک تقریب میرے لیے لب کشا ہونے کا پیغام لائی ہے اور میں ایک ایسے ماہرِ تعلیم کو ہدیۂ تحسین پیش کر رہا ہوں جس نے اپنی تمام عمر ایک مردِ مجاہد کی طرح علم کے صراطِ مستقیم پر سفر کرتے گزاری ، جس نے اصول کی محکم بنیادوں پر اپنی زندگی کی تعمیر کی اور اپنی قوّتِ ایمانی کو اپنا سب سے بڑا سہارا بنایا ، جس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل رہے اور جس کی شانِ درویشی ہر دنیوی اعزاز سے بے نیاز رہ کر اپنے نفسِ مطمئنہ میں اپنا انعام پاتی رہی ۔ خوش نصیب ہیں وہ شاگرد جنھیں ایسا خود شناس اور وضعدار اُستاد نصیب ہؤا ۔

اور اب ، جناب والا ، میں بڑی مسرت سے اُن عزیز طلبہ کو مبارکباد دیتا ہوں جنھیں آج بی ۔ اے/بی ۔ ایس سی ۔ کی اسناد ملیں ، اور اچھے نمبر پانے ، کھیل کا اعلیٰ معیار قائم کرنے یا

۱۔ ملک احمد حسین صاحب جو اُس وقت گوجرانوالے کے اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے ، سال ہا سال تک فلسفے کے اُستاد رہے تھے ۔ اُن کی پُر سکون شانِ درویشی بزرگانِ تعلیم کی دنیا میں بھی علم و عمل کا ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کرتی تھی ۔

خدمتِ خلق بجا لانے پر انعامات تقسیم ہوئے - یہ انعامات میرے نزدیک اُن اساتذہ کو بھی وصول ہوئے جن کی کوشش سے یہ کامیابیاں رونما ہو سکیں - اور پھر جب یہ لحاظ کیا جائے کہ آپ کا کالج سُست اور غبی طالب علم پر بھی اپنا دروازہ بند نہیں کرتا، تو امتحان میں آپ کے نتائج خاص طور پر قابلِ قدر معلوم ہوتے ہیں - مجھے خوب اندازہ ہے کہ یہ کارنامے آپ اس لیے سرانجام دے سکے کہ آپ کو نہ صرف کالج کے اساتذہ کا بلکہ کالج کی انجمنِ انتظامیہ کا بھی پورا تعاون حاصل ہے - میں آپ کے اِن تمام رفقا کو جن کا تعاون آپ کو میسّر رہا خلوصِ دل سے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں، کیونکہ گو آپ کے ساتھ تعاون اُن کے فرائض میں داخل تھا لیکن واقعہ یہی ہے کہ ہماری نو آزاد قوم میں ابھی ہر کسی کو اپنا فرض ادا کرنے کی عادت نہیں ہوئی -

آپ نے کالج کی سالانہ رو داد میں ضمناً یہ ذکر بھی کیا ہے کہ عربی کی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہے - مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ عربی زبان ہماری تہذیبی اور دینی زبان ہے اور اس سے واقف ہوئے بغیر ہمارے لیے نہ تو علمِ دین سے کماحقّہ، استفادہ ممکن ہے اور نہ ہم اپنی تہذیب کے سر چشموں سے صحیح تعلّق پیدا کر سکتے ہیں - مگر تہذیبی و دینی پہلو سے قطع نظر، میں جس امر کی طرف آپ کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عربی کی تحصیل دُنیوی طور پر بھی عنقریب گھاٹے کا سودا نہیں رہے گی - یہ سب کو علم ہے کہ پاکستان کی قومی اور بین الاقوامی حکمت عملی بتدریج اُس منزلِ مقصود کی طرف جا رہی ہے جہاں عربی ممالک کے ساتھ ہمارے تعلّقات لازماً قریب تر ہو جائیں گے - اس وقت، بلکہ اُس وقت سے پہلے، وزارتِ امورِ خارجہ کو عربی داں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت پڑے گی - بہت جلد پاکستان کو ایسے

لوگوں کی تلاش ہوگی جو عربی کی شستہ تحریر کے علاوہ عربی بول چال پر بھی قدرت رکھتے ہوں - جو نوجوان اِس وقت عربی سیکھنے پر توجہ کریں گے آنھیں چند ہی سال میں اندازہ ہوگا کہ آنھوں نے دین و دنیا دونوں کے ساتھ نفع کا سودا کیا ہے -

حضرات ، آج کی تقریبِ سعید میں جہاں میں آپ سب کی خوشی میں دل و جان سے شریک ہوں ، وہیں میرے ذہن میں کچھ ایسے سوالات خود بخود پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلّق میرے آن نوجوان عزیزوں کے مستقبل سے ہے جنھوں نے آج کے جلسے میں انعامات پائے یا جنھیں فارغ التّحصیل ہوکر آج اِس کالج سے رخصت ہونا ہے - اِن سوالات کے جواب اِن عزیزوں کے پاس ضرور ہوں گے ، اور اگر نہیں ہیں تو ہونے چاہئیں - مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے سوالات اِن عزیزوں کو پیش کروں اور اگر ہو سکے تو ان کے دل و دماغ کو اپنے سوالات کے مناسب جواب تلاش کرنے میں مدد دوں -

عزیزان من ، آپ میں سے بعض نے کھیلوں میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا اور انعام پائے - کھیلوں میں مہارت آپ نے کیوں حاصل کی ؟ انعام پانے کے لیے ؟ لیکن انعام بجائے خود کاغذ کا محض ایک پرزہ ہے - اِس لیے ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اِس کاغذ کے پرزے کا یہ مفہوم کہ آپ نے بدن کے رگ و ریشہ کا زور لگایا اور دوسروں سے بڑھ کر رہے ، آپ کو عزیز ہے - میں پھر پوچھتا ہوں کہ اس سے کیا فائدہ ؟ آپ اس کا شاید یہ جواب دیں کہ دوسروں سے بہتر ہونے میں ایک لطف ہے ، یا شاید یہ کہیں کہ اعلی درجے کے کھیل سے بدن کی صحت بہتر ہوتی ہے -

میں آپ کے اس جواب کو تھوڑی دیر کے لیے گفتگو سے الگ رکھ کے ایک اور سوال کرنا چاہتا ہوں - یہ جو برسوں کی دماغ سوزی کے بعد آپ نے بی - اے یا بی - ایس سی - کی سند پائی ، اس سے کیا

حاصل ہوگا؟ آپ میں سے بعض جواب دیں گے کہ اس سے ہمیں اچھی ملازمت ملے گی اور بہتر پوشش و خوراک میسّر آئے گی۔ دوسرے شاید یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی مدد کرنی ہے اور یہ سند اُن کے لیے روپیہ کمانے میں مدد دے گی۔ بعض کا جواب شاید یہ ہو کہ ہمارے ملک کو ابھی انجینئروں اور ڈاکٹروں کی اشد ضرورت ہے، ہم اپنے لیے ایک ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں قوم کی بھی بہتری ہو اور ہماری بھی۔ شاید ایک آدھ جواب یہ بھی ہو کہ سند تو محض ایک علامت ہے۔ مدرسے اور کالج میں یہ سالہا سال گزارنے سے اصل غرض تحصیل علم تھی کیونکہ علم کے ذریعے سے ہمارے لیے بہتر انسان بننے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

حضرات، اب میں آپ کو ان سب جوابات کا تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ذرا غور فرمائیے تو ظاہر ہوگا کہ کھیلنے کی مشقّت ہم اس لیے بخوشی برداشت کر لیتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر ثابت کرنا چاہتے ہیں یا اپنی جسمانی صحّت کو بہتر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ تعلیم کے معاملے میں بھی یہی جذبۂ مسابقت یا ذہنی ترقی کی یہی لگن کارفرما ہے، اگرچہ اس کے ساتھ مالی منفعت کی آرزو بھی شامل ہو جاتی ہے جو کبھی تو محض اپنے نفس کی بہتری تک محدود ہوتی ہے، اور کبھی اپنے خاندان، اور کبھی اہل ملک، بلکہ بنی نوع انسان، کی بہبود تک وسعت حاصل کر لیتی ہے۔ الغرض کھیل ہو یا خدمت خلق، تحریر ہو یا تقریر، ہماری ہر کاوش کا منتہا و مقصود کسی نہ کسی قسم کی بہتر صورت حال کا پیدا کرنا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہمارا مطالعہ محض تضیع اوقات اور ہمارے لیکچر محض سمع خراشی کا سامان ہیں۔

پس اے میرے عزیزو، اس میں شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم سب اپنی تعلیمی کوششوں کے ذریعے سے اپنے لیے

اور دوسروں کے لیے ایک بہتر زندگی کی تلاش میں مصروف ہیں۔ تعلیم اسی وقت تک بامقصد اور بامعنی ہے جب تک وہ ہمیں ایک بہتر زندگی سے قریب تر لے جانے میں مدد دیتی ہے۔ تعلیم کی دنیا کے اندر یا باہر ہر وہ عمل جس کا رخ زندگی کی کسی بہتر صورت کی تخلیق کی طرف نہیں ہوتا، تعلیم کی، اور اصلاح احوال کی، نفی کرتا ہے۔ مثلاً مدرسے کا استاد جب غیظ و غضب کے عالم میں بید اٹھا کر شاگرد کی پیٹھ پر مسطر کھینچتا ہے، یا کالج کا زندہ دل طالب علم جب لیکچر کے دوران میں اپنے ناموجود دوستوں کی حاضری لگوانے کا ڈھونگ رچاتا ہے، یا یونیورسٹی کا پروفیسر رات بھر تاش کی بازی لگانے کے بعد لیکچر کی تیاری کیے بغیر جب اپنے طلبہ کے سامنے آتا ہے اور اپنے جہل کو علم کی نیم کامیاب شکل دینے کی کوشش کرتا ہے، تو آپ تسلیم کریں گے کہ مدرسے کا استاد ہو یا کالج کا طالب علم یا یونیورسٹی کا پروفیسر، ان میں سے ہر ایک کا عمل تعلیمی زندگی کے مقاصد کے منافی ہے کیونکہ اس سے کسی بہتر صورت حال کے پیدا ہونے کی موہوم سی توقّع بھی وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مدرسے کا بید پسند استاد اور کالج کا فریب کار طالب علم اور یونیورسٹی کا تاش نواز پروفیسر اگر دریا کے کنارے بیٹھ کر پانی کی لہریں گننے یا فرش خاک پر کسی پرِ کاہ سے لکیریں کھینچنے میں اپنا وقت صرف کرتے تو وہ یقیناً ایک بہتر مشغلہ تھا۔

جناب والا، اصلاح حال کے لیے انسانی معاشرہ تعلیم و تعلّم کے علاوہ اور ذرائع بھی استعمال کرتا ہے۔ ان میں سب سے اہم تنظیمِ حکومت اور تنظیمِ معیشت ہیں۔ لیکن کیا تعلیم، کیا حکومت اور کیا معیشت، ہر ایک کی تنظیم کے لیے فکر و عمل کی آزادی پہلی شرط ہے۔ محکوم قوم کی تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی زندگی اس لیے تباہ ہوتی ہے کہ آزادی کی وہ نعمت جو بہتر زندگی کی تلاش کی پہلی شرط ہے،

غلاموں کو میسّر نہیں ہوتی ۔ کشمیر کے مسلمانوں کا تصوّر کیجیے ۔ یہ ملک ایک قومی اکثریت کا علاقہ ہے جہاں کی آبادی ہماری طرح ایک مستقل تہذیبی و نظریاتی حیثیت رکھتی ہے ۔ لیکن بھارت کی فوج نے کشمیر کی سیاسی آزادی پر ڈاکا ڈال کر اہل کشمیر کو قانون کی زندگی اور اصلاح احوال کی کوشش بلکہ اس کوشش کے امکان ، سے بھی محروم کر دیا ہے ۔

میں نے ابھی آپ سے عرض کیا تھا کہ تعلیم عالمِ فکر و بصیرت میں ایک بہتر صورتِ حال پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے ، اور آزادی وہ حالت ہے جس میں یہ کوشش ممکن ہو ۔ کسی قوم کی تاریخ دراصل نام ہے عمل کی سطح پر اس قوم کے تصوّرِ حیات کے بتدریج انکشاف کا ۔ ہم اسی صورت میں آزاد ہیں جب ہم اپنے قومی مزاج کی روشنی میں حقیقتِ کائنات کا احاطہ کرنے کی قدرت رکھتے ہوں ۔ یوں دیکھیے تو تعلیم و سیاست کی ظاہری علاحدگی کے باوجود یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ۔ ملک کی تعلیمی حالت ملک کی سیاسی حالت کا عکس ہوتی ہے ، کیونکہ کسی قومی نصب العین کے تقاضوں کو ذہنی تربیت کے سانچوں میں ڈھالنے کا عمل اور اس عمل کے راستے میں سے رکاوٹیں دور کرنے کا اختیار (جسے ہم سیاسی آزادی کہتے ہیں) ایک دوسرے سے الگ نہیں پائے جاتے ۔ جب تعلیم اور آزادی کا رشتہ اتنا گہرا اور اتنا قریبی ہو تو ظاہر ہؤا کہ قوم کی آزادی کا تحفّظ کرنے والے تعلیم کی دنیا پر بھی براہِ راست احسان کرتے ہیں ۔ اس احسان کی جزا یہ ہے کہ معلّم و متعلّم قوم کے لہو سے خریدی ہوئی آزادی کی قدر کریں اور اس آزادی کی عطا کردہ فرصتِ عمل کا مناسب اور صحیح استعمال کریں ۔

اِس منزل پر ہمیں آزادی کے اس انعامِ عظیم کے لیے جو گزشتہ سال ہمیں اپنے حینِ حیات میں دوسری مرتبہ عطا ہؤا ، خدائے بزرگ و برتر

کا شکر بجا لانا ہے - ہم گوجرانوالے میں تعلیمی انعامات کی تقسیم کا یہ جلسہ اس لیے منعقد کر سکے ہیں کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہمارے غازیوں اور شہیدوں کی قوتِ بازو کے ذریعے سے آزادی کا بے بہا انعام لاہور اور سیالکوٹ کی سرحدوں پر از سرِ نو ہمارے دامن میں ڈال دیا - لیکن ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دراصل ہماری سرحدیں ہی ہمارے شہیدوں کے خون سے لالہ رنگ نہیں ہوئیں، ہماری خاکِ وطن کے ذرّے ذرّے پر نورِ ایمان کی بارش ہوئی ہے - اگر ہماری آنکھیں دیکھ سکیں تو ہمیں پاکستان کی پوری سرزمین غازیوں کے لہو سے وضو کرتی ہوئی نظر آئے - اگر ہمارے کان سن سکیں تو ہمیں اپنے پاؤں تلے کی مٹی میں سے شہیدوں کی پکار سنائی دے کہ ہم نے تو جان کی شہادت دے کر تمہاری آزادی کا حق ثابت کر دیا - اب اِس آزادی کی بنیادوں پر ایک بہتر زندگی کی عمارت کھڑی کرنا تمہارا کام ہے -

حضرات، مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کالج کے فیض یافتہ طلبہ میں سے تین جواں مردوں نے گزشتہ ستمبر کی جنگ میں شہادت کا مرتبہ پا کر ہم سب کے لیے ایک پیغام چھوڑا ہے - یہ پیغام کیپٹن صغیر حسین شہید، کیپٹن انوارالحق شہید اور لفٹنٹ فاروق عبدالعزیز شہید کی زبان سے مجھے اس طرح سنائی دیتا ہے کہ یہ جہاد صرف افواجِ پاکستان کا جہاد نہ تھا، یہ پوری قوم کا اور قوم کے ہر فرد کا جہاد تھا - ہم میں سے ہر ایک کو اسلام کی راہ میں کچھ نہ کچھ قربان کرنا ہے - خوف اور لالچ اور خود غرضی اور نفسِ امّارہ کی تمام کمینہ ترغیبات اگر ہمیں بدستور ملوّث کرتی رہیں تو میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مرنے والے، جو مر کر ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے تھے، خدا کی حضور میں نہیں، مگر ہمارے دل کی دنیا میں ایک بار پھر مریں گے -

اِن دنوں شہیدوں کی یادگاریں قائم کرنے کا چرچا ہر طرف سنا جا رہا ہے۔ یقین مانیے کہ شہیدوں کی سب سے بڑی یادگار یہ ہے کہ ہم اپنی روح کو خیانت اور تن آسانی کی آلائشوں سے پاک کریں اور ایک بہتر ملک کے بہتر انسان بن کر ایک بہتر زندگی کی تعمیر کریں۔

جناب والا، آخر میں مجھے وہ فرض ادا کرنا ہے جو سب سے پہلے بجا لانا تھا۔ آپ نے مجھے اِس سالانہ جلسے میں شریک کرکے میری جو عزّت افزائی کی اور میرے اس خشک وعظ کو جس صبر و سکون سے سنا، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

☆ ☆ ☆

ضروری گزارش

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی یہ کتاب پریس میں تھی جب ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ع کو اچانک زندگی سے اُن کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اُس وقت کتاب صفحہ ۲۵۳ تک چھپی تھی۔

دو برس سے زائد مدت پہلے جب پروفیسر صاحب نے اِس کتاب پر کام شروع کیا تھا، اُنھوں نے اِس میں چھپنے والے مقالات و خطبات کی ایک ابتدائی فہرست مرتّب کی تھی۔ آگے چھپے ہوئے مضامین نمبر ۲۶ تا ۳۳ اور ''راجشاہی یونیورسٹی'' کی کانووکیشن کا صدارتی خطبہ (کتاب کا واحد انگریزی مضمون) اُسی فہرست میں سے ہے۔ افسوس کہ اُن کی فہرست میں درج ایک خطبہ اُن کے کاغذات میں بہت تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔ یہ ۱۴ جنوری ۱۹۶۹ع کو مشن سکول (چرچ آف سکاٹ لینڈ ہائی سکول)، وزیر آباد میں اساتذہ اور طلبہ سے اُن کا خطاب تھا۔ مشن سکول اُن کا پرانا سکول تھا جہاں ۱۹۱۸-۱۹۱۹ع میں وہ نویں اور دسویں جماعت میں مشہور مستشرق ریورنڈ ڈاکٹر ٹامس گریئم بیلی کے شاگرد رہے تھے۔ اب یہ کتاب اُس مضمون کے بغیر ہی چھپ رہی ہے۔

ابتدائی فہرست کے علاوہ اِس کتاب کے متعلق کاغذات کے فائل میں ایک الگ کاغذ پر چار اور خطبات کے عنوان درج تھے۔ اُن میں سے تین اس کتاب کے مضمون نمبر ۳۴ تا ۳۶

کے طور پر شامل کر دیے گئے ہیں - چوتھا کوئٹے میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۱ع کا خطبۂ افتتاحیہ تھا ، مگر اُس کا مکمل متن دستیاب نہیں ہؤا ، اِس لیے وہ بھی اِس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا -

کتاب کا مضمون نمبر ۳۷ پروفیسر صاحب کی مرتّب کردہ فہرست میں شامل نہ تھا ، مگر چونکہ اِس کا تعلق کتاب کے موضوع سے ہے اِس لیے یہ بھی شامل کر لیا گیا ہے -

یہ سب مضامین اگرچہ پہلے کے لکھے ہوئے تھے ، اور بعض تو رسالوں میں چھپ بھی چکے تھے ، لیکن اب کتابی شکل میں چھاپنے سے پہلے پروفیسر صاحب اِن میں ایک بار پھر بہت محنت سے رد و بدل کر رہے تھے بلکہ اُنھوں نے ابتدائی فہرست کے بعض مضامین حذف بھی کر دیے تھے - افسوس ہے کہ اُن کو اگلے تیرہ مضامین (۲۶ تا ۳۸) پر نظر ثانی کرنے کی مہلت نہ ملی - اِن مضامین کے عنوانات اور اُن کے نیچے مختصر تعارفی الفاظ بھی اُن کے بعد ہی لکھے گئے ہیں -

دیباچے میں پروفیسر صاحب نے کتاب کے اشاریے کا بھی ذکر کیا ہے - افسوس کہ وہ خود صرف پہلے چار مضامین کا اشاریہ مرتّب کر سکے - باقی مضامین کا اشاریہ اُن کے بعد ، حتی الامکان اُسی نمونے کے مطابق مرتّب کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

☆ ☆ ☆

بلند نصب العین کی اہمیّت

(کیمبرج سے پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ کے نام ایک خط)

یہ خط ۱۰ جنوری ۱۹۶۷ کے "یونیورسٹی کرانیکل" میں شائع ہوا۔

۶ دسمبر کا دن میرے لیے ہر سال ایک پرانے عہد کو از سرِ نو تازہ کرنے کا پیغام لاتا ہے۔ یہ دن میرے والدِ مرحوم و مغفور مولانا سراج الدین احمد خاں کی رحلت کا دن ہے۔ اُن کی وفات کے وقت میں اِتنا کم سن تھا کہ میرے لیے اُن کی یاد ایک دھندلی سی تصویر کے مانند ہے، لیکن ان کی ذات و صفات کا جو تصوّر لڑکپن کے دنوں سے مجھے دیا گیا وہ آج بھی میرے ذہن میں ایک روشن ستارے کی طرح چمکتا ہے۔ زندگی کے دورِ اول میں جب مجھے کسی مشکل کا سامنا ہوتا میں اُس کے حل کے لیے اپنے آپ سے ہمیشہ پوچھتا کہ والدِ مرحوم کو اگر یہ صورت درپیش ہوتی تو وہ کیا کرتے؟ اور اس سوال کا جواب ہمیشہ میرے لیے صحیح راہِ عمل معیّن کر دیتا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ دن میرے لیے کیوں تجدیدِ عہد کا دن ہے اور والدِ ماجد کے ذاتی کردار کے تصوّر سے وفاداری کا وعدہ میں خاص طور پر اِس روز کیوں یاد کرتا ہوں۔

آج جب مجھے یہ پیمانِ وفا باندھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور میں دیارِ غیر میں وطن سے ہزاروں میل دُور بیٹھا ہوں، مجھے یکایک خیال آیا کہ میرے وہ عزیز طلبہ، جو

پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں ، فضائلِ اخلاق کے کون سے نمونوں کو پیشِ نظر رکھے ہوئے آیندہ نصف صدی میں اپنی اپنی زندگی کا نقشہ تیار کر رہے ہیں ؟ اور یہ سوچتے ہی میرا جی چاہا کہ ان ہزارہا نوجوانوں کو اپنے ذاتی احوال کی روشنی میں توجہ دلاؤں کہ کوئی نہ کوئی اچھا نمونہ اپنے سامنے رکھنا ، اور بالخصوص اوائلِ عمر میں اپنے سامنے رکھنا ، ہمارے لیے زندگی کی تیاری کی اولیں شرط ہے ۔

انسان کا ضمیر ایک پُرسکون آبجُو سے کہیں زیادہ ایک متلاطم سمندر کی مثال ہے ۔ اگر آپ کبھی اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہمیں ہر وقت ، خیال یا عمل کی دنیا میں ، کوئی نہ کوئی نئی صورت درپیش ہے جو ہم سے مسلسل کسی نہ کسی نئے فیصلے کا مطالبہ کرتی ہے ۔ یوں دیکھیے تو اخلاق ارادہ کسی اچھے نصب العین کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا نام ہے ۔ یہ اچھا نصب العین ، جو بارہا ہماری ذاتی رسائی سے ماورا ہوتا ہے ، اگر کسی ایسی شخصیت کا جامہ پہن سکے جو ہمارے دلی احترام و محبت کی مستحق ہے ، تو اس کا اخلاق حکم ایک نہ ٹلنے والا تقاضا بن کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوگا ۔ اس عمل کی کئی صورتیں ممکن ہیں ؛ اکثر ہمارے والدین ، یا کوئی بڑا بھائی بہن ، کوئی شفیق اُستاد یا کوئی اور واجب التکریم بزرگ اس مثالی انداز میں ہماری اخلاقی قوّت کا سرچشمہ بن جاتا ہے ۔ پختگیٔ عمر کو پہنچ کر اس قسم کے سہارے کی ضرورت کم ہو جاتی ہے ، لیکن وہ صرف اس لیے کہ نوعمری کے دنوں میں ہم نے کسی اعلیٰ درجے کے نمونۂ اخلاق کا سہارا لے کر نکوکاری کو اپنی عادت بنانے کی کوشش کی ۔ اُن نوجوانوں کے لیے جو نیکی کی زندگی بسر کرنے کی خواہش ، یا نیت ، رکھتے ہیں ، یہ لازم ہے کہ اپنے حلقے کے اندر محبت و عقیدت کا ایک ایسا مرکز تلاش کر لیں جس کی کشش قدم قدم پر انھیں راہِ راست کی طرف آنے کی دعوت دے ۔ خدا کا

شکر ہے کہ ہماری دنیا میں نیکی کبھی اس حد تک نایاب نہیں ہوئی کہ ہم کسی اچھے نمونے کی تلاش میں نظر دوڑائیں تو شمعِ ہدایت کی کوئی نہ کوئی کرن پاس ہی جھلکتی ہوئی نہ مل جائے ۔

خود میں نے جس نصب العین کی روشنی میں اپنی زندگی کے برے بھلے دن گزارے ، اس کا خاکہ آپ کو اشعارِ ذیل میں ملے گا جو والدِ مرحوم کی وفات پر لکھے ہوئے ایک مرثیے سے لیے گئے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ ضرور اسی اخلاقی تصوّر کو اپنی زندگی کے لیے پسند کریں جو شاعر نے اس مرثیے میں پیش کیا ہے ۔ اچھے کردار کے کئی اور تصوّر بھی ممکن ہیں ، لیکن یہ بہرحال لازم ہے کہ آپ کا ضمیر کسی نہ کسی ایسے نصب العین سے وابستہ ہو جو آپ کی قوّتِ فیصلہ کی رہنمائی کر سکے ۔ والدِ مرحوم کے مرثیے میں سے میرے انتخاب کے چند ابتدائی شعر تمہید کی حیثیت سے ہیں ، اور کاشت کار طبقے کے لیے والدِ مرحوم کے اس کام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اُن کی زندگی کا آخری دَور صرف ہوُا :

وہ اپنے فن میں ملک کے اندر یگانہ تھا
یکتائے روزگار و وحیدِ زمانہ تھا
کی اُس نے آ کے غیب سے اُس قوم کی مدد
جس کا بجز خدا کے کوئی آسرا نہ تھا
اُس قومِ بے زباں کی بنا آ کے وہ زباں
جس میں سے ایک شخص بھی نُطق آشنا نہ تھا

اور وہ شعر جو میرے عزیز طلبہ کی توجہ کے طالب اور اس پورے خط کا موضوعِ خاص ہیں ، یوں ہیں :

ہمّت کے اعتبار سے تھا ہمسرِ فلک
یوں دیکھنے میں گرچہ قد اُس کا میانہ تھا

تھی اُس کے لاگ میں بھی ادا اک لگاؤ کی
اُس کے سوا یہ رنگ کسی اور کا نہ تھا
اُس کی زباں ہمیشہ رہی ترجمانِ دل
اِس واسطے کبھی وہ کسی سے دبا نہ تھا
اِن صاف گوئیوں کی بدولت تمام عمر
جتنا کہ چاہیے تھا وہ اُتنا بڑھا نہ تھا
طبعِ غیور دی تھی خداوند نے اُسے
آگے کبھی کسی کے سر اُس کا جھکا نہ تھا
نیّت میں راستی تھی، ارادے میں تھا خلوص
اُس کے کسی خیال میں مطلق ریا نہ تھا
رکھتا وہ دشمنوں کی طرف سے نہ تھا عناد
ملتا وہ دوستوں سے اگر مخلصانہ تھا
وہ بےکسوں کے واسطے بنتا رہا سپر
اور سرکشوں کے حق میں وہ اک تازیانہ تھا
تھا مقدرت سے بسکہ وہ بڑھ کر کشادہ دل
کچھ جمع اپنے واسطے اُس نے کیا نہ تھا
وہ پاک نفس تھا غرض اپنی مثال آپ
ذکر اُس کا آج خلق میں یوں غائبانہ تھا
''شہبازِ ما پریدہ رہِ آسماں گرفت
مرغے نہ رفتہ است کہ دیگر تواں گرفت''

کیمبرج
٦ دسمبر ۱۹٦٦

☆ ☆ ☆

گزشتہ کام کی روداد اور آیندہ مساعی کا رخ

یہ روداد جلسۂ عطائے اسناد پنجاب یونیورسٹی میں ۲۸- جنوری ۱۹۶۷ کو پڑھی گئی -

خواتین و حضرات ، میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کے ننانویویں جلسۂ عطائے اسناد میں شرکت پر خوش آمدید کہتا ہوں - یہ ایک قومی ادارہ ہے اور قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کا حق بھی ہے اور فرض بھی کہ وہ اپنے آپ کو اس ادارے کی کارکردگی کے کوائف سے باخبر رکھے -

اس سلسلے میں سب سے پہلے مجھے عرض کرنا ہے کہ یونیورسٹیوں میں یہ ناگزیر ہے کہ علوم و فنون کا فروغ ایک تدریجی ، اور بہت ہی سست اور حوصلہ آزما ، عمل کے ذریعے سے ہو - یونیورسٹی کسی دامنِ کوہسار کے مانند نہیں ہے کہ بارانِ رحمت کا ایک ہی چھینٹا اسے سرسبز کرتا ہوا گزر جائے - یونیورسٹی کی نشو و نما کو ایک بچے کی نشو و نما سے مثال دی جا سکتی ہے جس کے صحیح اندازے کے لیے ماہ و سال کے حساب کا ذرا مختلف معیار مقرر کرنا ضروری ہے - چنانچہ ہمیں اس صبر شکن صورتِ حال کا سامنا ہے کہ یونیورسٹی ہماری کل کی کوشش کا ثمر ہمیں آج نہیں دیتی - اس لیے شاید یہ بہتر ہوگا کہ یونیورسٹی کے کام کی خوبی و خرابی کا جائزہ اِس اصول کی بنا پر لیا جائے کہ یونیورسٹی کے پیکر میں کوئی حرکت ہے یا نہیں ، اور اگر ہے تو اس حرکت کا رخ کس جانب ہے ؟ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ

یہ اندازِ نظر اختیار فرمائیں گے تو آپ کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوگا کہ گزشتہ سال بھی اصلاحِ احوال کے لیے پیہم اور پُرخلوص جد و جہد جاری رہی ۔ اس جد و جہد کے نتائج انشاء اللہ دو چار برس میں ظاہر ہوں گے ۔

میرا اپنا عقیدہ ہے کہ یونیورسٹیوں پر اعلیٰ ترین تہذیبی و ملّی اقدار کے تحفّظ و ارتقا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ اگر یہ عقیدہ درست ہے تو بداھةً اس میں سے ایک شق یہ نکلتی ہے کہ یونیورسٹی کے تمام کاروبار کی بنیاد ــ گہری اور پائدار بنیاد ــ لازماً کسی نہ کسی قومی زبان پر رکھی جانی چاہیے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایکٹ مجریہ ۱۸۸۲ میں ہماری یونیورسٹی کے قیام کی یہ علّتِ غائی ، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ، واضح الفاظ میں بیان کی گئی تھی ۔ آپ کو یہ بھی علم ہوگا کہ ۱۹۶۲ میں اِس مقصد کی تکمیل کے لیے یونیورسٹی نے ایک ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جو اپنے روزِ قیام سے لے کر اب تک مسلسل کام کر رہا ہے ۔ ۱۹۶۴ سے سالِ گزشتہ تک کے عرصے میں یونیورسٹی نے قومی زبان کو ذریعۂ تدریس و امتحان بنانے کا اختیار بتدریج تمام اساتذہ و طلبہ کو دے دیا ۔ با ایں ہمہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان تبدیلیوں کا کوئی دُور رس اثر ابھی ہمارے نظامِ تعلیم میں رونما نہیں ہؤا ۔ میں تدریج کے اس سست عمل سے ہراساں نہیں ہوں بلکہ اسے سنڈیکیٹ اور اکیڈیمک کونسل میں اپنے رفقا کی دانش و فراست کا ایک ثبوت سمجھتا ہوں کہ وہ ''دیر آید درست آید'' کے حکمت آموز مقولے کے رمز شناس ہیں ۔

ادارۂ تالیف و ترجمہ نے اپنی زندگی کے پہلے تین برس میں اقتصادیات و سیاسیات کی بیس ہزار سے زیادہ اصطلاحات وضع کیں اور بی ۔ اے ۔ کے طلبہ کے لیے اقتصادیات پر ایک کتاب لکھوائی ۔ گزشتہ

سال سے اس ادارے نے اپنے کام کی رفتار تیز تر کر دی ہے - چنانچہ بی - ایس سی - کے لیے حیوانیات کے مضمون پر ایک کتاب لکھی جا چکی ہے جو امید ہے کہ امسال شائع ہو جائے گی - اس کے علاوہ سائنس کے تمام شعبوں کے اساتذہ اپنے اپنے مضمون میں طلبہ کے لیے درسی کتابیں لکھنے کی داغ بیل ڈال رہے ہیں - مجھے یقین ہے کہ آیندہ دو تین برس میں بی - اے -/بی - ایس سی - کے تمام مضامین کی تدریس بہ سہولت اردو میں ہو سکے گی -

تعلیم و تدریس سے قطع نظر ، یونیورسٹی نے گزشتہ سال کے دوران میں اپنی پوری توجہ مذکورۂ ذیل چار سرگرمیوں پر مرکوز رکھی :

اول ، اصلاحِ نصاب و درسیات -

دوم ، علمی تحقیق -

سوم ، اساتذہ اور طلبہ کے لیے زندگی کی عام سہولتوں کی فراہمی -

چہارم ، یونیورسٹی میں ایک بہتر اور پاکیزہ تر فضا کے قیام کی کوشش -

یونیورسٹی کی سرگرمیوں کے یہ تمام پہلو مستقل توجہ اور مسلسل احتسابِ عمل کے متقاضی ہیں جس کے بغیر ہماری درس گاہوں میں طلبہ کی وہ توانا نسل پروان نہیں چڑھ سکتی جو پاکستان کو انسان کی بین الاقوامی برادری میں ایک باعزّت مقام دلا سکے -

سب سے پہلے نصابِ تعلیم کو جدید رجحانات سے ہم آہنگ بنانے کے لیے فوری اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہے - مگر یہ ایک نہایت مشکل مہم ہے - ہمارے لیے یک بیک کوئی انقلابی قدم اٹھانا نامناسب ہی نہیں ، عملاً ناممکن بھی ہے - سائنس کے مضامین کو لیجیے - یہاں ضروری ترمیم کے نفاذ کی راہ میں جو دشواریاں حائل ہیں ، ان میں

سے چند یہ ہیں :

اگر نصاب میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں تو ہمارے تدریسی شعبے اور مُلحقہ درس گاہیں مقرّرہ نصاب کی تدریس کا مناسب انتظام نہ کر سکیں گی - جدید ترین سائنسی تحقیقات کو اُسی صورت میں داخلِ نصاب کیا جا سکتا ہے جب تجربہ گاہوں میں جدید ترین ساز و سامان اور آلات مہیا ہوں - یہ فوری طور پر ممکن نہیں لہٰذا آہستہ روی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا -

ایک اور دِقّت ہے جو ہمیں کسی انقلابی اقدام کے بجائے تدریجی اصلاح کی روش اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے - نئے نصاب کی تدریس کے لیے اساتذہ کی تربیت ضروری ہے - ہم اِس مسئلے کو دو طریقوں سے حل کر رہے ہیں :

مختلف شعبوں کے بورڈز آف سٹڈیز سے کہا گیا ہے کہ متعلقہ مضامین کے نصاب میں حسبِ ضرورت ترمیم کریں - سائنسی شعبوں کی نصابی مجالس کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ تدریج کے عمل کا بالخصوص لحاظ رکھیں تاکہ ہمیں نئے آلات اور ساز و سامان کے فراہم کرنے کا موقع مل جائے -

جن اساتذہ کو نئے نصاب کی تدریس کا کام کرنا ہے اُن کی تربیت کے لیے خاص مذاکروں اور ذہن کی تعمیرِ نو کے لیے ضروری اسباق کا اہتمام کیا جا رہا ہے - اس کے علاوہ بعض شعبوں کی اصلاح و استحکام پر اِس سال خاص توجہ کی گئی ہے - ان میں ایک طرف سیاسیّات، مرکزِ علومِ عمرانیہ، اقتصادیّات اور صحافت کے شعبوں کا نام لیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف کیمیا اور علم الادویہ کے شعبوں کا -

شعبۂ علم الادویہ کے لیے برٹش کونسل نے آیندہ تعلیمی سال سے ہمیں ایک انگریز پروفیسر مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور

شعبۂ سیاسیّات کے لیے ایک پاکستانی پروفیسر کو امریکہ سے بلوانے کا فیصلہ ہؤا ہے۔

نصاب و درسیّات کی اصلاح میں اب تک جو دشواریاں حائل رہی ہیں، اُن کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہم یہ دو طرفہ حملہ پوری تندہی سے جاری رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں۔

اصلاح و تجدیدِ نصاب سے قطعِ نظر، مجھے یقینِ راسخ ہے کہ صرف موجودہ نصاب کے ڈھانچے کو بدل دینے سے ہمارے طلبہ کی ضروریات پوری نہ ہوں گی کیونکہ اُن کے لیے اس ہر آن بدلتی ہوئی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے صرف نصاب کا بھرپور ہونا کافی نہ ہوگا۔ اُنھیں ایسے اساتذہ کی بھی ضرورت ہوگی جو علمی رفاقت کا حق ادا کرنے کے علاوہ رُشد و ہدایت کی منزل میں قدم بہ قدم اُن کی رہنمائی کریں اور دورانِ تدریس میں ہر روز ایسے روشن لمحات پیدا کرتے رہیں جن کی یاد طلبہ کے دل و دماغ میں عمر بھر ایک چراغاں کی کیفیت سے قائم رہتی ہے۔

ان اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ ہمیں تخصّص یا تحقیق اور بنیادی تعلیم کے درمیان مناسب توازن پیدا کرنا ہے۔ تازہ ترین رجحانات کے پیش نظر، درسیّات میں عمومیّت اور تخصّص کو باہم ملا دینا موزوں معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ احتیاط بہرحال ضروری ہے کہ نصاب کا پھیلاؤ اُسے عمرو عیار کی زنبیل نہ بنا دے، کیونکہ ہم گہرائی کو چوڑائی کی بھینٹ چڑھا دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ بنیادی تعلیم میں تخصّص کی شان پیدا کرنے کے لیے اُن دیواروں کو ڈھا دینا ہوگا جو اب تک تدریسی شعبوں کے درمیان حدِّ فاصل بن کر حائل رہیں۔ یونیورسٹی میں عمرانیات، اقتصادیات، انتظامیات اور علم الاحصا کے شعبوں نے رضاکارانہ تعاون کی جانب ایک قدم بڑھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبلِ قریب میں دیگر شعبے بھی اس مثال سے متاثر ہوں گے۔

قوم کے صنعتی اور فنی تقاضوں کو پورا کرنے کی دُھن میں تاریخ و ثقافت کے موضوعات پر ہماری تحقیقی سرگرمیاں کچھ ماند پڑگئی ہیں - یہ صورتِ حال اس قوم کے حق میں ہرگز خوش گوار نہیں ہو سکتی جس کی تشکیل کی اساس ایک ایسا نظریۂ حیات ہے جو دنیا کے خالص مادّہ پرستانہ نظریات سے یکسر مختلف ہے - اسی احساس کے ماتحت یونیورسٹی نے چند ایسے علمی ادارے بھی قائم کیے ہیں جنھیں قوم کے تاریخی اور تہذیبی ورثے کا تحقیقی جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے - ان میں دائرۂ معارفِ اسلامیہ کو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی وفات سے شدید نقصان پہنچا تھا - تین چار برس تک کام کی رفتار پر بھی اس کا اثر پڑتا رہا - لیکن گزشتہ سال اس ادارے کی تنظیمِ نو بالآخر ممکن ہوگئی اور مجھے یقین ہے کہ کام اب بطریقِ احسن جاری رہے گا - اسی طرح تاریخی تحقیقات کا ادارہ بھی پچھلے سال اس منزل میں داخل ہو گیا جہاں تاریخِ پاکستان کی تین جلدوں کے مختلف ابواب کے کام کی تسوید شروع ہو چکی ہے -

ریسرچ سوسائٹی کو قائم ہوئے اب دو برس گزر چکے ہیں - اس عرصے میں سوسائٹی نے بڑی کاوش سے قائداعظمؒ کے خطوط کا مجموعہ مرتّب کیا ہے اور قومی تاریخ کے ماخذ پر فارسی نثر و نظم کی بعض نایاب کتابیں شائع کی ہیں -

تاریخِ ادبیات کا شعبہ جسے قائم ہوئے ڈیڑھ برس ہوا ، پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی ادبی اور تہذیبی تاریخ پندرہ جلدوں میں مرتّب کرے گا - مجھے خوشی ہے کہ اس شعبے کا کام بھی منصوبہ بندی کی حد سے آگے بڑھ کر مختلف جلدوں کے ابواب کی تسوید تک آپہنچا ہے -

ان تحقیقی اداروں کے دوش بدوش ، دیگر علوم و فنون اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بھی تحقیقی کام کی ترقی کے لیے مزید سہولتیں مہیّا کی جا رہی ہیں - یونیورسٹی کے تدریسی شعبوں کے نتائجِ تحقیق ، ایک

سہ ماہی مجلّے میں مرتّب ہو کر شائع ہوتے ہیں ۔ اس تحقیقی مجلّے کے چار شمارے اب تک طبع ہو چکے ہیں ۔

گزشتہ سال یونیورسٹی کے ایک بہی خواہ نے ہمیں مشورہ دیا کہ یونیورسٹی کو ایک سائنسی نمائش کا اہتمام کرنا چاہیے جس میں سائنس کے تدریسی شعبوں کا تحقیقی کام لاہور کے شہریوں کو بغرضِ اطلاعِ عام پیش کیا جائے ۔ مہینوں کی محنت کے بعد اب یہ نمائش بالکل تیار ہے اور خیال یہ تھا کہ اس سالانہ جلسے کے موقع پر اس کا افتتاح ہو ۔ مجھے افسوس ہے کہ یونیورسٹی کے پاس جگہ کی قلّت اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ یہ ممکن نہ ہو سکا ۔ مگر جوں ہی بی ۔ اے ۔/ بی ۔ ایس سی ۔ کا ضمنی امتحان یونیورسٹی ہال کو فارغ کرتا ہے ہم اپنی سائنسی نمائش کو یونیورسٹی ہال میں سجا دیں گے ۔ میں آپ سب خواتین و حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ فروری کے دوسرے ہفتے میں اس نمائش کے ملاحظے کے لیے قدم رنجہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ ہمارے شعبہ جاتِ سائنس نے تحقیق و تفتیش کے میدان میں کتنا گراں بہا کام کیا ہے ۔

یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ کے لیے روزمرہ زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے کی مختلف تدابیر عمل میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی آسائشوں کے بغیر نہ ہمارا معیارِ تعلیم ، نہ ہمارا معیارِ شائستگی بلند ہو سکتا ہے ۔ یونیورسٹی نے تیسرے پنج سالہ منصوبے کی باقی ماندہ مدت میں اساتذہ کے مکانات اور طلبہ کی اقامت گاہوں کی تعمیر کو سب کاموں پر مقدّم رکھا ہے ۔ کیمپس کمیٹی کی مجلسِ کارپرداز آن نقشوں اور تعمیری تفصیلات کا جائزہ لے رہی ہے جن کے مطابق مناسب لاگت پر اساتذہ اور طلبہ کو زیادہ سے زیادہ آرام بہم پہنچایا جا سکتا ہے ۔ امید ہے کہ ہم آئندہ سال کے دوران میں تقریباً ستّر اساتذہ کے لیے مکانات اور ایک ہزار کے قریب

طلبہ کے لیے اقامت گاہوں کی تعمیر کا کام شروع کر سکیں گے ۔

یونیورسٹی عبارت ہے اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلق کے مضبوط اور نتیجہ خیز ہونے سے ۔ اگر استاد و شاگرد صحیح قسم کے دلی و دماغی ارتباط سے محروم ہوں تو یونیورسٹی ایک خشک درخت کی طرح مرجھا کر مر جاتی ہے ۔ گزشتہ سال کوشش کی گئی کہ یونیورسٹی کے ہر طالب علم کو اپنے تدریسی شعبے کا کوئی اچھا استاد بطورِ اتالیق میسّر رہے جو روزمرہ کے مسائل میں اُس کا رہنما اور غمگسار ہو ۔ یہ کوشش شاید خاطر خواہ طور پر کامیاب نہیں ہو سکی ، لیکن میں ناامید نہیں ہؤا اور اس سال اساتذہ و طلبہ کو قریب لانے کے لیے یہی کوشش زیادہ منظّم طور پر کرنا چاہتا ہوں ۔ جس حد تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے اپنے وقت کو اساتذہ و طلبہ پر تقسیم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور مجھے یقین ہے کہ میرے اکثر رفقا اور طلبہ شہادت دیں گے کہ

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے

شعبۂ امورِ طلبہ نے گزشتہ سال خدمتِ خلق کے سلسلے میں طلبہ کے ہاتھوں بہت مفید کام کرایا ۔ سیالکوٹ کے نواح میں دشمن کی غارت گری سے جو دیہات تباہ ہوئے تھے اُن میں ہمارے پانچ سو طلبہ پھیل گئے اور چودہ روز کی شاقّہ محنت کے بعد اُس علاقے میں اچھے اثرات چھوڑ کر اور اُس سے زیادہ اچھے اخلاقی اثرات سمیٹ کر واپس آئے ۔ اِس قسم کی اصلاحی تدابیر سے قطع نظر ، بعض اساتذہ کے شفقت آمیز سلوک سے متاثر ہو کر طلبہ حسنِ کردار کی جو مثالیں قائم کرتے ہیں ، میں اُن کے لیے بے حد شکر گزار ہوں ۔ سچ پوچھیے تو علمی تحقیق ہی کی سطح پر نہیں ، اخلاقی تربیت کے میدان میں بھی ہمیں ہر وقت بیدار رہنے کی ضرورت ہے ۔ مکان کی صفائی سے ذرا سی غفلت کیجیے تو ہر طرح کا کُوڑا کرکٹ جمع ہونے لگتا ہے ۔ مجھے

اور میرے بعض رفقا کو جھاڑ پونچھ کا خبط ہے - ہم نے گزشتہ سال بہت سے جالے صاف کیے اور انشاء اللہ اس سال بہتر اور پاکیزہ تر فضا کی توقع رکھتے ہیں -

اس سال یونیورسٹی نے دو اہم فیصلے یہ کیے ہیں کہ ہم عملی ریاضیات اور ٹھوس اجسام کی طبیعیات کے تحقیقی کام میں تخصّص کا اہتمام کریں - اس کے علاوہ ہم نے یونیسکو کی مدد سے نظریاتی و ریاضیاتی طبیعیات میں تحقیق و تخصّص کا ایک مرکز قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے - اس منصوبے کی تفصیلات طے ہو چکی ہیں اور امید ہے کہ عنقریب اس پر عمل شروع ہو جائے گا - یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ جو نتائج ان فیصلوں سے مترتّب ہوں گے وہ آئندہ تین چار برس سے پہلے ظاہر نہ ہو سکیں گے -

یہ روداد ختم کرنے سے پہلے اُن مختلف تبدیلیوں کا مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو اِس سال یونیورسٹی کے تعلیمی و انتظامی عملے میں واقع ہوئیں - ہمارے چند چوٹی کے کارکن کم و بیش تیس برس تک یونیورسٹی سے وابستہ رہنے کے بعد اپنے عہدوں سے سبک دوش ہو گئے - مقامِ مسرّت ہے کہ ان میں سے دو بزرگ دوسری حیثیتوں میں اب بھی یونیورسٹی کی گراں قدر خدمت بجا لا رہے ہیں -

پرانے اور معتبر رفقا کی جدائی ہمارے لیے خواہ کیسی ہی ناخوش گوار کیوں نہ ہو ، تغیّر کا عمل جو زندگی کا بنیادی اصول ہے برابر جاری رہے گا - میں خوش ہوں کہ چند پرانے ، قوی دست اور آزمودہ کار رفقا کی جگہ کئی نئے پُرجوش اور سرگرم کارکن ہماری صفوں میں شامل ہوگئے ہیں - میں خلوصِ دل سے ان سب کا خیر مقدم کرتا ہوں - میرے ان نوجوان رفقا میں سے بعض کے شوقِ علم اور ذوقِ عمل نے ابھی سے یونیورسٹی میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیا ہے اور میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ وہ دس پندرہ برس کے اندر اندر

اپنے اپنے شعبے کے صدر بنیں گے اور علوم و فنون کی دنیا سے اپنا لوہا منوائیں گے۔

سنڈیکیٹ ، ایکیڈیمک کونسل ، تعلیمی شعبہ جات اور دفتر کے بے شمار رفقا جس فیاضی اور خوش دلی سے اس سال بدستور میرا ہاتھ بٹاتے رہے ، اُس کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں ! اور میرے یہ عزیز طلبہ جو آج اپنی اپنی سندِ علمی پا کر مجھ سے رخصت ہو رہے ہیں ، دو دو برس یا چار چار برس تک یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں میں اس مادرِ تعلیمی کے لیے قوّت و عظمت کا باعث بنے رہے ہیں ۔ میری دعا ہے کہ آگے چل کر یہ ملک و ملّت کے لیے قوّت و عظمت کا باعث بنیں ۔

میں نے اِس روداد میں آپ کو ماضی کی داستان کے ساتھ مستقبل کی ایک جھلک بھی دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ اس مستقبل کو قوّت سے فعل میں لانے کے لیے مجھے آپ میں سے ہر ایک کی ، مگر سب سے بڑھ کر خدائے تعالیٰ کی ، مدد کی ضرورت ہے ۔
و ما توفیقی الا باللہ و ھوالمستعان ۔

☆ ☆ ☆

قومی زندگی میں عورت کا دائرۂ عمل

یہ خطبہ، ہوم اکنامکس کالج، لاہور، کی سالانہ تقریبِ عطائے اسناد کے موقع پر، بتاریخ ۷ - اپریل ۱۹۶۷ پڑھا گیا - قومی زندگی میں عورت کے دائرۂ عمل کی تعیین کے ساتھ، خطبے میں ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا تھا - اس کتاب کی ترتیب کے وقت مضامین جمع کرتے ہوئے، اس اہم مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے، پروفیسر صاحب نے مطبوعہ مقالے میں اپنے قلم سے کچھ ضروری اضافے بھی کر دیے تھے، جو اب اس میں شامل ہیں -

جناب پرنسپل صاحبہ، عزیز طالبات، خواتین و حضرات،

میری خاصی لمبی تعلیمی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں طلبہ کے بجائے طالبات کے ایک جلسے سے خطاب کر رہا ہوں - یہ سچ ہے کہ میری ایم - اے - (انگریزی) کی جماعت میں مرد طالب علموں کی اکثریت کے ساتھ عورت طالب علموں کی تھوڑی سی تعداد سال بہ سال ضرور شامل ہوتی تھی، لیکن یہ خاص اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا کہ مردوں کو خارج کر کے میرا روئے سخن صرف قوم کی بیٹیوں سے ہو - اِسی بنا پر ڈیڑھ دو مہینے پہلے جب پرنسپل صاحبہ نے از راہِ تکریم مجھے اس تقریب کے لیے یاد فرمایا تو میرے جی میں آئی کہ اپنی حدِّ نگاہ کا لحاظ رکھتے ہوئے پرنسپل صاحبہ کی خدمت میں شکریے کے ساتھ معذرت کر دوں، لیکن اِس کے ساتھ ہی مجھے یہ دوسرا خیال بھی آیا کہ میری والدۂ مرحومہ اور میری

بڑی بہن ، جو میری سب سے پہلی معلّم تھیں ، اُن کے احسان کی جزا یہ تو نہ ہونی چاہیے کہ میں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے سالانہ تعلیمی جلسے میں شریک ہونے سے پہلوتہی کروں !

خواتین و حضرات ، میں اِس مسرّت انگیز تقریب میں اپنی حاضری پر اِس لیے بھی خوش ہوں کہ یونیورسٹی کے ایک ملحقہ کالج کی تعلیمی اور تہذیبی کامیابیوں پر مجھے پرنسپل صاحبہ اور اِن کی رفیقِ کار خواتین کو بذاتِ خود تہنیت پیش کرنے کا موقع ملا ہے - میں اُن عزیز طالبات کو بھی دلی مبارک باد دیتا ہوں جنھوں نے اپنی محنت و ذہانت کی بنا پر امتیازات و انعامات حاصل کیے اور بحیثیتِ مجموعی اچھی طالب علمانہ زندگی کا معیار قائم رکھا - آپ کے عمدہ نتائج بہت سے مردانہ کالجوں کے لیے قابلِ رشک ثابت ہوں گے ، لیکن اِس سے کہیں بڑی کامرانی آپ کا وہ اپنا اطمینان ہے جو اچھے کام کو اچھے طریقے پر سرانجام دینے سے میسّر ہوتا ہے - یہ کالج اُمورِ خانہ‌داری کا کالج ہے - اِس مناسبت سے آپ نے تمام اُمور کا بہ حسن و خوبی انصرام کر کے اعلیٰ درجے کی خانہ داری کی مثال قائم کی ہے -

اگر ذرا غور کیجیے تو خانہ داری کا یہی سلیقہ ایک چھوٹے دائرے سے حرکت کرتا ہوا نسبتاً بڑے دائروں تک جا پہنچتا ہے اور بالآخر انتظامِ سلطنت کی سطح پر تدبّر کی روشنی بن جاتا ہے - انگریزی میں معاشیات کے لیے Political Economy کی جو اصطلاح ملتی ہے وہ دراصل دو یونانی لفظوں سے ماخوذ ہے ، جن کے معنی ہیں ''اہلِ شہر کی خانہ داری'' - تدبیرِ مملکت اور تدبیرِ منزل کی یہ باہمی نسبت اِس قدر واضح ہے کہ قدیم یونانی معاشرے میں مردوں اور عورتوں کی علاحدگی کے باوجود افلاطون نے اپنی مثالی مملکت میں حکمرانی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے عورتوں کا حق بالکل مردوں کے مانند قرار دیا تھا - اِس فیصلے کے مطابق وہ طالبات جو

خانہ داری کی باقاعدہ تعلیم پا کر آج اس کالج سے رخصت ہو رہی ہیں اور عنقریب ہماری قومی زندگی کے کسی نہ کسی گوشے میں مصروفِ عمل ہوں گی ، انھیں تنظیمِ ملّت کے کام میں اپنے سیاست کار بھائیوں کے ساتھ برابر کا حصہ مل سکتا ہے ، اور ملنا چاہیے - مگر ''برابر کا حصہ'' لازماً یہ طے نہیں کرتا کہ مرد اور عورت کو بجنسہٖ ایک ہی خدمت بجا لانی چاہیے - مثلاً استاد کے فرائض سپاہی کے فرائض کے برابر اہم ہو سکتے ہیں لیکن دونوں میں نوعیّتِ کار کا فرق صاف طور پر موجود ہے - اسی طرح زن و مرد کی مساوات کا اصول تسلیم کر کے بھی دونوں کی فطرت میں امتیاز کیے بغیر چارہ نہیں ہے - مردانہ نیکیوں کا تصوّر کیجیے تو معاً آپ کا ذہن شجاعت ، حکمت اور عدالت کے فضائل کی طرف منتقل ہوگا - میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں میں مردوں کے یہ خاص فضائل نایاب یا ممنوع ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان تین نیکیوں کو ہم بالعموم مردوں ہی سے منسوب کرتے ہیں - اسی طرح نسوانی نیکیوں کی فہرست میں عِفّت ، شفقت اور حسّیت خاص طور پر نمایاں ہیں ، گو مردوں کو ان فضائل سے قطعاً محروم قرار دینا صحیح نہ ہوگا - میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اچھے مرد بالعموم شجاع اور حکیم اور عادل ہوتے ہیں تو اچھی عورتیں بالعموم عفیف اور شفیق اور حسّاس ہوں گی - دونوں صنفوں کے درمیان یہ فرق قطعی نہیں ، عمومی حیثیت رکھتا ہے ، لیکن پھر بھی یہ ایک حقیقی فرق ہے جس سے انکار محال ہے - مثلاً ہم اپنی خواتین کو میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے کے لیے نہیں بھیجتے ، نہ اپنے مردانِ مجاہد کو مظلوموں اور ستم رسیدوں کے حال پر رحم کے آنسو بہانے کی دعوت دیتے ہیں -

الغرض عورت کی اخلاقی فضیلت اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے اور اِس لحاظ سے اُس کا دائرۂ عمل بھی مختلف ہے - ہمیں تقسیمِ کار

کے اس اصول کو جو قدرت نے قائم کیا ہے، نظر انداز نہ کرنا چاہیے - اعلیٰ درجے کی زندگی کے حصول میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہیں اور ایک دوسرے کے تتمّے کی حیثیت رکھتے ہیں - اس باہمی تکمیل کے رشتے میں نہ عورت کی ہیٹی ہے، نہ مرد کی - قرآن مجید سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی کا نازل ہونا ثابت ہے - اسی طرح دنیوی زندگی میں بھی اسلام نے عورت کو مرد کی طرح روپیہ کمانے اور جائداد و املاک رکھنے کا حق دیا ہے - اس مساوات کے باوجود اسلام نے عورت کے فرائض وضاحت کے ساتھ مرد سے الگ دکھائے ہیں - امورِ خانہ داری اور بچوں کی تربیت کا کام خاص طور پر عورت کو تفویض ہوا ہے - اِس تقسیمِ فرائض کو زمانۂ حال کے تمدّن نے بھی موزوں قرار دیا ہے اور جدید مدارس تو چھوٹی عمر کے بچوں کی تعلیم اُستادوں کے بجائے استانیوں کے سپرد کرنا ہی قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں - ہر وہ کام جو گوشہ گیری کی محنت، تنہائی کی مشقّت یا صبر آزما کاوش کا تقاضا کرتا ہے، اُس کی تکمیل کے لیے ہمارا معاشرہ عورت ذات کا ممنونِ احسان ہے - زندگی کی وہ قدریں جو لطافت و پاکیزگی سے عبارت ہیں، اُن کے سرچشمے کی تلاش ہمارے تخیّل کی پرواز کو عورت ذات تک لے جاتی ہے - غور کیجیے کہ ماں کی مامتا (باپ کی "باپتا" نہیں)، بہن کی جاں نثاری، بیوی کی وفا، یہ سب عورت کے کمالات ہیں -

خواتین و حضرات، انسانی معاشرے کی وہ عظیم الشان دولت جسے شائستگی یا تہذیب کہتے ہیں، اُس کی سب سے جری اور طاقتور محافظ بھی عورت ذات ہی ہے - یہ اس لیے کہ جہاں مرد جدّت طراز اور تازہ کار ہے، وہاں عورت کا شیوہ قدامت پسندی اور روایت نوازی ہے - اس خاص فرق کا ادنٰی، مگر بالکل نمایاں ثبوت اپنے معاشرے میں عورت اور مرد کے لباس کے درمیان دیکھ لیجیے - تہذیبِ مغرب

کا سیلاب اگر اب تک بہا کر نہیں لے جا سکا تو فقط عورت کی شلوار اور قمیص اور دوپٹے کو ۔ ورنہ ہم مردوں نے تو ٹانگوں میں فرنگی دوشاخہ اڑس لیا ، بدن پر ایک دُم کٹی سی قبا ڈال لی ، اور حد یہ کر دی کہ گلے کی اس پھانسی کو بھی نہ چھوڑا ۔

پرنسپل صاحبہ ، خواتین و حضرات ، میں آپ سے مکرّر عرض کرتا ہوں کہ ہماری عورتیں ہماری قومی تہذیب ، ہماری قدیم شائستگی کی امین ہیں ۔ خدا کرے کہ یہ امانت ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ محفوظ رہے ۔ یاد رکھیے کہ کوئی معاشرہ ، اسلامی ہو یا کچھ اور ، شائستگی کے بغیر وجود میں نہیں آتا ، نہ قائم رہتا ہے ۔ قائم رہنے کے لیے اس کا مضبوط اور صحیح بنیادوں پر استوار ہونا ضروری ہے ۔ یہ سچ ہے کہ تہذیب ایک زندہ ، متحرّک اور ترقی پذیر ادارہ ہے ۔ نئے عناصر کو اپنے اندر جذب کرنا اس کی روح کی غذا ہے ، لیکن اگر کوئی تہذیب بیرونی عناصر کو اس رفتار سے جذب کرنے لگے کہ اس کا اپنا اصل وجود ، جو ان عناصر کو جزوِ بدن بنا سکتا تھا ، تحلیل ہونا شروع ہو جائے تو پھر قوم کے نام و نشان کا خدا حافظ ہے ۔

آپ کو معلوم ہے کہ مغربی علوم کی طرف ہمارا رخ ایک صدی پہلے قائدِ قوم سید احمد خاں نے پھیرا تھا ۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جو سر سید کے فیصلے کو کلیۃً صحیح اور حتمی طور پر ناگزیر مانتے ہیں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ سر سید کے وقت سے بھی دو سو برس پہلے ہمیں جدید علوم کی محض سطحی نہیں ، گہری معرفت حاصل کرنی چاہیے تھی تا کہ مشینوں کے دور کے آنے سے پہلے پہلے ہم مغرب سے آنے والے سرمایۂ علمی کو ماہروں اور آزاد انسانوں کی طرح ہضم کر چکے ہوتے ۔ ہمیں اب بھی انگریزی زبان سے وسیع اور گہری واقفیت کی ضرورت ہے ۔ یعنی اگر ہم اپنا ذریعۂ تعلیم کسی قومی زبان کو مقرر کر بھی لیں تب بھی صرف اِس لحاظ سے کہ تمام نئے علوم ہم تک انگریزی زبان کے

توسّط سے پہنچے ہیں، ہمارے لیے انگریزی زبان کا مطالعہ لازم ہوگا۔ پرنسپل صاحبہ، آپ نے اپنی روداد میں ذکر کیا ہے کہ کالج کی طالبات نے گزشتہ سال کے دوران میں گولڈ سمتھ کا پُر لطف کھیل She Stoops to Conquer کامیابی سے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے بہ اندازِ معذرت فرمایا ہے کہ اگلے تعلیمی سال کے دوران میں آپ کی طالبات کوئی اردو ڈراما بھی پیش کریں گی۔ میرے خیال میں آپ کی طرف سے اس قسم کی کوئی معذرت درکار نہ تھی۔ انگریزی زبان کی تحصیل ہمارے نظامِ تعلیم کی بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے اور ہم اس زبان پر اپنی گرفت بدستور مضبوط رکھنا چاہتے ہیں۔ انگریزی ڈراموں کی تیاری اِسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے کیونکہ ڈراما بول چال کی صحیح مشق بہم پہنچاتا ہے۔ جس چیز سے پرہیز لازم ہے وہ یہ ہے کہ ہم انگریزی داں بنتے بنتے انگریز نہ بن جائیں۔ یہ صورت اُس وقت پیش آتی ہے جب ہم تمام علوم کی تحصیل انگریزی زبان کے ذریعے سے کرنے لگیں۔ لیکن اگر ہم انگریزی کو صرف ایک زبان کی حیثیت سے پڑھیں اور ہر قسم کا علم خود اپنی زبان میں سیکھیں تو ہم انگریزی کو بھی گویا مشرّف بہ اسلام کر لیتے ہیں اور اس زبان کا علم ہمارے لیے باعثِ قوّت ثابت ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی روداد میں ضمناً یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک ہوم اکنامکس کی "تمام نصابی اور دیگر کتابیں" اردو میں نہیں لکھی جاتیں، تدریسی زبان بدرجۂ مجبوری انگریزی ہی رہے گی۔ میں اس بارے میں آپ سے بہ ادب اختلاف کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں پہلی منزل یہ ہے کہ ہم انگریزی کتابوں کی بنیاد پر اردو میں درس دینا شروع کر دیں۔ شاگردوں کو اجازت ہو کہ وہ ہم سے اردو میں سوال اور بحث و تمحیص کریں اور امتحانی سوالات کے جواب اردو میں لکھیں، خواہ اُن کی اردو میں انگریزی کی اصطلاحات ملی ہوئی ہوں۔ میرے اس قول کو آپ اچنبھے کی بات

نہ سمجھیے ۔ نصابی کتاب عربی یا سنسکرت یا لاطینی ہی میں کیوں نہ لکھی گئی ہو ، اس پر اردو یا فارسی یا ترکی میں درس دینا ممکن ہے ۔ کسی زبان میں نصابی کتابیں وہ لوگ لکھتے ہیں جو اس زبان میں طالب علم کو درس دیتے ہوں ۔ یہ کام کتابوں کے بیوپاری نہیں کر سکتے ۔ اگر آپ میرے اس دعوے سے متفق ہوں تو آپ تسلیم فرمائیں گی کہ ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے قومی زبان میں تعلیم دینا مقدم ہے اور قومی زبان میں نصابی کتابوں کا ظہور مؤخر ۔ دنیا بھر کی تعلیمی تاریخ میں یہی ہوتا آیا ہے ۔ جو حضرات آپ کو اپنا خاص مضمون اردو میں پڑھانے سے اس بنا پر روکتے ہیں کہ اس مضمون پر اردو میں ابھی کتابیں نہیں لکھی گئیں ، ان کی مثال اس بزرگوار کی سی ہے جس نے کسی بچے کو بگلا پکڑنے کا گُر یہ بتایا تھا کہ سب سے پہلے بگلے کے سر پر موم رکھنا ضروری ہے ، حالانکہ اصل کام بگلے کو پکڑنا ہے ۔ اس کے بعد اس کے سر پر موم رکھنا ضروری معلوم ہو تو رکھا جا سکتا ہے ۔ بنیادی مسئلہ علم کو اپنی زبان ، اپنی تہذیبی زبان ، میں پڑھانا ہے ۔ دوسرے مسائل فُروعی حیثیت رکھتے ہیں ۔ تاریخِ تعلیم پر نظر ڈالیے تو آپ کو بعض چوٹی کے معلّمین ایسے ملیں گے جو کسی نصابی کتاب کے نہ ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ درجے کی تدریس کا فریضہ بجا لاتے تھے ۔ ہمارے حالات بلاشبہ مختلف ہیں لیکن ہمارے لیے انگریزی زبان کی نصابی کتابیں بڑی سہولت سے درس و تدریس کی بنیاد بن سکتی ہیں ۔ اگر ہم اپنی کسی تہذیبی زبان میں وہی نکات سمجھائیں جو انگریزی کتابوں کا موضوع ہیں تو یقین رکھیے کہ افہام و تفہیم کے عمل میں بہت سہولت پیدا ہوگی ۔ اس طرح ہمارے طلبہ اپنی انگریزی کتابوں کا مضمون بھی بڑی حد تک سمجھ سکیں گے اور تعلیم کا عمل محض ایک غیر زبان کے لفظوں کی بازی گری نہ رہے گا ۔ جیسا میں نے ابھی کہا ، قباحت اس میں ہے کہ ہم

جدید علوم کو انگریزی کے ذریعے سے پڑھیں ۔ اس طرح ہم ان علوم پر غالب نہیں آتے بلکہ ان سے مغلوب ہو جاتے ہیں ۔

اپنے زمانے میں سید احمد خاں کی پوری کوشش یہ تھی کہ ہم جدید علوم کے دریا کے تیراک ضرور بنیں ، لیکن ہمارا سر بہرحال پانی کے اوپر رہے ۔ جب بیسویں صدی شروع ہوئی تو سرسید کی تمام احتیاطوں کے باجود بعض لوگ غرقاب ہونے لگے اور جب وہ زمانہ آیا کہ ہماری صدی اپنے دوسرے نصف میں داخل ہو تو غرق ہونے والوں کا اوسط نمایاں طور پر بڑھ گیا ۔ اب میکالے کی سو ، سوا سو برس پرانی بات پوری ہوئی کہ انگریزی علوم کو انگریزی زبان کے ذریعے سے سکھاؤ تاکہ دیسی باشندوں کی ایک ایسی جماعت ظہور میں آئے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو دیسی ہو لیکن عادات و اطوار ، خیالات و افکار اور افتادِ طبع کے لحاظ سے انگریز ہو ۔

خواتین و حضرات ، یہ وہ منزل ہے جہاں دل میں خود بخود سوال اٹھتا ہے کہ جس طرح ہمارے تعلیم یافتہ مردوں کی ایک جماعت میکالے کے تعلیمی نظریّات کی بھینٹ چڑھ گئی ، کیا اب ہماری عورتیں بھی اسی مہلک سفر پر روانہ ہوں گی ؟ ظاہر ہے کہ عورتوں کو بھی علم پر ویسا ہی حق ہے جیسا مردوں کو ، بلکہ عورت جب طالب علم بنتی ہے تو مطالعے میں مرد سے شاید کچھ زیادہ یک سوئی اور انہاک کا ثبوت دیتی ہے ۔ گزشتہ بیس برس میں ہماری طالبات نے خصوصیت سے اس یک سوئی اور انہاک کا ثبوت دیا ہے ۔ لیکن جس بات پر دل میں کبھی کبھی شبہات اٹھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں بھی تو ایک غیر ملکی اور غیر اسلامی ذریعۂ تعلیم کا سہارا لیے ہوئے تحصیلِ علم کر رہی ہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر زبان کا اپنا الگ تہذیبی پس منظر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے ۔ چنانچہ ہر غیر زبان جو ذریعۂ تعلیم بنائی جائے ، پڑھنے والے کے علم کو اپنے ملفوف

خیالات و اعتقادات کا ٹیکا لگا دیتی ہے - ہماری بیٹیاں جو ایک غیر زبان کے ذریعے سے شب و روز علم حاصل کرتی ہیں ، وہ اپنی نسوانی فطرت اور قومی ضمیر کا ساتھ دیں گی یا سمندر پار سے آئے ہوئے عقائد و افکار کے تقاضوں کے سامنے ہار مان جائیں گی -

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ہماری عورتیں ہماری تہذیبی روایات کی سچی امانت دار ہیں - اس یقین کی بنیاد پر مجھے اس کالج سے فارغ التحصیل ہونے والی طالبات سے توقع ہے کہ وہ اپنے عظیم الشان قومی ورثے کی حفاظت عمر بھر کریں گی - افسوس ہے کہ کلامِ حالی کا مطالعہ آج کل فیشن میں داخل نہیں رہا ، یہاں تک کہ اس بزرگ رہنما اور شاعر کے کلیات کا کوئی چھپا ہوا نسخہ بھی ہمیں دست یاب نہیں ہے ورنہ آپ کو خود بخود اندازہ ہوتا کہ عورت کے کردار کے متعلق جو کچھ میں نے کہا ہے ، وہ ، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ، حالی نے اپنی نظم ''چپ کی داد'' میں بہتر طریقے پر بیان کردیا ہے - اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی نے بھی عورت کا ایک خاص تصوّر ہماری نئی شاعری میں پیدا کیا مگر نسائیت کی اس سے بالکل مختلف تصویر ہمیں حالی کے کلام میں ملتی ہے - حالی نے جو کچھ کہا ہے وہ عورت کے متعلق ہماری صحیح قومی و تہذیبی روایت کا مرقع ہے - میں اپنی ان گزارشات کو آپ کے دلی شکریے کے ساتھ حالی کے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں - آج ان اشعار کو آپ کے لیے ایک پیغام کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے :

اے ماؤ ، بہنو ، بیٹیو ، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں ، قوموں کی عزّت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں ، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں ، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن ، تم بِن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس ، جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی ہو تصویر تم ، عفّت کی ہو تدبیر تم
ہو دین کی تم پاسباں ، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا ، طینت میں ہے مہر و وفا
گُھٹّی میں ہے صبر و رضا ، انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں ست والے تھے جو ، ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتیو ! لے دے کے اب ست تم سے ہے

☆ ☆ ☆

ہماری تعلیم کا ماضی، حال اور مستقبل

(پاکستان کونسل لاہور میں تقریر، ۱۴- اگست ۱۹۶۷)

استقلالِ پاکستان کے ساتھ ہی جس طرح ملک کی تجارت اور معیشت میں، ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد کے رخصت ہو جانے سے، ایک خلا پیدا ہؤا، اسی طرح نظامِ تعلیم میں بھی ایک نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی - بہت سے مدرسے اور کالج بند ہو گئے - کتب خانے، تجربہ گاہیں اور طلبہ کے کھیل کے میدان یا برباد ہوئے یا تباہ حال مہاجرین کے لیے جائے پناہ بن گئے - پاکستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو اساتذہ میں سے صرف بیس ایسے تھے جو لاہور میں علم کی شمع کو روشن رکھنے کے لیے باقی رہ گئے - ڈھاکا یونیورسٹی کو، جو ۱۹۴۷ع تک محض ایک اقامتی یونیورسٹی تھی، یک بیک پچاس کے قریب ایسے کالجوں کا الحاق منظور کرنا پڑا جو اس سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق تھے - قوم کے لاکھوں بچے داخلے کے لیے ایسے مدارس کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے جو مُدّرسوں کے قحط کی وجہ سے نہ صحیح معنوں میں کھلے تھے، نہ بند — اس افراتفری میں معیارِ تعلیم کا جو حال ہؤا وہ سب پر عیاں ہے -

یہ اگست ۱۹۴۷ کی تصویر ہے - اس کے مقابلے میں اگست ۱۹۶۷ کی تصویر دیکھیے کہ اب ہمارے ملک میں بارہ یونیورسٹیاں، غالباً تین سو سے زیادہ کالج اور ہزارہا مدارس کام کر رہے ہیں - یہ وہی معجزانہ کیفیت ہے جس کے ماتحت خود پاکستان کا استحکام عمل

میں آیا - یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہو سکا؟ اس کی مختصر روداد میں آپ کو سنائے دیتا ہوں -

نومبر ۱۹۴۷ میں پاکستان کی نوزائیدہ حکومت نے ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس کے نام قائدِ اعظمؒ نے ایک پیغام میں فرمایا :

''اِس سوال کا حل ہمیں صدقِ دل سے تلاش کرنا چاہیے اور اپنی تعلیمی حکمتِ عملی اور نظامِ کار کو اُن اصولوں پر ڈھالنا چاہیے جو ہمارے قومی مزاج کے مطابق اور ہماری تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے حالات اور اُن عظیم تغیّرات کا لحاظ رکھتے ہوں جو تمام روے زمین پر ظہور پذیر ہوئے ہیں - . . . اس امر کی فوری اور شدید ضرورت ہے کہ ہماری قوم کو سائنسی اور تکنیکی تعلیم دی جائے تاکہ ہماری آیندہ معاشی زندگی کی تعمیر ہو سکے اور یہ اہتمام ہو کہ ہماری قوم سائنس، تجارت، کاروبار، اور بالخصوص صحیح طور پر منظّم صنعتوں کی طرف مائل ہو - . . . اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی آئندہ نسل کی سیرت کی تعمیر و استحکام کا سامان کرنا ہے - ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ صحیح قسم کی تعلیم کے ذریعے سے اپنی آئندہ نسل میں اعلیٰ درجے کی شرافت، دیانت، ذمہ داری اور قوم کی بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا کریں -''

پاکستان کی اِس پہلی تعلیمی کانفرنس کی چند اہم سفارشات یہ تھیں کہ ہمارے نظامِ تعلیم کی بنیاد اسلامی عقائد پر رکھی جائے اور اس سلسلے میں اخوتِ انسانی، رواداری اور معاشرتی انصاف کا خاص لحاظ کیا جائے - کانفرنس نے ایک تعلیمی مشاورتی بورڈ، تکنیکی تعلیم کی ایک کونسل اور ایک انٹر یونیورسٹی بورڈ کے قیام کی بھی تجویز کی - ان سفارشات کی بنا پر آیندہ چھ برس میں یونیورسٹیوں کی تعداد تین سے

بڑھا کر چھ کر دی گئی (پشاور یونیورسٹی ۱۹۵۰ میں قائم ہوئی، کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۱ میں اور راجشاہی یونیورسٹی ۱۹۵۳ میں)۔ پچاس کے قریب نئے کالج قائم ہوئے اور تعلیمی بجٹ ۶۱،۱۱،۰۰۰ روپے سالانہ سے بڑھتے بڑھتے ۲،۲۸،۳۳،۰۰۰ روپے سالانہ ہو گیا۔

۱۹۵۳ تک پاکستان کی تعلیمی ترقی کی یہ کیفیت میں نے آپ کے سامنے فخریہ طور پر پیش نہیں کی۔ نو دس کروڑ کی قوم کی تعلیم کے لیے چھ برس کے عرصے میں صرف اتنی سی کارروائی افسوس ناک طور پر ناکافی معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوئی کہ آزادی کے دورِ اول میں پاکستان کو کچھ زیادہ ہی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کی بکھری ہوئی فوج کو ایک ایسی عسکری طاقت بنانا جو ملک کا دفاع کر سکے، ملک کی ناموجود آزاد معیشت کو وجود میں لانا، پناہ گزینوں کا مسئلہ، قائدِ اعظمؒ کی وفات اور لیاقت علی خاں کی شہادت، یہ سب مسائل بڑے حوصلہ فرسا تھے۔ اس کے بعد یہ مصیبت آ پڑی کہ سیاسی رد و بدل کی رفتار خلافِ توقع تیز ہونے لگی۔ ان حالات میں تعلیم کے مسئلے کا نظر انداز ہوتے رہنا قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ (یہاں اِتنا عرض کر دوں کہ قوم کی کوتاہیوں کی یہ تاویل میں آج کر رہا ہوں، ورنہ جس زمانے کا ذکر ہے اُس وقت میں نے کئی مرتبہ تعلیم سے حکومت کی بے رخی پر اپنے دلی رنج و تشویش کا اظہار کیا تھا)۔

اُسی زمانے میں تعلیم کا پہلا پنج سالہ منصوبہ تیار ہوا اور بعض امریکی یونیورسٹیوں سے پاکستانی یونیورسٹیوں کے روابط کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کی مدت ۱۹۵۵ سے ۱۹۶۰ تک مقرر کی گئی تھی۔ اس منصوبے میں اعلیٰ تعلیم کی اصلاح و استحکام پر خصوصیت سے توجہ کی گئی اور دو شقوں پر زیادہ زور دیا گیا۔ اول، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نظم و نسق اور مالی معاملات

کی از سرِ نو تنظیم ، دوم ، تدریس و تحقیق کا معیار بلند کرنے کی کوشش - پہلی شق کو عمل میں لانے کے لیے یہ صورت تجویز کی گئی کہ یونیورسٹیوں کو بعض حدود کے اندر خود مختار کر دیا جائے اور ملحقہ کالجوں میں معیارِ تعلیم قائم رکھنے کی ذمہ داری اُن پر ڈالی جائے - دوسری شق کے لیے یہ تجویز ہوئی کہ یونیورسٹیاں تحقیقی کام کو خاص طور پر فروغ دیں ، اور اچھے سے اچھے اساتذہ فراہم کرنے کے لیے مناسب کارروائی کریں ، نیز طے ہؤا کہ ایف ۔ اے - کے دو برس مدرسے کی مدت سے ملا دیے جائیں اور انٹرمیڈیٹ کی جماعت کالج سے الگ کر دی جائے - اس دوران میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کی مجموعی تعداد دگنی ہو گئی - تکنیکی تعلیم پر خاص توجہ ہوئی مگر عام مدارس میں معیارِ تدریس بدستور غیر تشفی بخش رہا - یونیورسٹیوں نے معیارِ تدریس و تحقیق کو بلند کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ، وہ نمایاں طور پر نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے -

پہلا پنج سالہ منصوبہ ابھی انجام کو نہیں پہنچا تھا کہ دسمبر ۱۹۵۸ میں صدرِ پاکستان نے قومی تعلیم کے مسائل پر از سرِ نو غور کرنے کے لیے بارہ ماہرینِ تعلیم پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کر دیا - اس کمیشن کی تیار کی ہوئی مفصل رپورٹ اگست ۱۹۵۹ میں حکومت کو پیش ہوئی اور ۱۹۶۰ کے اوائل میں حکومت نے اس کی سفارشات پر اپنی منظوری دے دی - کمیشن کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم کے متعلق حکومت کے طرزِ عمل میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی - اب تک تعلیم کو ایک کارِ خیر کی حیثیت حاصل رہی تھی جسے کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرنا یا پسِ پشت ڈالنا جائز سمجھا جاتا تھا - کمیشن نے ثابت کیا کہ تعلیم کا عمل معاشی ترقی کا بنیادی عمل ہے اور اقتصادی پہلو سے تعلیم انسانی وسائل میں سرمایہ کاری کی حیثیت رکھتی ہے - اس احساس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمات

کی مالی بے چارگی کا مداوا کرنے کے لیے پیہم کوشش شروع ہوئی۔ ۱۹۵۹ اور ۱۹۶۳ کے تعلیمی اعداد کا مقابلہ کیجیے۔ مغربی پاکستان میں تعلیم پر کُل خرچ ایک کروڑ نوے لاکھ روپے سے بڑھ کر گیارہ کروڑ تیس لاکھ روپے تک پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان میں ترقی کی رفتار اور بھی خوشگوار ثابت ہوئی۔ یہاں تعلیم پر کل خرچ ۱۹۵۹ کے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سے بڑھتا ہؤا ۱۹۶۳ میں تیرہ کروڑ اسّی لاکھ تک جا پہنچا۔ اِس معاملے کو پہلے، دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کی روشنی میں دیکھیے؛ پہلے منصوبے میں تعلیمی ترقی کے لیے تیئیس کروڑ کی سرسری سی رقم مقرر ہوئی تھی۔ دوسرے منصوبے میں یہ رقم بڑھ کر ایک ارب دس کروڑ اور تیسرے منصوبے (۱۹۶۵ تا ۱۹۷۰) میں دو ارب سینتیس کروڑ تک جا پہنچی۔

تعلیمات کی معاشی اہمیت کو تسلیم کرانے کے علاوہ تعلیمی کمیشن نے قومی تعلیم کو معاشی ترقی کا زینہ بنانے کے لیے بعض اہم اور مفید تجاویز پیش کیں۔ اب تک کیفیت یہ رہی تھی کہ مدرسے سے لے کر یونیورسٹی کی منزل تک ہماری تعلیم کا انداز کتابی اور ''ادبی'' تھا۔ کمیشن نے تعلیمی سانچوں کو اول سے آخر تک بدل ڈالنے کی سفارش کی تاکہ طلبہ کو سائنسی اور تکنیکی علوم کی تحصیل کی رغبت ہو۔ مدارس کے نصاب میں اس طرح کا تنوّع پیدا کیا گیا کہ نوعمر طالب علم کو حسبِ ذوق و خواہش سائنس، صنعتی فنون، زراعت، تجارت، یا خانگی معیشت جیسے کارآمد مضامین انتخاب کرنے کا موقع حاصل ہو۔ قومی صنعت و حرفت کے دائرے میں مفید کارکنوں کی جماعت پیدا کرنے کے لیے بہت سے پالی ٹکنک قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔ انجینئرنگ اور زراعت میں سائنسی تحقیق کی منزل کو قریب

لانے کے لیے کمیشن نے دونوں صوبوں[1] میں ایک ایک انجنیئرنگ اور زرعی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کی ۔ ان سفارشات پر کامیابی سے عمل درآمد ہؤا ۔ ۱۹۵۶ میں ہمارے پاس تین پالی ٹکنک تھے ۔ اب ان کی تعداد تیس سے اوپر جا چکی ہے ۔ ۱۹۶۰ تک پاکستان میں چھ یونیورسٹیاں تھیں ۔ ۱۹۶۱ میں دو انجنیئرنگ اور دو زرعی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ۔ اس کے بعد دو سال ہوئے اسلام آباد میں ایک ایسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جو واضح طور پر سائنسی تحقیق کے کام کے لیے وقف رہے گی ۔ اس کے علاوہ گزشتہ سال چاٹگام میں ایک نئی عمومی یونیورسٹی ، علوم و فنون کے لیے ، قائم ہوئی ۔

معنوی طور پر تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کی سب سے اہم اور قابلِ قدر خدمت یہ تھی کہ اس نے ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کا مسئلہ ایک واضح نصب العین کی حیثیت سے حکومت کے سامنے پیش کیا ۔ اس موضوع پر کمیشن کی رپورٹ میں ایک پورا باب نہایت قابلیت سے لکھا ہؤا موجود ہے ۔ خواتین و حضرات ، اگر یہ باب آپ کی نظر سے نہیں گزرا تو میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ کمیشن کی بالغ نظری اور تعلیمی فراست کا اندازہ کرنے کے لیے اس باب کا مطالعہ ضرور کیجیے ۔ کمیشن نے تعلیم کی اعلیٰ ترین منزلوں تک ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے لیے پندرہ سال کی مدت تجویز کی تھی اور یونیورسٹیوں کی ترقی پسندی کو دعوت دی تھی کہ اس بارے میں مناسب اقدامات کیے جائیں ۔ کمیشن کی مقرر کی ہوئی پندرہ سال کی مدت میں سے تقریباً آٹھ سال اب تک گزر چکے ہیں ۔ اس تمام عرصے میں مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں میں سے بعض نے تو اس بارۂ خاص میں کامیابی سے چپ سادھ رکھی ۔ دو نے کسی حد تک جنبش کی ۔ کراچی یونیورسٹی کے طلبہ کو قومی

۱۔ مغربی اور مشرقی پاکستان ۔

تعلیم کے کمیشن کے قیام سے بھی پہلے قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا اختیار حاصل تھا لیکن یہ یونیورسٹی ابھی تک اختیار کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکی - پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ اور ۱۹۶۴ کی درمیانی مدت میں قومی زبان کو قبول کرنے کے لیے کچھ غوں غاں کی تھی لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد اس یونیورسٹی کے منہ پر کچھ ایسی مُہرِ سُکوت لگی کہ ٹوٹنے میں نہیں آتی - در اصل ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ دفتری زبان کے مسئلے سے اُلجھا ہؤا ہے - جب تک دفتری زبان کی گتّھی نہ سلجھے ، ذریعۂ تعلیم کے مسئلے کو تعلیمی سطح پر حل کرنا دشوار نظر آتا ہے -

خواتین و حضرات ! یہ ہے ہماری قوم کی بست سالہ تعلیمی جد و جہد کی داستان - مجھے یقین ہے کہ آپ یہ تسلیم کریں گے کہ تعلیم کے میدان میں اگر ہماری طرف سے کسی خاص کرامات کا ظہور نہیں ہؤا ، تو بھی ہمارا جو قدم اٹھا ہے ، وہ ہمیں کچھ آگے ضرور لے گیا ہے ، بلکہ گزشتہ چھ سات برس میں ہماری رفتار خاصی تیز رہی ہے -

ایک سوال البتہ ایسا ہے جو ممکن ہے میری طرح کبھی کبھی آپ کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہو - ہماری تعلیم کی منزلِ مقصود کیا ہے ؟ اقتصادی خوش حالی ؟ یا روحانی طمانیت ؟ یا بیک وقت دونوں ؟ پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیا ایک ہی رخ پر سرگرمِ عمل رہ کر ہمارے لیے یہ ممکن ہوگا کہ ہم بالآخر اقتصادی خوش حالی اور روحانی طمانیت کی دوگانہ منزل تک جا پہنچیں ؟ جی چاہتا ہے کہ ایسا ممکن ہو ، لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ جس طرح مسافر بیس میل چل کر ایک بار پھر رکتا ہے اور دائیں بائیں دیکھتا ہے کہ میں اپنی منزلِ مقصود سے بھٹک تو نہیں گیا ، اسی طرح ہم بھی اس مقام پر رک کر سوچیں کہ کیا ہمارا نظامِ تعلیم واقعی ہمارے لیے مادّی خوش حالی اور ذہنی آسودگی کا باعث بن سکے گا ؟

یہ سوال گزشتہ مہینے، جب میں جرمنی کی یونیورسٹیوں کا معائنہ کر رہا تھا، رہ رہ کر مجھے ستاتا رہا۔ سائنس اور صنعت و حرفت کے میدان میں جرمنی کی عظیم الشان ترقی کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے ملک نے اپنے ہنرور سائنس دانوں کی مدد سے اپنی زمین کو فردوسِ بریں کا نمونہ بنا دیا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ پیمانے پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے، وہ تمام ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے لیے عبرت کا سامان ہے۔ پھر بھی یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ خوش نہیں ہیں۔ میرے مغربی برلن میں وارد ہونے سے کچھ ہی عرصے پہلے یونیورسٹی کے نوجوانوں نے شہر کے بازاروں میں خوفناک ہنگامے کیے اور پولیس کی گولیاں کھائیں۔ یہ کیفیت جرمن یونیورسٹیوں کے طلبہ ہی پر موقوف نہیں ہے، امریکا اور برطانیہ میں بھی اسی ذہنی ناآسودگی کے آثار بڑی وضاحت سے نمودار ہو چکے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کی دانشمندی اور دیانت پر بھروسا نہیں رہا۔ ہر ملک کے نوجوان اپنی اپنی حکومت کو کنکھیوں سے دیکھتے ہیں کہ اس کی کون سی چال کہاں ٹیڑھی پڑتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں یہ عالم ہے کہ استاد اور شاگرد ایک دائمی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ بان یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے مجھے بتایا کہ اُن کی یونیورسٹی کے طلبہ نے اساتذہ کے دیے ہوئے اسباق پر اپنی طرف سے تنقید شائع کرنے کا حق حاصل کر لیا ہے۔ امریکا میں یہ حال ہے کہ اساتذہ کا تقرّر کرنے والی کمیٹیوں میں طلبہ کے نمایندے بھی شامل ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں طلبہ کی ہر یونین گویا یہ کہتی ہے کہ یونیورسٹی کا انتظام ہمارے ہاتھ میں دو، پھر دیکھو کہ یونیورسٹی کی ایک ایک کل کس طرح درست رہتی ہے! یہ امر واضح رہے کہ مادّی آسائشیں جو اِس وقت امریکا، برطانیہ اور جرمنی کے لوگوں کو میسّر ہیں، اِس سے پہلے نسلِ انسانی کو کبھی نصیب نہیں ہوئیں۔ بایں ہمہ اُن ملکوں

کے غضبناک نوجوان اپنے حالاتِ گرد و پیش کے شاکی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کسی بلند نصب العین کا مفقود ہونا ان نوجوانوں کی گرانیٔ خاطر کا باعث ہے۔ یا شاید وہ توقعات جو اِن نوجوانوں نے انسان کی شرافت سے وابستہ کی تھیں، وہ سب انھیں برباد ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور سوائے تلخ و تند جرح کے انھیں سکونِ قلب کا اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔

مغربی تمدّن کے متعلق یہ ہم عصر حقائق میں کیوں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں؟ اس لیے کہ آپ کی خدمت میں تاریخِ انسانی کا یہ عام اصول پیش کروں کہ کسی تمدّن کے عناصرِ ترکیبی کا تجزیہ کیجیے تو ہمیشہ معلوم ہوگا کہ یہ تمدّن ایک خاص قسم کے نظامِ تعلیم نے پیدا کیا تھا۔ اب اگر آپ گزشتہ ایک سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ ہم نے اپنے نظامِ تعلیم کو جس نمونے پر وضع کیا ہے، وہ مغربی دنیا کا نظامِ تعلیم ہے۔ اگر اس نظامِ تعلیم کے آخری نتائج مغربی دنیا میں وہ نکلے ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی آپ سے کیا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہمارا اپنا نظامِ تعلیم جس تمدّن کی بنا قائم کرے گا اُس کے عواقب ہمارے لیے کچھ مختلف ہوں گے؟ آپ شاید یہ فرمائیں کہ ہم اسلام کے نام لیوا ہیں، مگر یقین مانیے کہ اہلِ مغرب بھی مسیحیّت کا نام اسی خشوع و خضوع سے لیتے رہے تھے، تاہم جب "افرنگ کا ہر قریہ" بالآخر "فردوس کے مانند" بن گیا تو نتیجہ ایمان و ایقان کی گم شدگی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ کہیں یہ نہ خیال فرمائیے گا کہ میں رہبانیت کی تلقین کرنے کی نیّت رکھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ مادّی آسائشوں کے ساتھ انسان اپنی روح کی طمانیت کو بھی برقرار رکھ سکتا ہے۔ مسلمان اقوام کا نظامِ تعلیم جس کی بنیاد ساتویں صدیٔ عیسوی میں رکھی گئی، تین سو برس کے اندر ایک عظیم الشان تمدّن کا خالق بن گیا، لیکن اس

تمدّن میں ایک ہزار سال بعد بھی وہ اضطراب اور تلخی پیدا نہ ہوئی جس کے آثار مغرب کے پنج صد سالہ تجربے کے دوران ہی میں ظاہر ہونے لگے ہیں۔ مسلمانوں کا تمدّن کوئی رہبانی قسم کا تمدّن نہ تھا۔ جس نظامِ تعلیم نے اس تمدّن کو پیدا کیا، اس کے اجزا میں ہیئت، ریاضی، ہندسہ، طبیعیات، کیمیا، طب، علمِ نباتات، سبھی شامل تھے اور اِنھی علوم کی بنا پر جہاز رانی، جغرافیائی اکتشاف، صنعت و حرفت، تجارت، نقاشی، موسیقی اور تعمیر کو ترقی ہوئی تھی۔ یہ تمدّن بھی انسان کے لیے مادّی راحت و آرام اپنے ساتھ لایا تھا مگر یہاں اُس کانٹے کی خلش نہ تھی جو آج مغربی تمدّن کی مادّی آسائشوں کو ناکارہ کرتا ہؤا نظر آتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ مغربی اقوام کے تمدّن اور مسلمانوں کے دورِ عروج کے تمدّن، دونوں کی ایک ہی مشترک بنیاد تھی۔ اب یہ حقیقت مغربی دنیا میں بھی تسلیم کی جانے لگی ہے کہ مغرب کا نظامِ تعلیم خود مسلمانوں ہی کے نظامِ تعلیم پر مبنی تھا۔ اس پر سوال ہوگا کہ مغرب ہی میں اُس نظامِ تعلیم کے ثمرات کیوں تلخ ثابت ہوئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کا قائم کیا ہؤا سائنسی نظامِ تعلیم اٹھارھویں صدی کے یورپ میں ایک ایسے رخ پر چل نکلا جو اس کا اصل رخ نہ تھا۔ چنانچہ آج اگر ہم کسی مغربی ملک کے نظامِ تعلیم کی ہوبہو نقل کریں تو گویا اپنی علمی و تہذیبی روایت کے ایک اہم حصے کا انکار کریں گے۔ یورپ سے سبق سیکھ کر سائنسی اور تکنیکی تعلیم کے لیے جو کچھ ہم نے اب تک کیا وہ سب درست، لیکن اس کے ساتھ ہمارے نصاب میں بعض ایسے اجزا کا شامل ہونا ازبس ضروری ہے جن سے ایک مردِ مومن کی شخصیت کا خمیر اٹھے، جن سے ہمارے اسلاف کا تہذیبی نظریہ اور معاشرتی تجربہ آنے والی نسلوں کو منتقل ہو سکے۔ ہمارے لیے بنیادی اہمیت اس سوال کی ہے کہ

طالب علم کو کیا پڑھایا جائے؟ دوسرے سوالات کہ کون پڑھائے، کیونکر، کہاں اور کتنی مدت تک پڑھائے، ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہمیں ایسے اہلِ بصیرت ماہرینِ تعلیم کی رہنمائی درکار ہے جو ہمیں دورِ حاضر کے مقتضیات کے علاوہ اسلامی روایت کے مقتضیات پر پورا اترنے والا نصابِ تعلیم عطا کریں۔ ذرا غور فرمائیے کہ دو سو برس پہلے شاہ ولی اللہؒ کے نظامِ تعلیم میں حسبِ ذیل مضامین شامل تھے:

(الف) حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ۔

(ب) صرف، معانی۔

(ج) منطق، فلسفہ، علمِ کلام، تصوّف۔

(د) ہیئت، ریاضی، طب۔

یہ فہرست پیش کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہماری اولاد بیسویں صدی میں وہ کچھ پڑھے جو شاہ ولی اللہؒ نے اٹھارھویں صدی میں پڑھا تھا۔ لیکن نصابِ تعلیم میں سائنسی، عقلی اور دینی علوم کا جو امتزاج یہاں نظر آتا ہے، اس کی ضرورت ہمیں آج کے دن بھی اتنی ہی شدید ہے جتنی آج سے ایک ہزار برس پہلے تھی۔ جس طریقِ نصاب سازی نے ابن سینا جیسا سائنس داں، ابن خلدون جیسا مؤرّخ، شاہ ولی اللہ جیسا عالم اور سید احمد خاں جیسا قائدِ قوم پیدا کیا، وہ آپ کے غور اور توجہ کا کچھ نہ کچھ حق دار ضرور ہے۔

اپنے بچوں کو وہ علمی رزق نہ دیجیے جس سے اُن کے ذہنوں کی پرواز میں کوتاہی آئے۔

☆ ☆ ☆

سائنس کی ترقی کے لیے
اپنی تہذیبی زبان بہ طورِ ذریعۂ تعلیم ناگزیر ہے

یہ خطبۂ استقبالیہ سائنٹفک سوسائٹی (پاکستان) کے نویں سالانہ اجلاس میں بہ مقام لاہور، ۲۶ نومبر ۱۹۶۷ کو پڑھا گیا۔ اجلاس کے صدر ڈاکٹر محمد شفقت حسین صدیقی تھے۔ اِس خطبے میں "قومی زبانوں" سے مراد اُردو اور بنگالی ہے۔

جناب صدر، محترم مندوبین، خواتین و حضرات، میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے بہ خلوصِ تمام خوش آمدید کہتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ جن بلند مقاصد کے پیشِ نظر آپ اپنا قیمتی وقت اور ذاتی آسائش قربان کرتے ہوئے دور دراز مقامات سے لاہور تشریف لائے ہیں، یہ کانفرنس ہمیں اُن سے قریب تر لے جانے کا ذریعہ ثابت ہو۔

پنجاب یونیورسٹی میں سائنٹفک سوسائٹی کی نویں سالانہ کانفرنس کا انعقاد میرے لیے اور یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ کے لیے بہ یک وقت باعثِ فخر و مسرّت ہے۔ اربابِ علم و حکمت کا یہ منتخب اجتماع اپنی زندگی بخش یادوں کے ساتھ برسوں تک ہمارے دل و دماغ کو منّور کرتا رہے گا۔ میں نے اور میرے رفقاےکار نے اپنے محدود وسائل کے سہارے پوری کوشش کی ہے کہ آپ کی اُس کلفت کا، جو لازمۂ سفر ہے، کچھ نہ کچھ مُداوا ضرور ہو جائے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کوشش کے باوجود ہم آپ کے سفر میں حضر کی شان پیدا نہیں کر سکے۔ پھر بھی آپ کے اخلاقِ کریمانہ سے ہمیں یہ اُمید ہے کہ

اگر آپ کو قیامِ لاہور کے دوران میں آرام کی کمی محسوس ہوئی تو آپ اسے ہماری کوشش کی کوتاہی کے بجائے ہماری دسترس کی کوتاہی پر محمول فرمائیں گے۔

خواتین و حضرات، اہلِ فضل و کمال کی اس انجمن میں یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ ہر تمدّن اپنے عہد کی تہذیب کا پرتو اور ہر تہذیب اپنے عہد کے تمدّنی مظاہر کا عکس ہوتی ہے۔ جو آبادیاں بجلی کی روشنی کی فراوانی سے بقعۂ نور بن گئی ہوں، وہ دن کے جلسوں کے بجائے رات کی تقریبات پر اصرار کرتی ہیں اور صبح خیزی اُن کی خصوصیّت نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ ایک خاص قسم کا تمدّن ایک خاص قسم کی شخصی عادت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اِسی طرح ملاحظہ فرمائیے کہ کلائی کی گھڑی اور موٹر اور ہوائی جہاز کے تمدّن نے ہمیں ادنٰی فرائض کی بجا آوری میں بھی وقت کی پابندی کا عذاب ناک تصوّر دیا اور ساتھ ہی اس تصوّر کے مُبرم تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا کی۔ الغرض یہ بالکل ظاہر ہے کہ تہذیب اور تمدّن ایک دوسرے کو بے شمار معلوم و نامعلوم طریقوں سے متاثر کرتے ہیں۔

میں اِس عام عمرانی اصول کی روشنی میں اپنے مطلب کا ایک نکتہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ گزشتہ ڈھائی تین سو برس کی تاریخ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اپنی تہذیبی روایت کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں ایک کارگر، کارکشا اور توانا تمدّن کی ضرورت ہے۔ زندگی کے وہ سب ہنگامے، جو شمع و شراب و شیرینی سے لے کر سحر خیزی و تہجّد گزاری تک پھیلے ہوئے ہیں، اگر برپا ہوتے ہیں تو کسی تنومند اور سازگار تمدّن کی قوّتِ ایجاد کا سہارا لے کر۔ تاریخ کے طالب علم پر یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ جن تہذیبی قدروں کو کسی زندہ تمدّن کا سہارا میسّر نہ رہے، اُنھیں اپنا وجود قائم رکھنا دشوار

ہو جاتا ہے ۔ تہذیب ایک نازک پودا ہے جس کی زندگی کی شرط یہ ہے کہ اس کی جڑیں کسی تمدّن کی مضبوط زمین میں پیوست ہوں ۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ کا صنعتی انقلاب ایک نئی معیشت اور اُس معیشت کے نئے معاشرتی لوازم اپنے ساتھ لایا ۔ گویا صنعتی تمدّن کے ساتھ صنعتی دَور کی نئی تہذیب بھی جلوہ گر ہوئی ۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ صنعتی انقلاب کے باوجود یورپ کی قدیم تہذیبی روایت اور مقامی ضروریات نے قدم قدم پر یورپی سائنس کے اکتشافات کا رخ مقرر کیا ۔ اِس طریقِ کار کی کئی چھوٹی بڑی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ۔ ذرا غور کیجیے کہ عمارتوں کی مرکزی حرارت کاری سے لے کر خاص خاص امراض کے جراثیم کی دریافت اور اُن کے علاج تک ، یا نشاطِ زندگی کے مخصوص ذرائع کی پیدائش سے لے کر پورے نظامِ سرمایہ داری کے قیام تک ، اور پھر نظامِ سرمایہ داری کے استحکام کی غرض سے تسخیرِ عالم ، اور تسخیرِ عالم کے لیے تباہ کن ہتھیاروں کی ایجاد تک ، کتنی بے شمار منزلیں ہیں جہاں سائنس نے ، اپنی مشہور بے غرضی اور ناطرف داری کے باوجود ، یورپ کی خاص اغراض اور خواہشات کا ساتھ دیا ہے ! ظاہر ہے کہ یورپی سائنس کی حیثیت محض علمی اور نظری بھی رہی ہے اور اس حد تک عملی اور کاروباری بھی کہ اس نے یورپ کی خواہش و ضرورت اور یورپ کی روایت کے تقاضوں کو حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے ۔

ہمارے قدیم تمدّن اور ہماری قدیم تہذیب کے درمیان اسی قسم کا رشتہ صدیوں تک قائم رہا ۔ مصیبت کا آغاز اُس وقت ہوا جب مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یورپ نے مظاہرِ کائنات کا گہرا مطالعہ شروع کیا اور ہم نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا سانحہ ہے ، کیونکہ اس غفلت کا خمیازہ ہمیں اِس طرح بھگتنا پڑا کہ پہلے ہماری سیاسی آزادی سلب ہوئی ، اور

پھر ایک غیر قومی تمدّن کے نفاذ نے ہماری تہذیبی اقدار کا گلا گھونٹنا شروع کیا ۔ اگر ڈھائی تین سو برس پہلے ہم نے مغربی دنیا میں سائنس کے ظہور پر توجہ کی ہوتی تو ہم نہ صرف ملک کے تحفّظ کے لیے مناسب اسلحہ سے لیس ہوتے بلکہ ہمیں ایک ایسا سائنسی تمدّن وضع کرنے کی توفیق بھی ملی ہوتی جو ہماری تہذیبی روایات کے لیے ناسازگار نہ ہوتا ۔ اب کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ گو ہم نے ہوا کا رخ پہچان کر غالب اقوام کے تمدّن کو قبول کر لیا ہے ، مگر یہ تمدّن جس کارخانے میں سے ڈھل کر نکلا ہے وہاں وہ اوزار دستیاب نہیں ہوتے جو ہماری اپنی تہذیب کی چولیں اس بیرونی تمدّن کے چوکھٹے میں ٹھیک طرح سے بٹھا سکیں ۔

جنابِ صدر ، خواتین و حضرات ، اِن گزارشات سے میری مراد آپ کو اس حقیقت کی طرف متوجّہ کرنا ہے کہ سائنس ، اور سائنس پر مبنی ٹکنالوجی ، محض انسان کی مادّی ضروریات کو پورا نہیں کرتی بلکہ اِس پورے عمل میں ایک تہذیبی پہلو بھی شامل رہتا ہے ۔ یوں دیکھیے تو پاکستان کے سائنس داں حضرات کو ملک کے تحفّظ کے ذرائع ہی ایجاد نہیں کرنے ہوں گے ، بلکہ معاشی خوش حالی کے وسائل مہیّا کر کے ایک نئے پاکستانی تمدّن کی بنیاد بھی رکھنی ہوگی ، جس کی مدد سے ہماری تہذیبی روایت پروان چڑھ سکے ۔ اگر ایک غیر ماہر کی رائے ماہرین کی اس مقتدر جماعت کے لیے قابلِ اعتنا ہو جو اِس کانفرنس میں رونق افروز ہے تو میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلا اور سب سے اہم کام جو کرنے کا ہے ، فقط یہ ہے کہ ہم تحریر و تقریر کے ذریعے سے سائنس کے بنیادی تصوّرات کو عام کر دیں ۔ اس کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ عام فہم اردو میں سائنسی معلومات کی تبلیغ و اشاعت بڑی کثرت سے کی جائے بلکہ یہ بھی کہ قوم کے نوجوانوں کی قوّتِ مشاہدہ کو جستجو کے لطف

سے آشنا کیا جائے ۔ نیز مشاہدے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے میں جو مزہ ملتا ہے اُس سے کوئی چھوٹی یا بڑی درسگاہ خالی نہ رہنے دی جائے ۔ قومی زبان کے ذریعے سے یہ عظیم الشان کام بڑی سہولت اور کامیابی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے ۔ جب تک یہ پہلی منزل سر نہ ہوگی ، ہمارے لیے سائنس کے میدان میں بڑے کارنامے ناممکن رہیں گے ، کیونکہ بہت اونچی چوٹیاں پہاڑوں کے اُسی سلسلے میں پائی جاتی ہیں جس کے اردگرد بےشمار ٹیلے اور ٹیکرے میلوں تک پھیلے ہوئے ہوں ۔

اس ضمن میں میری دوسری گزارش یہ ہے کہ ہنگامہ خیز قسم کی نظریّاتی تحقیقات اگرچہ بڑی دلکش چیز ہے ، لیکن اس سے پہلے ہمیں معلوم نظریّات پر حاوی ہو کر اُن سے اپنی قوم کی فلاح کے لیے عملی صورتیں پیدا کرنی ہیں ۔ ان میں سب سے اہم ملک کی حفاظت اور آزادی کے استحکام کا مسئلہ ہے اور اس میں ملک کے سائنس داں بڑا قابلِ فخر حصہ لے سکتے ہیں ۔ پھر ملک کی زرعی اور معدنی دولت سے استفادے کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ۔ ہمیں اپنے میدانوں اور کوہساروں کو کرید کر ، اپنے دریاؤں اور سمندروں کو کھنگال کر ، اپنی قومی ضروریات پوری کرنی ہیں ۔ ہمارا دائرۂ کار نہ برطانیہ ہے نہ امریکہ ۔ ہماری سائنسی تحقیقات کا موضوع کسی نہ کسی طرح پاکستانی معیشت ، پاکستانی معاشرت ، پاکستانی جغرافیے ، پاکستانی تاریخ سے جا ملے گا اور جا ملنا چاہیے ۔ جس طرح ہر ملک کا سائنس داں اپنی ایجاد و اختراع کے ذریعے سے اپنی قوم کے تمدّن کا خالق ہوتا ہے ، کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ پاکستانی سائنس داں اُسی طرح ایک پاکستانی تمدّن کی بنیاد نہ رکھے ۔ اِسی قسم کے جدید قومی تمدّن کی تخلیق میں پاکستانی تہذیب کی بقا کا راز مضمر ہے ۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے بیشتر سائنسی

مفکّرین بہ تدریج سائنٹفک سوسائٹی کی تحریک سے وابستہ ہو رہے ہیں ، اور اِس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اپنا کھانا پرائی ہنڈیا میں پکانا ایک سعیِ لا حاصل ہے ۔ میں سائنس داں نہیں ہوں مگر سائنس کے ماہرین کی اِس کانفرنس سے یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ سائنس‌داں بھی ، خواہ کتنا ہی بڑا موجد اور خلّاق کیوں نہ ہو ، اپنے ذہن کی مدد سے سوچتا ہے ۔ ذہن خواہ سائنس‌داں کا ہو یا مجھ جیسے عامی کا ، اُس کی بنیادی خاصیت یہ ہے کہ حسّی تصویروں سے کہیں زیادہ لفظوں کی مدد سے کام کرتا ہے ۔ اور کن لفظوں کی مدد سے ؟ بالعموم اُنھی لفظوں کی مدد سے جنھیں اُس کی اپنی تہذیب کی زبان اُس کے سوچ بچار کی زنجیر میں بے تکلّف گوندھتی چلی جاتی ہے ۔ جہاں تکلّف کا ذرا سا روڑا راہ میں آیا ، وہیں اُس کے سوچ بچار نے ٹھوکر کھائی ۔ دوسرے کی زبان میں سوچنا ایسا ہی ہے جیسا دوسرے کے ذہن سے سوچنا ۔ یہی وجہ ہے کہ غیر زبانوں میں ہماری ذہنی کاوشیں بالعموم یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے ہم نے دوسروں کے خیالات کا چربہ اُتارا ہے ۔ مقامِ عبرت ہے کہ انگریزی زبان بولتے اور لکھتے ہمیں اب ڈیڑھ سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے ، لیکن دنیا کے سائنسی افکار کے سرمایے میں ہمارا حصہ اتنا حقیر ہے کہ اُس کا وزن ہماری کثرتِ تعداد اور ہماری مسلّمہ ذہانت سے دُور کی نسبت بھی نہیں رکھتا ۔

مجھے حیرت ہے کہ اِس صورتِ حال کے باوجود اب بھی کبھی کبھی بعض بزرگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ سائنس کے مضامین صرف انگریزی میں ادا ہو سکتے ہیں ، اور صرف انگریزی ہی میں ادا ہونے چاہئیں ۔ میرے نزدیک پاکستان میں سائنس کی دشمنی کا حق اس سے بہتر طریقے سے ادا نہیں ہو سکتا ۔ دوسری طرف جن لوگوں کو قوم کی زندگی میں سائنس کی بنیادی اہمیّت کا احساس ہے

اُن کا تقاضا ہے کہ اب وقت آ پہنچا ہے کہ سائنس کے دروازے پاکستان کی اپنی تہذیبی زبانوں پر کھول دیے جائیں تاکہ جمہورِ ملک صحیح سائنسی بصیرت سے بہرہ اندوز ہو سکیں - اگر قانونِ قدرت یہ ہوتا کہ عقل کی بات انگریزی کے سوا اور کسی زبان میں نہ کہی جا سکتی تو ظاہر ہے کہ ناروے اور ڈنمارک، فرانس اور جرمنی اور روس میں سائنس کی ترقی کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے ہوتے - صورتِ حال اس کے برعکس ہے، مگر چونکہ ان ممالک کی زبانیں انگریزی سے دور کا رشتہ رکھتی ہیں اس لیے ہمارے انگریزیت پسند بزرگ ان زبانوں میں سائنس کی ترقی کو انگریزی ہی کے فیضانِ نظر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں - مجھے یہ معلوم نہیں کہ جاپان میں انگریزی کے استعمال کے بغیر سائنسی اور تکنیکی ترقی کا جو عالم ہے، اُس کی توجیہ انگریزی پر انحصار رکھنے والے نظریے کے مطابق کیا ہے - اسی طرح چین کا حال ہے - اُسے آزاد ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں - یہ عظیم ملک اپنے دفتری اور سائنسی معاملات میں چینی زبان کے استعمال پر مصر ہے اور اس کے باوجود آئے دن خلاۓ بسیط میں نئی سے نئی ہوائی چھوڑتا رہتا ہے - لیکن سچ پوچھیے تو میرے لیے سب سے زیادہ سبق آموز فن لینڈ کی علمی و ادبی تاریخ ہے - یہ چھوٹا سا ملک مسلسل پانچ چھ سو سال تک سویڈن اور روس کے قبضے میں رہا - سو ڈیڑھ سو برس ہوئے جب اسے کسی حد تک اختیار حاصل ہؤا تو اس نے انگریزی و سویڈش یا روسی زبان کے بجائے اپنی زبان میں دفتری اور سائنسی کاروبار کی طرح ڈالی - فن لینڈ کی قومی زبان اُس وقت محض ایک دیہاتی بولی تھی - اہلِ فن لینڈ نے اسی دیہاتی بولی کی صلاحیتوں پر تکیہ کیا اور آج کیفیت یہ ہے کہ فن لینڈ کی زبان میں سائنس کے ہر شعبے، یہاں تک کہ جوہری طبیعیات پر بھی مستند کتابیں موجود ہیں -

خواتین و حضرات، اگر آپ کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی وقت ایسا بھی آنا چاہیے جب آپ کو ملک میں ہر فردِ بشر صحیح علمی یا فنّی یا سیاسی نظریات کا قائل نظر آئے، تو معاف فرمائیے کہ آپ نے انسانی فطرت سے بہت زیادہ نیک توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قیامِ پاکستان تک پاکستان کو ایک مہمل، ناقابلِ عمل اور مضحکہ خیز منصوبہ قرار دینے والے افراد کی خود مسلمانوں میں کمی نہ تھی، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کے اٹل تقاضے ہماری قومی آزادی کی صورت میں پورے ہو کر رہے۔ آج علمی دنیا میں آپ اسی قسم کی ذہنیّت سے دوچار ہیں جو بیس بائیس برس پہلے سیاست و معیشت کے عالم میں ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ مجھے اس صورتِ حال پر منغّص یا مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یاد رکھیے کہ قوم کا اجتماعی شعور قومی زبانوں کو قومی سطح پر استعمال کرنے کے حق میں دوٹوک فیصلہ کر چکا ہے۔ اِس فیصلے کا پورا ہونا اسی تاریخی عمل کی رُو سے مقدّر ہے جس نے استقلالِ پاکستان بن کر جمہوری قوتوں کی فتح پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اگر چند ذی اثر افراد سمندر پار سے آئی ہوئی ایک غیر ملکی زبان کو دائمی طور پر قومی زبان کی اَن دیکھی، اَن ہونی اور من گھڑت حیثیت دینے کی فکر میں ہیں، یا علاقائی زبانوں کا نام لے کر ملّتِ پاکستان کی طے شدہ قرارداد کو پارہ پارہ کرنے کی نیّت رکھتے ہیں، تو اُنھیں واضح رہے کہ ہماری قوم کی ناقابلِ تسخیر متّحدہ قوّت اُنھیں اسی بے پناہ تاریخی عمل کے دھارے میں بہا لے جائے گی جس میں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ کے آفتاب نے برطانوی وائسرائے اور بھارتی نیتاؤں اور بھارت پسند مسلمانوں کی مزاحمت کو خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھا تھا۔

محترم مندوبین، خواتین و حضرات، آپ کو اُردو یا انگریزی

کے متعلق منطقی بحث میں پڑنے کے بجائے اب ملک کو سائنسی تحقیق و اکتشاف کی راہ پر ڈالنا ہے۔ سائنس کی تعلیم قومی زبانوں کے ذریعے سے عام کیجیے، اور پھر یہ ثابت کیجیے کہ جب قومی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے تو دل و دماغ بیدار ہو کر تحقیق کی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں اور انسان کی نگاہوں پر علوم و فنون کے نئے اُفق کھلنے لگتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

پنجاب یونیورسٹی کی ایک سالانہ روداد

(۱۹۶۶-۱۹۶۷)

یہ روداد جلسۂ عطائے اسناد پنجاب یونیورسٹی میں ۱۰ فروری ۱۹۶۸ کو پڑھی گئی -

خواتین و حضرات ،

آج ہم اپنی یونیورسٹی کے ندوۂ سالانہ کی تقریب کے سلسلے میں ایک بار پھر جمع ہوئے ہیں - اس موقع پر آپ کی موجودگی یونیورسٹی کے سب ارکان کے لیے باعثِ مسرت و تشکّر ہے - ہمارے یہ ایک سو ایک ندوے ، جو آج کے دن تک منعقد ہوئے ، دراصل یونیورسٹی کی زندگی کے ایک سو ایک سنگِ میل ہیں ؛ مگر تحصیلِ علم کی منزل کبھی طے نہیں ہوتی اور پاکستان کی یہ سب سے قدیم یونیورسٹی تو ابھی اپنے لمبے سفر پر روانہ ہوئی ہی ہے -

خواتین و حضرات ، میں نے برس بھر پہلے آپ سے خطاب کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ معزّز مہمانوں اور سند پانے والے عزیزوں کے سامنے یونیورسٹی کی علمی و تعلیمی کارگزاری کا جائزہ پیش کرنے کو میں اپنا دل پذیر فرض سمجھتا ہوں - یونیورسٹی کی سالانہ کارگزاری کی مفصّل روداد شائع ہو چکی ہے اور آپ اسے ملاحظہ فرمائیں گے - اس وقت میں اس روداد کے بعض اہم نکات اور اپنی طرف سے اُن کی تعبیر ، آپ کی خدمت میں پیش کروں گا - یہ اہم نکات بیشتر نصابِ تعلیم کی اصلاح اور علمی تحقیق کے فروغ سے تعلق

رکھتے ہیں ۔ میں اِنھیں بنیادی مسائل کے ذکر سے اپنی گزارشات کا آغاز کر رہا ہوں ۔

۱۔ اصلاحِ نصاب : نصاب کو نئی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے گزشتہ سال جو اقدامات کیے گئے تھے انھیں مؤثر بنانے کی غرض سے متعدد تعلیمی مذاکروں کا اہتمام کیا گیا ۔ اس سلسلے میں ریاضی ، کیمیا اور معاشرتی کام کے شعبوں میں اساتذہ و ماہرین کے مذاکرے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ میں پاکستان کے محکمۂ تعلیم کا شکرگزار ہوں کہ اُس نے ہمیں ان مذاکروں کے اہتمام کے سلسلے میں گراں قدر مالی اعانت دی ۔ ان کوششوں کے علاوہ تقریباً ہر مضمون کے نصاب میں جزئی ترمیم کی گئی ۔ مثلاً ایم ۔ اے ۔ معاشیات کے نصاب میں اسلامی نظریۂ معیشت پر ایک اختیاری پرچہ شامل کرنے کی غرض سے کام شروع ہؤا ۔ اسی طرح سائنس اور معاشرتی علوم کے نصاب میں جابجا چھوٹی تبدیلیاں کی گئیں جن کی تفصیل بیان کر کے میں آپ کی سمع خراشی نہیں کروں گا ۔

گزشتہ سال میں نے اپنی روداد میں ذکر کیا تھا کہ یونیورسٹی عملی ریاضیات اور ٹھوس اجسام کی طبیعیات ، نیز نظریاتی و ریاضیاتی طبیعیات میں تحقیق و تخصّص کا ایک مرکز قائم کرے گی ۔ افسوس ہے کہ اس مرکز کا قیام ابھی منصوبہ بندی کی منزل سے آگے نہیں بڑھا ، لیکن ہم مایوس نہیں ہیں اور امید لگائے بیٹھے ہیں کہ یونیسکو اور حکومتِ پاکستان کی مدد سے یہ خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا ۔

شعبۂ علم الادویہ میں ایک پاکستانی پروفیسر کا تقرر ہو چکا ہے ، لیکن برٹش کونسل نے اسی شعبے کے لیے جس انگریز پروفیسر کے مہیا کرنے کی امید بندھوائی تھی اس کے متعلق ابھی گفت و شنید کا آخری مرحلہ طے نہیں ہو سکا ۔

شعبۂ سیاسیات کے جن پاکستانی پروفیسر کو امریکہ سے بلوانے

کی خبر میں نے گزشتہ سال آپ کو سنائی تھی ، انھوں نے یونیورسٹی میں اپنا کام سنبھال لیا ہے ۔ اُن کے آ جانے سے سیاسیات کو دس گیارہ برس کے وقفے سے ایک مستقل اور ہمہ وقتی صدرِ شعبہ نصیب ہؤا ہے ۔

یونیورسٹی کے تدریسی شعبوں کو مشرقی اور مغربی زبانوں کی ایک روز افزوں تعداد سے شب و روز واسطہ رہتا ہے ۔ اس صورتِ حال میں یہاں Linguistics کے ایک اچھے شعبے کا نہ ہونا زبانوں کی تعلیم کے مسئلے کو مشکل سے مشکل تر بنا رہا ہے ۔ میں نے طرح طرح کی دشواریوں کے باوجود ، دو تین برس کی مسلسل کوشش کے بعد ، اپنے شعبۂ انگریزی کے احباب میں سے ایک کو Linguistics میں پی ایچ ۔ ڈی ۔ کرنے کے لیے اس سال برطانیہ بھیجا ہے ۔ اُن کی واپسی پر زبانوں کی تعلیم ، بالخصوص انگریزی کی تعلیم ، کو تجربہ گاہ میں لے جا کر صوتی آلات اور دوسرے ممکن ذرائع کی مدد سے تقویت دینے کی کوشش کا آغاز ہوگا ۔

۲۔ علمی تحقیق : گزشتہ سال سنڈیکیٹ نے ''بورڈ آف ایڈوانسڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ'' کی سفارش پر فیصلہ کیا کہ اس سال سے علمی تحقیق پر صَرف ہونے والی رقم کا ستّر فی صد حصّہ سائنسی تحقیقات اور تیس فی صد معاشرتی علوم اور مختلف ادبیات و السنہ سے متعلق تحقیقات کے لیے وقف رہے ۔ اس طے شدہ اصول کے ماتحت ہم اپنے محدود وسائل کا دو تہائی سے زیادہ حصّہ اب سائنسی تحقیق پر صرف کریں گے ۔ توقع ہے کہ اس منصوبے کے ماتحت یونیورسٹی ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کرنے میں قابلِ قدر خدمت انجام دے سکے گی ۔

سائنسی تحقیق سے عام دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مارچ ۱۹۶۷ میں ایک سائنسی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے صدرِ پاکستان نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ اس قسم کی نمائش

ذوقِ تحقیق کو جِلا دینے کا وسیلہ ثابت ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اِس سلسلے کی آیندہ سالانہ نمائش کے اہتمام میں ملحقہ کالجوں کا تعاون حاصل کروں تاکہ جمہورِ قوم پر واضح ہو سکے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ملحقہ کالج کس قسم کی تحقیقی کاوشوں میں مصروف ہیں۔

شاید آپ جانتے ہیں کہ اس یونیورسٹی نے علمی تحقیق کے فروغ کی غرض سے تحقیقی کام کرنے والے نوجوانوں کے لیے تیس وظائف وقف کر رکھے ہیں۔ ان وظائف کی مالیّت کم از کم تین سو روپے ماہوار ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ قوم میں ذوقِ تحقیق کی کمی کے باعث یہ کبھی نہیں ہؤا کہ ان سب وظائف سے استفادہ کرنے والے موزوں امیدوار یونیورسٹی کو میسّر ہوئے ہوں۔ پھر جو معدودے چند میسّر ہو بھی جاتے ہیں اُنھیں اب تک اپنا تحقیقی کام کسی منظّم منصوبے کے مطابق کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان میں سے اکثر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر یونیورسٹی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اب علمی تحقیقات میں ربط و تسلسل قائم رکھنے کے لیے طے کیا گیا ہے کہ یونیورسٹی کا ہر شعبہ اپنے تحقیقی پروگرام کا پنج سالہ منصوبہ تیار کیا کرے گا۔ انشاءاللہ اس سال سے تحقیقی کام کرنے والوں کا تقرر یونیورسٹی کے انھیں شعبہ جاتی منصوبوں کے مطابق ہوگا۔

۳- تحقیقی شعبے: انفرادی تحقیق سے قطع نظر، یونیورسٹی میں چند شعبے طے شدہ منصوبوں کی روشنی میں مصروفِ تحقیق ہیں۔ ان میں سب سے قدیم شعبہ "دائرۂ معارفِ اسلامیہ" ہے۔ میں گزشتہ سال کی روداد میں بیان کر چکا ہوں کہ مولوی محمد شفیع مرحوم کی وفات کے بعد یہ شعبہ مختلف قسم کی مشکلات سے دوچار رہا، لیکن نئے انتظامات کے نتائج بہ تدریج برآمد ہو رہے ہیں اور رفتارِ کار میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

"ہسٹاریکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ" کے آٹھ برس پرانے منصوبے کی

تکمیل شاید اس روزِ سعید کا انتظار کر رہی ہے جب ہماری قوم کا ذوقِ تاریخ نگاری ایک بار پھر بیدار ہوگا ۔ فی الحال یہ انسٹیٹیوٹ طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہے جن میں سب سے بڑی مشکل قحط الرجال ہے ۔ یوں دیکھیے تو یہ بڑی قابلِ تعریف بات معلوم ہوتی ہے کہ انسٹیٹیوٹ ہماری تحریکِ آزادی کی جو تاریخ لکھ رہی ہے اس کے آٹھ باب مکمل ہو چکے ہیں اور چار نظرِ ثانی کے مراحل سے گزر رہے ہیں ۔

ادارۂ تالیف و ترجمہ نے اپنا خاموش تعمیری کام بدستور جاری رکھا ۔ معاشیات کی تقریباً آٹھ ہزار مستند اصطلاحات کتابی صورت میں شائع کی گئیں ۔ اس کے بعد سیاسیات کے مضمون میں ۱۱۷۳۳ اصطلاحوں کا استناد ہؤا ۔ یہ اصطلاحات عنقریب کتابی صورت میں شائع کی جائیں گی ۔

ریسرچ سوسائٹی اس سال بھی اپنے مفید کام میں منہمک رہی اور سوسائٹی کے ذریعے سے پانچ علمی/ تاریخی کتابیں شائع ہوئیں ۔ اسی نوعیت کی چند اور کتابیں زیرِ تکمیل ہیں ۔

''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کی بارہ جلدوں کے مضامین کے مفصّل اور مطوّل خاکے تیار ہو چکے ہیں اور متعلقہ ماہرین کی کمیٹیاں ان خاکوں کی تنقید و تنقیح کا کام بھی پورا کر چکی ہیں ۔ اب ان ابواب کی تسوید اربابِ علم و فضل کی ایک کثیر تعداد کے سپرد کر دی گئی ہے ۔ چند لکھے ہوئے ابواب ہمیں وصول بھی ہو چکے ہیں ۔

فروری ۱۹۶۹ میں دنیا کے کئی ممالک (جن میں ہندوستان کے علاوہ روس ، انگلستان اور امریکہ بھی شامل ہیں) مرزا اسد اللہ خاں غالب کی وفات کی سویں برسی منا رہے ہیں ۔ پنجاب یونیورسٹی اس تقریب کے سلسلے میں ''مجلسِ یادگارِ غالب'' کے تعاون سے اس

عظیم الشان شاعر اور ادیب کی تمام نظم و نثر شائع کرنے کا اہتمام کر رہی ہے ۔ دیوانِ اردو اور مکاتیبِ اردو کے علاوہ مرزا غالب کی تمام فارسی تصانیف کے صحیح نسخوں کی ترتیب پاکستان کے متعدد اہلِ علم حضرات کے سپرد کی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ مرزا غالب کی شخصیت اور کام کی تنقید و تحسین کے طور پر چند نئی کتابیں بھی شائع کی جائیں گی ۔

۴۔ اساتذہ و طلبہ : میری خواہش اور کوشش شروع سے یہ رہی ہے کہ یونیورسٹی ایک ایسا فعّال ادارہ بن جائے جو قوم کے نوجوانوں کی سیرت کی تعمیر صحیح اخلاق اور اسلامی بنیادوں پر کر سکے ۔ یہ ظاہر ہے کہ طلبہ اساتذہ کی شخصیت سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں ۔ اس بنا پر میں نے اپنے تمام احباب سے جن کے ذمے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا نازک مگر عظیم الشان کام ہے ، درخواست کی ہے کہ وہ تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تہذیبی اور معاشرتی سرگرمیوں میں مثبت طور پر حصہ لیں اور طلبہ سے گہرا رابطہ قائم رکھیں تاکہ وہ تعمیری مشاغل کی طرف خود بخود ایک کشش محسوس کریں ۔ میں خوش ہوں کہ شعبۂ امورِ طلبہ نے گزشتہ سال اپنی سرگرمیاں کامیابی سے جاری رکھیں اور طلبہ نے شعبے کے زیرِ اہتمام مختلف ثقافتی ، ادبی اور تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لیا ۔

مجھے یہ بیان کرتے ہوئے بے پایاں مسرّت محسوس ہوتی ہے کہ زیرِ نظر سال میں یونیورسٹی کے تعلیمی شعبوں اور یونیورسٹی کے مشمولہ و ملحقہ کالجوں میں کامل تعاون اور ہم آہنگی رہی اور باہمی دلچسپی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ان اداروں کے کئی مشترک اجلاس ہوئے ۔ اس تعاون سے یگانگی اور موافقت کی ایک ایسی فضا قائم ہوگئی ہے جو ہماری بہت سی آیندہ تعلیمی کوششوں کی کامیابی کی ضامن ہوگی ۔

میں اپنے تمام رفقائے کار کا، جن میں سنڈیکیٹ، اکیڈیمک کونسل اور یونیورسٹی کی دیگر مجالس کے ارکان، نیز تعلیمی شعبہ جات کے فاضل اساتذہ اور دفتر کے بے شمار مونس و مددگار شامل ہیں، دلی شکرگزاری سے ذکر کرنا چاہتا ہوں - یہ سب احباب سال بھر میرے دست و بازو بنے رہے - کام کی دُھن میں انھوں نے میرے ساتھ بارہا صبح کو شام اور شام کو رات کر دیا، مگر ان کے بے لوث جذبۂ خدمت میں ذرا سی کمی بھی نہ آئی - کاش میرے پاس ایسے لفظ ہوتے جن میں ان کے شکریے کا حق ادا ہو سکتا!

کوشش و کاوش کے یہ سب وسیع سلسلے جن عزیزوں کی خاطر قائم ہوئے، اور جاری رہے، آن کی ایک پوری نسل ہم سے جدا ہو کر کارزارِ حیات کی طرف روانہ ہو رہی ہے - اگر میں یہ کہوں کہ میری دعائیں ان عزیزوں کے ہم رکاب جا رہی ہیں تو یقین جانیے کہ میں نے وہ سب کچھ نہیں کہا جو میں کہنا چاہتا ہوں - یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پاکستان اور اسلام کے مستقبل کی امیدیں ہیں - خدا کرے ان کی پاکیزگیٔ نفس اور ہمت اور استقلال سے وہ سب کام پورے ہوں جو ہم سے سرانجام نہ پا سکے - آمین -

☆ ☆ ☆

پنجاب یونیورسٹی
دہ سالہ کارگزاری کا سرسری جائزہ

یہ رُوداد ۲ اکتوبر ۱۹۶۸ کو ایک خاص اجلاس میں پیش کی گئی جس کے صدر شیخ اکرام الحق قائم مقام گورنر مغربی پاکستان تھے ۔

جنابِ والا ، مہمانانِ گرامی قدر ، خواتین و حضرات ،

سب سے پہلے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اِس تقریب میں شرکت فرما کر میری اور میرے رفقا کی عزّت دہ چند بڑھائی ۔ آپ کی تشریف آوری نے ہمارے دل فخر و مسرّت سے بھر دیے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ یونیورسٹی کی کارگزاری کا جو حساب میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے والا ہوں ، وہ اس قابل ضرور ہے کہ اس باوقار مجمع کے لیے اور ، جناب والا ، خود آپ کے لیے اطمینانِ خاطر کا باعث ہو ۔

اِس مہینے پاکستانی قوم گزشتہ دس برس میں اپنی سرگرمیوں کے تمام شعبوں کی کارکردگی کا جائزہ لے رہی ہے ۔ دس برس کے اس عرصے میں یونیورسٹی کے طلبہ ، اساتذہ اور تدریسی شعبوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ۔ تدریسی شعبہ جات اور طلبہ و اساتذہ کی تعداد سال بہ سال جس رفتار سے بڑھتی رہی ، اس کا اندازہ ذیل کے نقشے

سے ہوگا :

سال	شعبہ جات کی تعداد	طلبہ کی تعداد	اساتذہ کی تعداد	متخصصین اور بیرونی ممالک کے سند یافتہ اساتذہ کی تعداد
۱۹۵۸-۵۹	۲۵	۳۱۹۹	۱۳۰	۶۵
۱۹۵۹-۶۰	۲۵	۲۹۳۲	۱۴۷	۸۸
۱۹۶۰-۶۱	۲۶	۳۴۰۶	۱۵۶	۸۹
۱۹۶۱-۶۲	۲۶	۴۰۷۷	۱۷۲	۸۶
۱۹۶۲-۶۳	۲۹	۵۱۵۹	۱۸۸	۹۹
۱۹۶۳-۶۴	۳۰	۶۲۱۱	۲۳۹	۱۳۰
۱۹۶۴-۶۵	۳۰	۶۸۷۲	۳۰۰	۱۳۳
۱۹۶۵-۶۶	۳۰	۶۳۱۱	۳۲۰	۱۳۸
۱۹۶۶-۶۷	۳۰	۶۴۷۰	۳۲۵	۱۴۲
۱۹۶۷-۶۸	۳۰	۶۶۸۷	۳۳۴	۱۵۰

ان اعداد میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں : پہلی بات یہ کہ گزشتہ دس سال میں طلبہ اور اساتذہ کی تعداد دگنی سے زیادہ ہو گئی ہے - دوسری یہ کہ اساتذہ میں ایک نصف کے قریب ایسے لوگ ہیں جو اپنے اپنے علم میں ڈاکٹریٹ رکھتے ہیں یا کم از کم اعلیٰ درجے کی مغربی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہیں -

نئے شعبوں کا قیام : اس عرصے میں چند نئے تدریسی شعبے قائم ہوئے - ۱۹۵۸ میں تدریسی شعبوں کی کل تعداد یونیورسٹی کے تین کالجوں سمیت پچیس تھی - ۱۹۶۳ میں یہ تعداد تیس تک پہنچ گئی تھی اور اب تک تیس ہی ہے - واضح رہے کہ ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۸ کی درمیانی پنج سالہ مدت میں کوئی نیا تدریسی شعبہ قائم نہیں ہوا - ۱۹۵۸ اور ۱۹۶۳ کے درمیان جو پانچ نئے شعبے قائم ہوئے ، اُن کی

تفصیل یہ ہے :

(۱) ۱۹۶۰ میں ''انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ'' کا قیام عمل میں آیا - یہ ایک نیم خود مختار ادارہ ہے جس کا بجٹ یونیورسٹی کے بجٹ میں شامل نہیں ہوتا - اِس ادارے میں فنِ تعلیم سے متعلق تدریس ، تحقیق اور تخصّص کی سہولتیں میسّر ہیں ، اور طلبہ ماسٹر آف ایجوکیشن ، ماسٹر آف آرٹس اِن ایجوکیشن اور ڈاکٹر آف فلاسفی اِن ایجوکیشن کی اسناد کے لیے تیار کیے جاتے ہیں -

(۲ ، ۳ ، ۴) ۱۹۶۲ میں Applied Psychology, Administrative Science اور انگریزی زبان و ادب کے شعبے قائم ہوئے -

(۵) ۱۹۶۳ میں شعبۂ فلسفہ قائم ہؤا -

اس سلسلے میں مقامِ مسرت ہے کہ بعض افواہوں کے علی الرّغم ہمارا کوئی تدریسی شعبہ بند نہیں ہو رہا ہے -

نئے کیمپس کی تعمیر : جو پانچ نئے شعبے ۱۹۵۸ اور ۱۹۶۳ کے درمیان قائم ہوئے (بلکہ کچھ اور شعبے بھی جو ۱۹۵۸ع سے پہلے قائم ہو چکے تھے) ابتدا میں چند سال تک کرایے کے مکانوں میں کام کرتے رہے ، یا یوں بھی ہؤا کہ کسی نئے شعبے نے کسی پرانے شعبے کو کرایے کے مکان میں بھیج کر خود اس کی جگہ لے لی - یہ صورتِ حال یونیورسٹی کو بہت مہنگی پڑ رہی تھی ، مگر بالآخر ۱۹۵۹ میں مرکزی حکومت کی خاص توجہ سے یونیورسٹی کو شہر سے باہر نئی عمارات کی تعمیر کے لیے دو ہزار ایکڑ کا ایک وسیع ٹکڑا مل گیا - یہاں ۱۹۶۰ سے ہمارے نئے کیمپس کی تعمیر شروع ہوئی اور پھر ایک ایک کر کے ہمارے وہ سب شعبے جو کرایے کے مکانوں میں تھے ، مارچ ۱۹۶۵ تک نئے کیمپس میں منتقل ہو گئے - اس کے بعد بعض پرانے شعبے بھی ، جنھیں جگہ کی تنگی کی شکایت تھی ، شہر سے نئے کیمپس چلے گئے - اس وقت نئے کیمپس میں ہمارے سولہ

شعبے ہیں اور پرانے کیمپس میں تینوں کالجوں سمیت چودہ شعبے۔

ستمبر ۱۹۶۵ تک نئے کیمپس کے پورے منصوبے کا چھٹا حصہ تیار ہو چکا تھا، مگر بھارت کے حملے کے بعد یہ کام کچھ عرصے کے لیے رک گیا۔ تدریسی شعبوں کی تعمیر تو پھر جاری نہیں ہو سکی، مگر طلبہ کے لیے تین ہوسٹل نیز اساتذہ اور انتظامی عملے کے لیے مکانات زیر تعمیر ہیں۔ امید ہے کہ یونیورسٹی میں اگلے سال آنے والے طلبہ ان نئے ہوسٹلوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ کچھ اور سکونتی عمارتوں کے نقشے بھی منظور ہو چکے ہیں۔ ان کی تعمیر عنقریب شروع ہو جائے گی۔

نئے کیمپس کی جزوی تعمیر گزشتہ دہ سالہ مدت کا بڑا کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس دور میں ہم کوئی اور نمایاں خدمت بجا نہ لا سکتے، تو بھی شہر سے یونیورسٹی کا نقلِ مکان بجائے خود ہماری تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ یونیورسٹی نئے کیمپس کی تعمیر اس لیے کر سکی کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اِس دور میں بڑی فیاضی سے ہماری مدد کی۔

طلبہ کی بہبود: اسی مدت میں جس کا ذکر میں کر رہا ہوں، چھ برس ہوئے طلبہ کی بہبود کا شعبہ قائم ہوا۔ یہ شعبہ طلبہ کے مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرتا ہے۔ طلبہ کے لیے مناسب اقامتی سہولتوں کی تنظیم، ان کے تفریحی مشاغل کا اہتمام، معاشرتی خدمت کی عملی تربیت اور جملہ امور میں طلبہ کی رہنمائی و دست گیری، اس شعبے کی کارکردگی کے اہم پہلو ہیں۔

شہر سے نئے کیمپس تک طلبہ کی آمد و رفت کے لیے بسوں کی خرید اور دیگر چھوٹی بڑی آسائشیں فراہم کرنے میں یونیورسٹی جو کثیر رقم صرف کرتی رہی ہے، نیز طلبہ کی جسمانی صحت کی نگہداشت کے لیے طبّی سہولتوں میں جو اضافے ہوئے ہیں، اُن سب کی جداگانہ

تفصیل طوالت کا باعث ہوگی - البتہ یہاں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کی مالی امداد کے سلسلے میں جو سالانہ وظائف دیے جاتے ہیں ، وہ اِس دور میں مسلسل بڑھتے چلے گئے ہیں - مالی وظائف کی مجموعی رقم جو ۱۹۵۸ میں ۱۱۰۴۵ روپے تھی ، اب ۲،۸۰،۹۷۴ روپے تک پہنچ گئی ہے -

اصلاحِ نصاب : علم کی دنیا میں ہر سال اچھی کتابوں اور نئے خیالات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے - لازم ہے کہ نصابِ تعلیم زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرے - ہم نے گزشتہ چند برس میں تمام مضامین کے نصاب کی نظرثانی کی ہے - چنانچہ کیمسٹری کے نصاب، میں Radiation Chemistry اور Analytical Chemistry کا اضافہ کیا گیا - ریاضیات کے نصاب کی تجدید ہوئی اور نئے موضوعات مثلاً Topology اور جدید الجبرا داخلِ نصاب ہوئے - ملحقہ کالجوں کے اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسوں کا اہتمام کیا گیا -

فزکس کا نصاب قیامِ پاکستان کے بعد برسوں تک جوں کا توں رہا - اب اِس میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں - میکانکس کو پہلے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی لیکن اب اس پر خاص توجہ کی جا رہی ہے - اسی طرح Low Temperature Physics اور Kinetic Theory کے موضوعات پر بھی خاصا زور دیا جا رہا ہے -

حیاتیاتی علوم میں Plant Physiology ، Molecular Biology ، Genetics اور Ecology کے دائروں میں جدید ترقیات کو خاص طور سے مطالعے کا موضوع قرار دیا گیا - Plant Biometry اور Plant Bio-Chemistry کے مضمون اب تک نظر انداز ہوتے رہے تھے - لیکن نئے نصاب میں انھیں خاص جگہ دی گئی - Zoology کے مضمون میں Radiation Biology اور Advanced Genetics کے جدید موضوعات کا اضافہ کیا گیا - Radiation Biology کی تدریس کے سلسلے میں

لاہور Atomic Energy Centre اور دیگر تحقیقی اداروں سے رابطہ قائم کیا گیا اور انھی اداروں کے تعاون سے یونیورسٹی میں اس مضمون کی تدریس کا انتظام ممکن ہو سکا۔

ملک میں Pharmaceutical Industry کی ترقی کے پیش نظر یونیورسٹی نے Pharmacy کے شعبے کو مضبوط کیا۔ بی۔ فارم۔ کے نصاب میں نئی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی کی گئی۔ دو سال ہوئے حکومت کے ایما پر ایم۔ فارم۔ کی جماعت بھی شروع کر دی گئی۔

معاشرتی علوم کے زمرے میں Political Science ، Sociology ، Economics اور History کے نصاب میں نمایاں تبدیلیاں کی گئیں۔

۱۹۶۱ میں پاکستان کی پہلی مردم شماری کے موقع پر ایسے تربیت یافتہ demographers کی ضرورت محسوس ہوئی جو فنی مہارت کے ساتھ اعداد و شمار مرتّب کرنے کے علاوہ آبادی کے مسائل پر تحقیقی کام بھی کر سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر اسی سال ہم نے ''سوشل سائنسز ریسرچ سنٹر'' میں ڈیما گرفی کے ڈپلوما کورس کا آغاز کیا۔

سائنسی ریسرچ : تدریس کے مضامین کے علاوہ گزشتہ چند برس میں یونیورسٹی نے ریسرچ پر خاص توجہ مبذول کی۔ مثلاً ذیل کے مسائل پر کام کیا گیا :

مغربی پاکستان کی پیداوار میں خام اور تیار شدہ اجناس کا غذائی تجزیہ ، نہروں سے پانی کے رسنے کا انسداد ، جھیلوں اور بندوں کے پانی کی تبخیر اور سیم زدہ علاقوں میں استعمال ہونے والے tube-well strainer میں کمی کی تدبیریں۔ اسی طرح پاکستان کے مختلف علاقوں کے جیولاجیکل نقشے تیار کیے گئے جو زیر زمین قومی وسائل کے حاصل کرنے میں مدد کا باعث ہوں گے۔ پھر ہم نے یہ تجربے بھی کیے کہ آیا گندم کی اعلیٰ پیداواری اقسام شور زدہ پانی میں آگائی جا سکتی

ہیں؟ مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کے soil fungi پر بھی تحقیقی کام ہؤا اور اِن کی مختلف اقسام دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشرقی نسل کے termites پر سائنسی تحقیق ہوئی۔ علیٰ ھٰذالقیاس corrosion، fluid flow، distillation، polymerization اور utilization of water materials وغیرہ مسائل پر تجرباتی ریسرچ کی گئی۔

اسلامی تہذیب و تمدن پر ریسرچ : سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کے پیش نظر ریسرچ پر صرف ہونے والی رقم کا سترّ فی صد حصہ سائنس کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ لیکن وہ علوم جن سے ہماری دینی اور تہذیبی روایات وابستہ ہیں، کچھ کم توجہ کے محتاج نہیں سمجھے جانے چاہیں۔ انسان روٹی کے سہارے زندہ ضرور ہے مگر صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہتا۔ تہذیب و تمدّن کے میدان میں یونیورسٹی کے چھ تحقیقی شعبوں میں سے تین ایسے ہیں جن کا میں خصوصیت سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

اول، اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام : ۱۹۵۰ میں یہ شعبہ لائیڈن کی انسائیکلوپیڈیا کی چار جلدوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم ہؤا تھا۔ ترجمے کا کام ۱۹۶۰ تک ختم ہوگیا لیکن اس دوران میں پتا چلا کہ لائیڈن اڈیشن ترمیم، اصلاح اور بے شمار اضافوں کا محتاج ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے لیے صدہا نئے مقالات لکھے گئے اور دنیا کے بڑے علمی مراکز میں، یہاں تک کہ خود لائیڈن میں بھی، پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہونے والی انسائیکلوپیڈیا کے اجزا ہاتھوں ہاتھ لیے جانے لگے۔ لائیڈن کی اصل چار جلدوں کے بجائے ہماری انسائیکلوپیڈیا کم از کم تیس جلدوں کی ضخامت تک جا پہنچے گی۔ اگر کام کی موجودہ رفتار اور سہولتیں میسر رہیں تو میرے اندازے کے مطابق پنجاب یونیورسٹی کی انسائیکلوپیڈیا ۱۹۷۵ تک مکمل حالت میں دنیا کے سامنے ہوگی۔

دوسرا تحقیقی شعبہ جس کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں ، ''ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان'' ہے ۔ اِس شعبے کو اب پانچواں سال شروع ہؤا ہے ، لیکن اس مختصر مدت میں بھی اِس نے تاریخی اور ادبی معلومات کا ایک گراں بہا خزانہ نایاب کتابوں کی اشاعت کے ذریعے سے قوم کے لیے مہیّا کر دیا ہے ۔

تیسرا قابلِ ذکر شعبہ مسلمانانِ پاکستان و ہند کی ادبی تاریخ کا شعبہ ہے ۔ اس برِّ عظیم کے مسلمانوں نے عربی ، فارسی ، اُردو ، بنگالی ، پنجابی ، پشتو ، سندھی ، بروہی ، گجراتی وغیرہ بہت سی زبانوں میں اپنے جذبات و خیالات ، اپنے مقاصد و عزائم ، اپنے دینی و معاشرتی تصوّرات کی ادبی ترجمانی کی ہے ، اور قیاس چاہتا ہے کہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں ، لہجے اور زبان کے اختلاف کے باوجود ، مسلمانوں نے ایک ہی قومی شخصیت ، ایک ہی ملّی ذہنیت کا اظہار کیا ہے ۔ یہ قومی ادبی تاریخ دراصل ہماری ذہنی و فکری تاریخ ہے اور جوں جوں اس کے نقش واضح ہوں گے ، خود پاکستان میں ہماری قومی وحدت کی بنیادیں واضح ہوتی جائیں گی ۔ اس کام کا خاکہ ہم نے ۱۹۶۵ کے موسمِ گرما میں بنانا شروع کیا تھا اور شکر کا مقام ہے کہ ادبی تاریخ کی مجوّزہ سولہ جلدوں میں سے اکثر کے نہ صرف خاکے تیار ہو چکے ہیں بلکہ ان سولہ جلدوں کی ایک تہائی کے قریب فصلیں لکھی بھی جا چکی ہیں ۔

لاہور کے باشعور اور اہلِ ذوق اصحاب کو صلائے عام ہے کہ وہ بعض غیر صحیح اطلاعات پر بھروسا کرنے کے بجائے ان تین تحقیقی منصوبوں کی صحیح قدر و قیمت کو پرکھنے کے لیے کبھی ان شعبوں تک قدم رنجہ فرمائیں ۔ اِن شعبوں کے ناظم بڑی خوشی سے ان منصوبوں کی تفصیلات سے آپ کو آگاہ کریں گے ۔

قومی زبان اور ذریعۂ تعلیم : حکومتِ پاکستان کے ایک طے شدہ

فیصلے کے مطابق اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے ۱۹۶۲ میں پنجاب یونیورسٹی نے ایک ادارۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا - ۱۹۶۴ اور ۱۹۶۵ میں بی - اے -/بی - ایس سی اور ایم - اے -/ایم - ایس سی کی سطح پر یونیورسٹی نے اردو کو انگریزی کے ساتھ اختیاری ذریعۂ تعلیم و امتحان قرار دیا - اس دوران میں یونیورسٹی کے ادارۂ تالیف و ترجمہ نے Economics ، Philosophy ، Home Economics ، Psychology ، Political Science وغیرہ کی تیس ہزار سے زائد اصطلاحات کو ماہرین کی کمیٹیوں کے سامنے پیش کر کے ان کا استناد کرایا - ان علوم کے علاوہ Astronomy ، Zoology ، Statistics ، Economics وغیرہ میں بی - اے -/ بی - ایس سی - کے لیے اُردو زبان میں بلند پایہ نصابی کتابیں مرتّب کرائی گئیں -

متفرّق ترقی پسندانہ کوششیں : ان اہم منصوبوں کے علاوہ گزشتہ دس برس میں یونیورسٹی نے بہت سے ایسے منصوبے بھی شروع کرائے جن کا زیادہ اشتہار نہیں ہؤا ، یا ایسے چھوٹے چھوٹے کام کیے جن کی خبر دنیا تک نہ پہنچی - مثلاً یونیورسٹی کا طغرا بیاسی برس بعد ۱۹۶۴ میں مشرّف بہ اسلام ہؤا ، یعنی اس کے سر سے تاجِ برطانیہ اٹھ گیا اور ایک محراب نے تاجِ برطانیہ کی جگہ لی - طغرا کی ڈھال میں کھلی کتاب پر جو لاطینی حروف لکھے تھے وہ غائب ہو گئے اور اسی جگہ کلامِ الٰہی کی ایک آیت نمودار ہوئی - اسی دور میں ہم نے ''خطبات بیادِ اقبال'' کے سلسلے کا آغاز کیا - اقبال پروفیسر شپ اور غالب پروفیسر شپ قائم ہوئیں - اِس وقت ''مجلسِ یادگارِ غالب'' مرزا غالب کی صد سالہ برسی مناسب طریقے پر منانے کی تیاریوں میں مصروف ہے - یونیورسٹی لائبریری میں عربی اور فارسی کی پرانی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتّب کرائی گئی - یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک بلند پایہ سہ ماہی Journal of Research

سائنسی اور تہذیبی و ادبی دونوں قسم کے علوم پر ہماری ریسرچ کو شائع کرنے کے لیے جاری ہؤا اور بیرونی ممالک میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا - یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ اپنے نام سے جو کتابیں شائع کر رہے ہیں وہ یونیورسٹی کی اِن مجموعی علمی سرگرمیوں کے علاوہ ہیں -

خواتین و حضرات ، گزشتہ دس برس کی مدت میں مذکورہ ترقیات کے ساتھ یونیورسٹی کے اخراجات قدرۃً بڑھتے گئے ہیں - اسی طرح اپنے ذرائع سے یونیورسٹی کی آمدنی میں بھی مسلسل اضافہ ہؤا ہے - یونیورسٹی کی مالی حالت کے متعلق ایک خبر رساں ایجنسی اور بعض اخبارات نے پچھلے دنوں جو کچھ لکھا ، اس پر تبصرے کے لیے یہ موقع صحیح نہیں ہے - البتہ گزشتہ دس برس میں یونیورسٹی کی آمد اور خرچ میں جو اضافہ ہؤا ، اس کا سال بہ سال حساب ذیل کے گوشوارے میں پیشِ خدمت ہے (اس گوشوارے کے مندرجہ ہندسے اتنے ہی لاکھ روپوں کو ظاہر کرتے ہیں) :

سال	اپنے ذرائع سے آمد	سرکاری گرانٹ	کل آمد	خرچ
۱۹۵۸-۵۹	۱۹	۳۴	۵۳	۴۹
۱۹۵۹-۶۰	۲۰	۲۴	۴۴	۴۷
۱۹۶۰-۶۱	۲۸	۲۴	۵۲	۴۶
۱۹۶۱-۶۲	۲۷	۳۵	۶۲	۵۱
۱۹۶۲-۶۳	۳۴	۳۵	۶۹	۶۱
۱۹۶۳-۶۴	۴۳	۴۰	۸۳	۷۳
۱۹۶۴-۶۵	۴۵	۴۰	۸۵	۸۶
۱۹۶۵-۶۶	۴۷	۴۹	۹۶	۹۶
۱۹۶۶-۶۷	۵۱	۴۲	۹۳	۱۱۱
۱۹۶۷-۶۸	۵۷	۴۵	۱۰۲	۱۲۳

ان اعداد سے یہ واضح ہوگا کہ بعض حلقوں کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یونیورسٹی کی اپنی آمد اتنی بھی نہیں ہوتی کہ یونیورسٹی اُس سے اپنے خرچ کا $\frac{1}{4}$ حصہ ادا کرنے کے قابل ہو - یہ بھی ظاہر ہے کہ گزشتہ دس برس میں ہمارے اپنے ذرائع سے آمد تگنی ہو گئی ہے - اگر اگلے مہینے تک سالِ رواں کا بجٹ تیار ہوگیا تو میں اِس موضوع پر اپنی سالانہ پریس کانفرنس کے دوران میں کچھ اور کہنے کی گنجائش نکالوں گا -

جناب والا ، خواتین و حضرات ، ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے - میں اس یونیورسٹی کے لیے اور کوئی امتیاز ، اور کوئی شناخت نہیں چاہتا ، بجز اس کے کہ جب آپ اس ملک کے عالموں اور معلّموں ، اس ملک کے حاکموں اور انتظامی کارکنوں ، اس ملک کے محافظوں اور مجاہدوں ، اس ملک کے قانون دانوں اور قانون سازوں ، ججوں اور وکیلوں ، انجنئیروں اور ڈاکٹروں ، ہنکاروں اور صنعت کاروں ، اخبار نویسوں اور کالم نگاروں کا شمار کریں تو یہ ضرور دیکھ لیجیے کہ ان میں پنجاب یونیورسٹی کے فرزندانِ رشید کی تعداد کتنی ہے -

بات لمبی ہو گئی مگر آپ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا - میں بے حد شکر گزار ہوں -

☆ ☆ ☆

سائنس کی ترقی کے لیے
تکلّفات سے پاک زبان کی ضرورت

یہ خطبۂ افتتاحیہ سائنٹفک سوسائٹی (پاکستان) کے دسویں سالانہ اجلاس میں بہ مقامِ کراچی، ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ کو پڑھا گیا۔

خواتین و حضرات،

سائنٹفک سوسائٹی نے اِس سالانہ علمی تقریب کے سلسلے میں مجھے از راہِ لطف و کرم جو اعزاز بخشا ہے، اُسے قبول کرنے سے پہلے مجھے بہت تامّل کرنا پڑا۔ میرا اپنا علم، جیسا کچھ بھی ہے، نہ مقدار، نہ نوعیت، کے لحاظ سے مجھے یہ حق دیتا ہے کہ میں سائنس کے ماہرین کی انجمن میں شامل ہونے کی جسارت کروں۔ اپنے اس عدمِ استحقاق کا حال جانتے ہوئے بھی اگر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں (اور بصد شکر و شوق حاضر ہوں) تو اس کے دو سبب ہیں: ایک تو سوسائٹی کے اربابِ حل و عقد کا اصرار، جو بہرصورت امتثالِ امر کا متقاضی تھا، دوسرے سوسائٹی کا بنیادی اصولِ کار، کہ سائنسی فکر کا ظہور و فروغ قومی زبان کو ذریعۂ اظہار بنائے بغیر ممکن نہیں، خود بخود میری اُس لسانی عصبیت کی تائید کر رہا تھا جسے میں نے روزِ اول سے جزوِ ایمان کی حیثیت دی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میں عمر بھر انگریزی زبان و ادب کا معلّم رہا ہوں۔ میری تعلیمی و تدریسی زندگی کا یہ تجربہ اب میرے اس عقیدے کی دلیلِ محکم بن

چکا ہے کہ کسی تہذیب کے فکر و فن اور اُس تہذیب کی زبان کا باہمی تعلق جان و تن کا تعلق ہے اور ان دونوں کی علاحدگی کا نتیجہ فکر و فن اور زبان دونوں کے لیے برا ہوتا ہے۔ آج یہاں میری حاضری کا بڑا جواز میرا یہی لسانی عقیدہ ہے جو بطور ایک قدرِ مشترک کے مجھے سائنسی علوم کے ماہروں کی اس جماعت سے وابستہ کرتا ہے۔

خواتین و حضرات، ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے جلیل القدر بانی سرسید احمد خاں مرحوم و مغفور اگرچہ اصطلاحی معنوں میں سائنس داں نہ تھے لیکن ان کی فراست نے آج سے ایک صدی پہلے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ سائنس کی سلامتی اور زبان کی خیریت اِسی میں ہے کہ یہ آپس میں گھل مل کے رہیں۔ اس بنیادی نکتے کا بیان آج ہمیں کچھ ایسا عجیب و غریب انکشاف معلوم نہیں ہوتا لیکن پچھلی صدی کے وسط میں ہمارے اہلِ قلم کا ایک خاصا بڑا طبقہ جھوٹ، مبالغے اور تصنّع کو کمالِ فن کی دلیل قرار دیتا تھا۔ ایسے حالات میں زبان اور سائنس کا قدرتی تعلق پہچاننا اور اس کی اہمیت پر اصرار کرنا عقلِ سلیم کی غیر معمولی روشنی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ ہماری قوم کے قائدِ اول نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کر کے ہمیں نہ صرف سائنس کے مطالعے کی طرف متوجہ کیا بلکہ اُردو نثر میں سائنسی مضامین کے لیے ایک مناسب اسلوبِ بیان بھی وضع کر دیا جو مبالغے اور غیر ضروری لفظی آرائشوں سے پاک تھا اور جس کی صحت و سلاست کا یہ عالم تھا کہ اُس کے ذریعے سے اعلیٰ درجے کے علمی مطالب کا بلا کم و کاست اظہار ممکن ہوگیا۔

یہ صورتِ حال اُسی کیفیت کے مانند تھی جو سرسید کے زمانے سے ٹھیک دو سو برس پہلے ''رائل سوسائٹی'' کے قیام پر انگلستان میں رونما ہوئی۔ ''رائل سوسائٹی'' نے سترھویں صدی کے انگلستان میں نہ صرف سائنسی تحریکوں کا رخ مقرر کیا بلکہ انگریزی نثر میں صفائی

اور سادگی کی وہ تحریک شروع کی جو آج اس کے لیے وجہِ فضیلت ہے - آغازِ کار ہی سے ''رائل سوسائٹی'' نے انگریزی نثر کی اصلاح کو اپنا ایک اہم مقصد قرار دیا - اور بشپ سپریٹ نے ، جو سوسائٹی کے اولین رفقا میں سے تھے ، اس مقصد کی شرح بدیں الفاظ کی :

ایک بات اور ہے جس پر سوسائٹی نے زیادہ تر توجہ کی ہے ، اور وہ ہے اسلوبِ بیان - اگر اسلوب کے مزاج کو بحال رکھنے میں احتیاط نہ کی جاتی تو سوسائٹی کے منصوبے کی اصل روح اور قوّت الفاظ کی ریل پیل اور بہتات میں گُھٹ کر فنا ہو جاتی . . . . مختصراً میں یہ کہوں گا کہ انسان کے فنّی اکتسابات میں جو چیز سب سے زیادہ زودیاب ہے وہ لفظی صنعتوں کی یہی مذموم فراوانی ، استعارات کی یہی شعبدہ بازی ، اور زبان کی یہی چرب کاری ہے جس کا آوازہ دنیا میں اتنا بلند ہے - اس نکتے کی وضاحت کے لیے ''رائل سوسائٹی'' کی اُس خدمت کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا جو اس نے علومِ طبیعی میں بے اعتدالیوں کی اصلاح کے سلسلے میں انجام دی ہے اور سوسائٹی کی علانیہ دشمنی سب سے زیادہ اِنھیں بے اعتدالیوں سے ہے - یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی نے اسرافِ لفظی کے سدِّ باب کی واحد تدبیر پر شدّت سے عمل کیا - وہ تدبیر یہ تھی کہ طوالتِ بیان ، لفظی بے راہ روی اور تکلّفات کو ایک مستقل عزم کے ساتھ مسترد کر دیا جائے اور نطقِ انسانی کے اُس دورِ اول کی پاکیزگی اور اختصار کی طرف بازگشت کی جائے جب لوگوں کے پاس جتنی باتیں ہوتیں تقریباً اُتنے ہی لفظوں میں اُنھیں ادا کر دیتے - سوسائٹی نے اپنے تمام ارکان کو ایک چُست ، سادہ ، قدرتی طریقِ گفتگو دے کر واضح جملوں ،

شفاف مطالب اور فطری بے تکلفی کا اس طرح پابند کر دیا ہے کہ وہ ہر بات کو امکانی حد تک ریاضی کی سی صفائی کے قریب لے آئے ہیں - اس غرض سے انھوں نے کاریگروں، دیہاتیوں اور دکان داروں کی زبان کو دانش وروں یا عالموں کی زبان پر ترجیح دی ہے -

خواتین و حضرات، تین سو برس پہلے کے برطانوی فاضل کی یہ رائے میں نے تفصیل سے اس لیے آپ کے سامنے پڑھی ہے کہ آپ کو اس موضوع پر سرسید کے بہت سے اقوال اور حالی کی نظم و نثر میں بار بار آنے والے متعلقہ ٹکڑے خود بخود یاد آ جائیں - سرسید اور حالی اُردو نثر کو جس مقام پر لے آئے تھے، اگر ہم اس سے پسپا نہ ہوئے ہوتے تو ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا کام اس سے کہیں زیادہ آسان ہوتا جتنا بعض لوگوں کو آج کل نظر آتا ہے - ہم فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک سے مات کھا گئے - کھوکھلی ترکیبیں اصل معنی کو گھسیٹ کر یوں ادھر اُدھر لے جانے لگیں کہ ہمارا کہا اَن کہا برابر ہو گیا - نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب ہم فتح کی خوشی نہیں مناتے، ''فتح و نصرت'' کے شادیانے بجاتے ہیں - ہمیں کبھی محض شکست نہیں ہوتی، ہمیشہ ''شکستِ فاش'' ہوتی ہے - ہم صدارت نہیں کرتے، ''صدارت کے فرائض'' سرانجام دیتے ہیں - یہ وہ منزل ہے جہاں قوم کو ''سائنٹفک سوسائٹی'' کی رہبری کی ضرورت ہے - یہ بظاہر زبان کی خدمت ہوگی مگر مجھے یقین ہے کہ اس کے بغیر سائنس کی خدمت بھی نہیں ہو سکتی - یہ دو متوازی عمل قوموں کی تاریخ میں ہمیشہ ایک ساتھ چلے ہیں - ضرورت ہے کہ سائنسی تصوّرات نپے تلے لفظوں کے کڑے سانچے میں ڈالے جائیں اور بار بار ڈالے جائیں تا آنکہ اردو کا جملہ صحتِ بیان میں انگریزی کے جملے کا مقابلہ کرے -

میری رائے میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ

اس کی کوششوں کے طفیل پاکستان کے عوام الناس کا تعارف سائنس کے آن بنیادی تصوّرات سے ہو جائے جو صنعتی دور کی آمد آمد کے ساتھ ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہوئے - میری مراد اس نوعیت کی زبان زدِ عام اصطلاحات کے مفہوم سے ہے جیسے تجاذب ، کمیّت اور وزن ، توانائی ، ایتھر، رفتارِ نور ، جوہری وزن وغیرہ - خواتین و حضرات ، اگر آپ کو اس قسم کے سائنسی تصوّرات کی ترویج کی اہمیت تسلیم ہو تو مناسب یہ ہوگا کہ ترجمے سے نہیں بلکہ تالیف کے ذریعے سے عام پسند کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے اور اس میں صحت و صراحت کے وہ معیار سختی سے قائم رکھے جائیں جن کی تشخیص تین سو برس ہوئے لندن کی ''رائل سوسائٹی'' نے کی تھی - بہتر سائنس کی تبلیغ اور بہتر اردو کی تعمیر کے لیے بہ صورتِ موجودہ اس سے زیادہ کارگر طریقِ کار شاید ہی ممکن ہو - اصلاحِ زبان کے خیال کو نظرانداز کر دیجیے ، تو بھی یہ بالکل ظاہر ہے کہ سائنس کی ترقی اسے خواص کی ایک برگزیدہ جماعت تک محدود کر دینے سے نہیں ، بلکہ عوام کے دل و دماغ پر مسلّط کر دینے سے ہوگی - آپ کو علم ہے کہ کیا سائنس اور کیا فنونِ لطیفہ ، سبھی کا فروغ ایک عام تحریک کے ذریعے سے ہوتا ہے - آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے بغداد میں سائنس کی ترقی انفرادی قسم کی الگ تھلگ کوششوں سے نہیں ، بلکہ ایک ایسی عوامی کوشش سے ہوئی جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی - اب بھی اگر ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم روس ، امریکہ یا جرمنی کی طرح دنیا کے سائنسی سرمایے میں کوئی اضافہ کریں تو سب سے پہلے ہمیں جدید سائنس کے اساسی تصوّرات کو قبولِ عام کی منزل تک لانا ہوگا تاکہ عوام الناس میں وہ سائنسی شعور زندہ ہو جو تخلیقی کام کے بغیر مطمئن نہیں ہوتا - ابھی تک ہم صرف دوسروں کے سائنسی اجتہاد سے استفادے کے قائل رہے ہیں - اب مناسب ہے کہ

ہم یہ پرانا قرضہ چکانے کی کوشش کریں -

قیامِ پاکستان کے بعد سے ملک میں سائنس کے فروغ کے لیے ہم نے طرح طرح کے تجربے کیے - کبھی تعلیم کی مدت میں کمی بیشی کی ، کبھی معلّمین کے اوقاتِ کار میں رد و بدل کیا ، کبھی طبیعیات ، کیمیا اور ریاضی کے نصاب میں ترمیم کی - پھر بھی ہمیں جس علمی معجزے کا سال ہا سال سے انتظار ہے وہ ظہور پذیر ہونے میں نہیں آتا - اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کبھی کسی نے یہ بھی خیال کیا کہ اس پورے عمل میں وہ کون سی ایک آنچ ہے جس کی کسر باقی رہ جاتی ہے ؟ افسوس ہے کہ اس قسم کے بنیادی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے بھی ہمیں سمندر پار کے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے - لندن یونیورسٹی کے ڈاکٹر بی - سی - بروکس نے اپنی ایک مدلّل اور مفصّل روداد میں پُرزور سفارش کی ہے کہ پاکستان میں انگریزی زبان کی تعلیم کو سائنس کی تعلیم سے الگ کر دیا جائے - اس ضمن میں انھوں نے ایک پُرلطف جملہ یہ لکھا ہے : ''خالص سائنس بنیادی طور پر ایک لسانی حقیقت ہے -'' اس دعوے کی تشریح انھوں نے یوں کی ہے :

> خالص سائنس کا سرچشمہ روزمرہ کی اشیا اور واقعات کا مشاہدہ ہے - تجربے کے بعد مشاہدہ اپنا رخ پھر انھی روزمرہ کی اشیا اور واقعات کی طرف پھیرتا ہے - گویا کسی سائنس کا سیکھنا اپنی اصل زبان سیکھنے کے عمل کی مخصوص اور باضابطہ توسیع ہے - سائنس کا پوری طرح سمجھنا اور سائنس کو تخلیقی طور پر ترقی دینے یا استعمال کرنے کی صلاحیت رکھنا دونوں اسی طرح زبان کے فہم اور زبان کے ذریعے سے اظہارِ مطلب کی قدرت کا سہارا لیتے ہیں جس طرح شاعری یا فلسفہ یا تخلیقی ادب کی دوسری اصناف -

ڈاکٹر بروکس کی ان تشریحات سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ سائنس کے طلبہ کو اپنی قومی زبان کی ضرورت دو منزلوں پر ہوتی ہے ؛ اول اُس وقت جب وہ سائنس کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں - دوم اُس وقت جب وہ تخلیقی طور پر سائنسی نظریات کا اطلاق اپنے حالاتِ گرد و پیش پر کر رہے ہوں - پہلی صورت میں ہمارے طلبہ مجبور ہیں کہ درسی کتابوں کے قومی زبان میں نہ ہونے کی وجہ سے سائنس کے مضامین کسی نہ کسی غیر ملکی زبان کی کتابوں میں پڑھیں - لیکن دوسری صورت میں ، یعنی اُس وقت جب وہ نئے سائنسی حقائق کی دریافت کر رہے ہوں ، اس کا کیا جواز ہے کہ وہ روسی یا انگریزی یا لاطینی میں سوچیں ؟ اور بالفرض اس کا کوئی جواز ہو بھی تو صورتِ حال یہ ہے کہ اس قسم کا غیر فطری طریقِ کار عملاً ناممکن ہے - نتیجہ اس جبر کا یہ نکلتا ہے کہ سائنس میں اجتہادی کام کے دروازے سرے سے بند ہو جاتے ہیں -

سائنس کی تعلیم میں قومی زبان کے استعمال کی ضرورت پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اہلِ دانش کے اس اجتماع کے سامنے اس موضوع پر کچھ اور کہنا باعثِ تصدیع ہوگا - البتہ میں اپنے ان معروضات کو اس دعا پر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ خدا وہ دن جلد لائے جب ہماری قوم کے اہلِ خرد اغیار کی ذہنی غلامی سے آزاد ہوں - یہ وہ مبارک دن ہوگا جب اقبال کی زبان سے یہ کہنا ممکن ہو سکے گا کہ :

صد شکر کسی شمع کا پروانہ نہیں میں
دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

اب میں دلی مسرّت سے اس کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں -

☆ ☆ ☆

ہمارا نظامِ تعلیم تاریخ کی روشنی میں

شامِ ہمدرد لاہور کے اجلاس منعقدہ ۴ فروری ۱۹۷۱ کی صدارتی تقریر -

خواتین و حضرات ،

آج شام مولانا علم الدین سالک کے ارشادات اس لیے بھی دُہری توجہ کے مستحق ہیں کہ مولانا کی ذات مستجمع الصفات ہے - وہ بہ‌یک وقت عالم و معلّم بھی ہیں اور مؤرخ بھی - انھوں نے تاریخ کے آئینے میں اسلامی نظامِ تعلیم کا جو عکس ہمیں دکھایا وہ گزرے دنوں کا ایک بُھولا بسرا مرقّع نہیں ، مستقبل کی تعمیر کے لیے ہمیں ایک درسِ بصیرت ہے -

اسلامی نظامِ تعلیم عبارت تھا اوّل ایک خاص نصابِ درس سے ، اور پھر اِس نصاب سے طلبہ کے ذہن کو مستفید کرنے کے لیے استاد و شاگرد کے اُس باہمی تعلق سے جو صدیوں تک ہماری سوسائٹی کی عقلی و اخلاقی ضروریات کا کفیل رہا -

مسلمانوں کے درسی نصاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا نقطۂ نظر ہمہ جہتی تھا ، یک طرفہ نہ تھا - یہ اِس وجہ سے ممکن ہؤا کہ اسلام کا تصوّرِ ذاتِ خدا عین مقتضائے فطرت کے مطابق تھا - یہ تصوّر نہ تو دیومالا کا واہمہ تھا نہ اصولِ منطق کا کوئی استحالہ - اللہ تعالٰی کو اسلام نے ایک ایسے خالقِ حقیقی کی حیثیت سے دیکھا جس کا فرمان عالمِ عقلی اور عالمِ اخلاقی دونوں میں یکساں جاری و ساری

تھا - اِس لحاظ سے مسلمانوں کے تعلیمی نصاب میں کوئی رخنہ، کوئی تناقض نہ تھا - اسلام نے عقل و ایمان کو ایک ہی حقیقت کے دو رخ قرار دیا جن کے باہمی تنافر کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا - اسی لیے اسلامی نصابِ درس دینی و عقلی علوم کا جامع تھا - یہ نصاب ایک ہی کائناتی کل کا جزو تھا - اس کے سب گوشے خالقِ کائنات کے نور سے متجلّی تھے اور اس کا مزاج بہ یک وقت دُنیوی اور آخروی معنویّت سے مُستنیر تھا - علومِ اسلامیہ کا کوئی سائنسی شعبہ بھی کسی خدا گم کردہ خلا میں معلّق نہ تھا - مسلمانوں کے علومِ عقلیّہ کے تمام ہم ربط شعبے ایمان کی مستحکم بنیاد پر قائم تھے - اسی بنا پر ان علوم کی ایمانی اور معقولی، دونوں حیثیتیں انھیں باہم مربوط رکھتی تھیں - اگر علومِ تفسیر و حدیث و فقہ کو منطق کے قوانین اور بلند تریں مقتضیاتِ فطرت کا سہارا میسّر تھا تو ریاضی اور ہیئت اور طب بھی ایمان کی محیط الکل بصیرت سے ناآشنا نہ تھے - دونوں طرح کے علوم خدا اور انسان کی خدمت کے لیے وقف تھے - اسلامی تمدّن کی سائنس اور تکنالوجی میں نہ تو مادّہ پرستی کا کوئی شائبہ تھا، نہ ہمارا دینی عقیدہ ہی کسی خلافِ عقل تصوّر پر مبنی تھا - چنانچہ ہیئت اور ریاضی اور طبیعیّات سے اگر خدا کی تقدیس ہوتی تھی تو پارچہ بافی اور جلد بندی، تعمیرات اور طب (اور اسی طرح کے دوسرے بےشمار علوم و فنون) انسان کی خدمت کے لیے وقف تھے - اس نظامِ تعلیم کے عناصر کا مقابلہ مغربی دنیا کے نظامِ تعلیم کے نظریّات سے کیجیے ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بہ کجا

یہ تو اسلامی تمدّن کے نصابِ درس کی کیفیّت تھی، لیکن ہمارے نظامِ تعلیم کا دوسرا پہلو، استاد و شاگرد کا باہمی تعلق، بھی اپنی خاص امتیازی شان رکھتا تھا - ذرا غور فرمائیے کہ مدرّس اور

طالب علم کا یہ تعلّق باہمی رواداری اور خلوص و احترام کی جن بنیادوں پر قائم تھا اُن کے طفیل اِسے اتنی لمبی زندگی ملی کہ تاریخِ تمدّن میں اس عجیب و غریب استحکام کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ہمارا نظامِ تعلیم ہمارے برّ ِعظیم میں ایک ہزار برس تک اس طرح غیر متزلزل رہا کہ آج اس کے استقلال اور وضعداری کا خیال کرکے ہمیں بے انتہا حیرت ہوتی ہے۔ مغربی تمدّن نے جس طرح اپنی معاشی عمارت سرمایہ داری پر اٹھائی اسی طرح اپنے علوم کی بنیاد مادّی قوانین کی بے مقصد خود مختاری پر رکھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب نے اپنی عقلی ترقی کو خدا اور انسان کی خدمت سے علاحدہ کر دیا۔ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ گو اس تمدّن کی عمر ابھی بمشکل چار سو برس ہوئی ہے مگر استاد اور شاگرد کے درمیان ایسے ہنگامے برپا ہونے لگے ہیں جو اقتصادی دنیا میں سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش کی تقلید معلوم ہوتے ہیں۔ کیا یورپ اور کیا امریکہ، مغربی دنیا کے تعلیمی ادارے اِس صدی میں بڑی سرعت کے ساتھ معلّم اور متعلّم کا میدانِ کارزار بنتے جاتے ہیں۔ پروفیسر علم الدین سالک نے بالکل بجا فرمایا کہ مسلمان اساتذہ و طلبہ کو اس خلفشار میں تھوڑی دیر کے لیے رُک کر تاریخ کے آئینے میں اپنے قومی نظامِ تعلیم کی تصویر دیکھنی چاہیے۔

☆ ☆ ☆

کسان کا معاشرتی مقام

شامِ ہمدرد لاہور کے اجلاس منعقدہ ۲ مارچ ۱۹۷۲ کی صدارتی تقریر۔

خواتین و حضرات،

"احترام" کے مضمون پر جو سلسلۂ تقاریر اِس سال "شامِ ہمدرد" کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے اُس میں موضوعِ سخن کا لحاظ کیجیے تو سب سے بصیرت افروز وہ تقریر ہے جو ہم نے آج شام سنی۔ میں حکیم محمد سعید صاحب کو ان کے اِس اجتہاد پر مبارکباد دیتا ہوں کہ استاد کے احترام اور قانون کے احترام کے علاوہ ان کی دقیقہ رس نگاہوں نے کسان کے احترام جیسا اچھوتا مضمون بھی ڈھونڈ نکالا، اور پھر ہم خوش نصیب ہیں کہ اِس اچھوتے مضمون کے سب مضمرات پر کماحقّہ روشنی ڈالنے کے لیے ہمیں زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسرار الحق صاحب کی فضیلتِ علمی اور مہارتِ فن سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر اسرار الحق صاحب نے اِس اہم مسئلے پر ہمارے لیے سبھی اسرارِ حق جس خوبی سے فاش کیے ہیں اس کے لیے میں اپنی طرف سے، اور آپ سب کی طرف سے، اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خواتین و حضرات، مجھے یقین ہے کہ آپ سب اِس لطیفۂ غیبی کی بھی داد دینا چاہتے ہیں کہ جس دن ہم لاہور میں کسان کے احترام کا اثبات کرنے کے لیے جمع ہوئے اُسی صبح کے اخبارات نے ہمیں یہ خبر

سنائی کہ حکومتِ پاکستان نے زرعی اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کر کے ہمارے آج شام کے اجلاس کے لیے ایک غیر متوقّع تمہید مہیّا کر دی - عالمِ شعر میں توارد کی مثالیں ہم سب کو یاد ہیں ، مگر عالمِ فکر و عمل میں اِس قسم کا خوش گوار توارد ہماری تہذیبی زندگی میں شاید اپنی مثال آپ ہے -

اگر آپ غور فرمائیں تو تسلیم کریں گے کہ ہر معاشرے کی بنیاد انسانوں کی باہمی خیرسگالی اور احترام کے جذبے پر رکھی جاتی ہے - حاکم و محکوم ، پیر و مرید ، اُستاد و شاگرد ، گاہک اور دکاندار ، سبھی کے تعلقات بجز دوطرفہ روا داری کے قائم نہیں رہ سکتے - یوں دیکھیے تو شامِ ہمدرد کی اِسسالہ تقریبات کا موضوع ہمیں شائستہ زندگی کے اصلِ اصول کی طرف متوجہ کر رہا ہے - اِس موقع پر مجھے نپولین کے سوانحِ حیات کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ اپنے دربار کی ایک خاتون کو ایک مزدور کے رستے میں حائل دیکھ کر اُس نے برجستہ کہا : 'ہٹو ، میڈم ، مزدور کے بوجھ کی عزت کرو !' - عزت باہر سے آ کر کسی شخص کے سر پر نازل نہیں ہوتی ، اُس کی اپنی سیرت و کردار اسے عزت کا مستحق بناتے ہیں - چنانچہ گو ہم بار ہا کہتے ہیں کہ فلاں ماں باپ کس درجہ خوش نصیب ہیں کہ ان کی اولاد اُن کا اِس قدر ادب کرتی ہے ! ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اولاد کے دل میں والدین کا ادب اس لیے پیدا ہؤا کہ پہلے ماں باپ نے اُن کا لحاظ کیا اور دلی محبت کی دولت ان پر نچھاور کی - صاحبِ احترام وہی شخص ہو سکتا ہے جو احترام کا استحقاق اپنے اندر پیدا کرے - اگر ہم اپنے گرد و پیش نظر ڈالیں تو خود بخود ظاہر ہوگا کہ آپ اور میں ہمیشہ احترام کرتے ہیں اُس شخص کا جو احترام کے لائق ہے -

آئیے ، اب دیکھیں کہ ملّتِ پاکستان کے سوادِ اعظم کے اُس نمایندے کو ، جسے ہم کسان کہتے ہیں ، ہمارے احترام پر کیا خاص

حق حاصل ہے - برطانوی مؤرخ ٹائن بی نے اپنے متفرّق مضامین میں ایک جگہ مظاہرِ فطرت اور نسلِ انسانی کے باہمی تعلّقات کی داستان سنا کر ایک نکتہ پیدا کیا ہے - ایک زمانہ تھا کہ انسان نے قوانینِ فطرت کو تقدّس کا وہ مرتبہ دیا جو توہّم پرستی کی حد تک پہنچ گیا - پھر وقت کے انقلاب نے دوسری انتہا کی طرف حرکت کی اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دورِ جدید میں انسان کے گستاخ ہاتھوں نے احترامِ فطرت کی ردا پارہ پارہ کر دی - نسلِ انسانی نے فطرت کی شان میں گستاخی کر کے بے حد و حساب مادّی فوائد حاصل کیے مگر ساتھ ہی اپنے سکونِ خاطر کا خاتمہ کر دیا - فطرت سے بگاڑ پیدا کر کے انسان نے خود اپنی روح کا فساد مول لیا - رُوح کا یہی فساد ہے جس سے ہمارا کسان اب تک محفوظ ہے ، اور صدیوں سے محفوظ رہا ہے - وہ بجلی کی مصنوعی روشنی سے اپنی رات کو دن نہیں بناتا - اُس کے اوقاتِ محنت سورج کے طلوع و غروب سے مقرّر ہوتے ہیں - اُس کا دل و دماغ خود بخود موسموں کے تغیّر و تبدّل کا ساتھ دیتا ہے - اُس کی روح سازِ فطرت سے ہم آہنگ رہتی ہے - یہاں تصنّع کے پیدا کیے ہوئے اعوجاج اور انحراف راہ نہیں پاتے - کسان کی بات چیت ، اُس کی پوشش ، اُس کی خوارک ، سادگی سے عبارت ہے - یہ سادگی ، یہ فطرت کے مطابق زندگی ، اہلِ نظر کے دل میں اُس کا احترام پیدا کرتی ہے اور اُس کی صحّتِ بدن اور صحّتِ ذہن کا بدیہی ثبوت بھی ہے - گزشتہ صدی میں روس کے شہرۂ آفاق ادیب و مفکّر ٹالسٹائے نے کسان کے احترام کا نعرہ بلند کیا ، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ فنونِ لطیفہ کی گراں مایگی کا معیار شہر و دربار کے تکلّفات میں تربیت پائے ہوئے ذہن نہیں ، بلکہ دیہاتی کسانوں کے وہ بے لوث ذہن ہیں ، جنھیں فطری سادگی میں پروان چڑھنے کا موقع ملا ہے - مراد یہ ہے کہ جس فن سے کسان کا بے ریا اور

خالص ذہن لطف اندوز نہ ہو سکے وہ سچا فن نہیں ہے۔ ٹالسٹائے سے ایک صدی پہلے انگلستان میں ورڈزورتھ نے کہا کہ شعر کی صحیح زبان وہ ہے جو کسانوں کی زندہ زبان سے ماخوذ و منتخب ہو۔ ٹالسٹائے اور ورڈزورتھ کے اِن خیالات سے کسی کا متفق نہ ہونا بھی ممکن ہے مگر اختلاف کا یارا اگر نہیں ہے تو اٹھارھویں صدی کے برطانوی اہلِ کمال گولڈ سمتھ کے اِس قولِ فیصل سے :

یہ رئیس ، یہ نوّاب ، سرسبز ہوں تو کیا ، اور
مُرجھا جائیں تو کیا ، (بادشاہِ وقت کا) ایک لفظ
اِنھیں اُسی طرح پیدا کر سکتا ہے جیسے (اُس کا)
ایک لفظ اِنھیں (اس سے پہلے) پیدا کر چکا ہے۔
لیکن وہ جسور و سخت کوش کسان جو اپنے
ملک کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ ایک دفعہ فنا ہو جائیں
تو اُن کی کمی پھر کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔*

خود ہمارے ترجمانِ حقیقت علامۂ اقبال نے اپنی نظم ''الارض للہ'' میں نوامیسِ فطرت کو کسان کے شبانہ روز کاروبار میں شریک و سہیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

پالتا ہے بیج کو مٹّی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نُورِ آفتاب ؟

---

*Princes and lords may flourish, or may fade ;
A breath can make them, as a breath has made ;
But a bold peasantry, their country's pride,
When once decay'd, can never be supplied.
—*The Deserted Village*

اقبال ہی نے ایک اور جگہ ''بندۂ مومن'' کی توصیف ان زندۂ جاوید الفاظ میں کی ہے ع

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات

جس ''بندۂ مولا صفات'' کا ذکر ہم آج شام کر رہے ہیں اُس کے خالق نے کم از کم اپنی ایک صفت ''رزاقی'' میں اُسے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ کسان کا یہ بڑا اعزاز ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اُسے نسلِ انسانی کو رزق بہم پہنچانے کا وسیلہ بنایا ہے۔ اِس لحاظ سے کسان بنی نوعِ انسان کا محسن ہے۔ بارہا وہ اُس وقت کام میں لگا ہوتا ہے جب ہم سوتے ہیں اور ایسے موسم میں کھلے آسمان کے نیچے مشقت برداشت کرتا ہے جب ہم گھر کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اُس کے احسان کی شکر گزاری سے قطع نظر، یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ وہ اپنی ذات و کردار کی سادگی اور خلوص میں فطرت سے براہِ راست فیض پاتا ہے اور اِس لحاظ سے بھی ایک محترم شخصیت ہے۔ یہ خود اپنی عقلِ سلیم اور ذہنی شائستگی کا ثبوت ہے کہ ہم کسان کو اپنے معاشرے میں ایک باعزت مقام دیں۔ جو شخص وہاں احترام نہیں کرتا جہاں احترام واجب ہو، وہ خود اپنے احترام میں کمی کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

طلبہ اور تحریکِ صحّتِ ملّی

یہ مقالہ ''ہمدرد فاؤنڈیشن'' کے زیرِ اہتمام ''دوم صحّتِ ملی" کانفرنس'' لاہور میں بتاریخ ٦- اپریل ١٩٧٢ پڑھا گیا۔

گزشتہ نصف صدی سے ، بلکہ یوں کہیے کہ گزشتہ صدی کے نصف آخر سے ، دستور کچھ ایسا بن گیا ہے کہ قومی جلسوں سے خطاب کرتے وقت ہم صرف طلبِ علم اور دماغی ترقی" کے بعض پہلوؤں پر زور دیتے ہیں ، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ عقل کی تعمیر نفسِ انسانی کی تربیت کا صرف ایک جزو ہے - منطقی بحث کی سہولت کے لیے کسی کُل کا تجزیہ کرنا تو جائز ہے ، مگر ُجزو کو کُل کی جگہ دے دینا منطق کی خلاف ورزی ہے - یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ صحّت مند ذہن کے لیے صحّت مند بدن شرطِ اول کی حیثیت رکھتا ہے ، کیونکہ جسم و ذہن ایک کُل کے اجزا کی طرح باہم مربوط ہیں - ہمارے دینِ برحق نے روح کی پاکیزگی اور بدن کی پاکیزگی پر یکساں زور دیا ہے - روحانیت کے اقدار پر یک طرفہ اصرار اور جسمانی اوصاف کا استخفاف ہم نے اپنی یورپی تعلیم کے مسیحی اثرات سے سیکھا ہے - یہ اثرات مسیحیّت کے ابتدائی ڈیڑھ ہزار سال کے زمانے میں رہبانیت اور جسم کُشی کی تلقین و تحسین کے لیے وقف رہے اور یورپی فکر و ادب کو ہمیشہ کے لیے ایک خاص رخ پر ڈال گئے -

آپ کو یاد ہوگا کہ قدیم یونان کے حکما سے ہم اپنے تمدّن کے دورِ اول میں اتنے ہی متاثر تھے جتنے آج کل انگلستان اور امریکا کے

آوردہ تہذیبی نظریّات سے - یونانی حکما روح کے مقابلے میں جسم کی تحقیر کبھی نہیں کرتے تھے - اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک اچھا بدن لازماً ایک اچھی روح کی علامت ہوتا ہے - اِسی لیے اپنے اخلاق و تعلیمی نظریّات میں اُن کا مطمح نظر جسم و روح کے درمیان توازن و تناسب قائم کرنا تھا - اُس دور کے ایک نکتہ چیں طالب علم نے ایک اُستاد کو یاد دلایا کہ سقراط اپنے بے مثال روحانی حسن کے باوجود جسمانی حسن سے عاری تھا - جواب ملا کہ "گو سقراط کی ناک چپٹی تھی اور عمر کے اضافے کے ساتھ اس کا پیٹ کچھ بڑھ گیا تھا مگر ان دو عیبوں سے قطع نظر وہ بہت عمدہ ڈیل ڈول کا آدمی تھا - شہر کے ورزش گھروں کی حاضری میں وہ کبھی ناغہ نہ کرتا تھا - اُس کی قوتِ برداشت ، اُس کی ہمّت و شجاعت اور میدانِ حرب میں اُس کی چابک دستی زبان زدِ خاص و عام تھی -" افلاطون نے سقراط کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شدّتِ سرما کے دوران میں اُسے ایک لڑائی میں شامل ہونا پڑا - عام سپاہی سردی سے بچنے کے لیے بھیڑوں کی کھالوں اور اُونی کپڑوں میں لپٹے پڑے تھے مگر صرف سقراط تھا کہ اپنا روزمـرّہ کا چوغہ اوڑھے برف پر بے تکلّف ننگے پاؤں چل پھر رہا تھا - الغرض یہ ثابت ہے کہ سقراط کو ، باوصف اپنی کم روئی کے ، ایک غیر معمولی روح کے ساتھ ایک غیر معمولی بدن بھی عطا ہؤا تھا -

خیر یہ تو بہت پرانی باتیں ہیں ، مگر واقعہ یہ ہے کہ انگریزی دور کی آمد آمد سے پہلے قومی صحّت کے معاملے میں ہم خود کچھ ایسے فرومایہ نہ تھے - پچھلی صدی کے نصفِ اول میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی جیسے رہنما بہ یک وقت عالمِ دین بھی تھے اور میدانِ کارزار کے مردِ مجاہد بھی - آپ میں سے جن اصحاب نے ان بزرگوں کی داستانِ حیات کا مطالعہ کیا ہے ، اُنھیں یاد ہوگا کہ تحریکِ جہاد کے اِن دونوں علم برداروں کے لیے کس طرح اپنی جسمانی

صحّت کا برقرار رکھنا فرائضِ موکّدہ میں داخل ہو گیا تھا - ہمارے قائدِ اول سید احمد خاں کے حیرت انگیز تعمیری اور اصلاحی کارنامے، جو تقریباً ساٹھ برس کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں، اُن کی حیرت انگیز صحّت کے سہارے سرانجام پا سکے - قائدِ اعظم محمد علی جناح سے اسلامیہ کالج لاہور کی ایک دعوت میں پوچھا گیا کہ آپ ایک مشتِ استخواں ہونے کے باوجود، اِس عمر میں، اِتنی محنت کس طرح کر لیتے ہیں؟ جواباً قائدِ اعظم نے بلاتامّل دو سبب بتائیے - فرمایا:
"میں کم کھاتا ہوں، اور میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے -"

برطانوی دور سے پہلے ہماری پرانی نسل کی قابلِ رشک صحّت کا راز یہ تھا کہ وہ لوگ بالعموم اعتدال کی زندگی کے عادی اور کسرت کرنے کے پابند تھے - ہر خاص و عام حسبِ توفیق کُشتی، کبڈّی، تیراکی، نیزہ بازی اور دوسری ورزشوں میں حصّہ لیتا تھا - آپ کو معلوم ہے کہ برطانیہ کے لائے ہوئے سیاسی انقلاب کے ساتھ ایک تمدّنی انقلاب بھی آیا - اس تمدّنی انقلاب نے وہ سارا انتظام درہم برہم کر دیا جو حفظانِ صحّت کی محکم روایت کو زندہ رکھنے کا ضامن تھا - نئی نسل کو غذا ملی تو ناخالص اور تفریحات نصیب ہوئیں تو غیر صالح - باقی رہے کسرت کرنے کے پرانے انداز، سو اُن کا طلسم ایسا ٹوٹا کہ پھر نہ بندھ سکا - اب آپ غور فرمائیے کہ دورِ جدید میں ہمارے بے ضابطہ اوقات، جو دن اور رات کا فرق مٹانے کے درپے ہیں، اور نئی نویلی معاشرتی رسمیں، جو اپنی جلو میں ناوقت استقبالیے، نیم شبی عشائیے اور بجلی کی روشنی سے جگمگ کرتے رت جگے، لے کر آئی ہیں، افزائشِ صحت کا باعث ہوں تو کیونکر ہوں؟

بایں ہمہ محرومی نئی نسل کے لیے، جو تعمیرِ ملّت کا عزمِ نو لے کر اٹھی ہے، ابھی وقت ہے کہ کتابِ زندگی کے ایک نئے اور مصفّا باب کا آغاز کرے - حفظانِ صحّت کی تلقین نوجوانوں کا حق

بھی ہے اور فرض بھی ، کیونکہ یہ خدمت اُن لوگوں کو نہیں سونپی جا سکتی جن کی اپنی زندگی اچھی صحّت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ نوجوان طلبہ کو برسوں سے مختلف فلاحی تحریکوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی جاتی رہی ہے ۔ ناخواندگی کا علاج ، تعلیمِ بالغاں ، ہاتھ پاؤں کی مشقّت سے تعمیر و اصلاح کے منصوبوں کی تکمیل ، یہ سب نیک کام طلبہ کی توجہ کے مستحق رہے ہیں ، لیکن ان سب سے زیادہ قابلِ تعظیم کارنامہ یہ ہوگا کہ ہمارے نوجوان اُٹھیں اور اُس تحریک میں جان ڈال دیں جو ملّتِ پاکستان کی صحّت کا معیار بلند کرنے کے لیے اِس وقت ملک میں جاری ہے ۔ ایک صحّت مند اور طاقت ور پاکستان کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم پوری قوّت سے اجتماعی صحّت کے حصول کی طرف ایک بھرپور اور ناقابلِ شکست حرکت کا آغاز کریں ۔ اس تحریک کی مرکزی تنظیم جس کا جی چاہے قائم کرے مگر مجھے یقین ہے کہ میدانِ عمل میں اس تحریک کے سالار ہمارے نوجوان طلبہ ہی ہو سکتے ہیں ۔

کھیلوں کا انتظام صرف کرکٹ یا ہاکی کی سطح پر کر دینا ، جس میں حد بائیس بائیس آدمی حصّہ لیتے ہیں ، کروڑوں کی اس سرزمین کو تندرست و توانا آدمیوں کا ملک نہیں بنا سکتا ۔ وقت آ گیا ہے کہ ملک بھر میں ورزش کے اکھاڑے آباد نظر آئیں ، دوڑ لگانے کے مقابلے اِس پیمانے پر برپا ہوں جیسے کسی بن میں آگ لگی ہو ۔ تیراکی اور کشتی رانی کے کلب جابجا قائم ہوں کیونکہ ہمارے موسمِ گرما میں تیراکی اور ہمارے موسمِ سرما میں کشتی رانی بہت عمدہ ورزشیں ہیں ۔ یاد رکھیے کہ دنیا کی کوئی اچھی چیز شاقّہ محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ۔ اُس محنت سے زیادہ مبارک اور کون سی محنت ہو سکتی ہے جس کی پہلی منزل تفریحِ طبع اور آخری منزل صحتِ کامل ہو ؟

آج سے دو تین ہزار سال پہلے اہلِ یونان نے ورزش کو عبادت

کا درجہ دے رکھا تھا ۔ کچھ اِسی قسم کا طرزِ عمل ، صدیوں کی غفلت کے بعد ، ہماری قوم کو اختیار کرنا ہوگا تاکہ ہماری آئندہ نسلیں غالب و توانا اور ناقابلِ تسخیر بن کر کارزارِ حیات میں داخل ہوں ۔ اس انقلاب کے بہترین داعی پڑھے لکھے نوجوان ہی ہو سکتے ہیں ۔ قوانینِ صحّت سے واقفیت حاصل کر کے وہ اپنے کم خوش نصیب ہم قوموں کے سامنے ان قوانین کی سلجھی ہوئی تشریحات پیش کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں ۔ ایک عام مثال لیجیے ۔ صاف ہوا ، صاف پانی اور صحّت بخش غذا کی اہمیت ہمارے معاشرے پر پوری طرح واضح نہیں ہے ۔ ہماری فضاے گرد و پیش کو گرد و غبار ، دھواں اور تعفّن بارہا اس طرح آلودہ کر دیتا ہے کہ اِس پورے ماحول کو بدل ڈالنے کی ضرورت ہے ۔ یہ کام نوجوانوں کے کرنے کا ہے ، تلقین کے ذریعے سے بھی اور زورِ بازو سے بھی ۔ ہم ایک غریب قوم ہیں ۔ کیمیاوی حیاتینوں کے بجائے ، جن کے خریدنے کی توفیق کم لوگوں کو ہے ، ہمیں متوازن خوراک سے اپنی طاقت بحال رکھنی ہے ۔ مولی گاجر اور ٹماٹر جیسی ترکاریوں اور سادہ غذا کے بعض اور اجزا کا صحیح شعور رکھ کر بھی عوام الناس صحّت مند زندگی بسر کر سکتے ہیں ۔ اسی طرح ہماری روزمّرہ کی خوراک کے بعض اجزا ایسے ہیں (مثلاً مرچ ، پان ، چائے ، تمباکو) جن کی کثرتِ استعمال میں قباحت کے پہلو ہیں ۔ وہ نوجوان ، جنھیں صحیح علمِ غذا میسر ہے ، یہ علم اپنے ہم جنسوں تک پہنچا سکتے ہیں ۔ صحیح غذا کا راز صرف اِس قدر ہے کہ کون سی غذا ، کس وقت ، کتنی کھائی جائے (اور اس سے زیادہ ہرگز نہ کھائی جائے) ۔ اس نکتے کو نظر انداز کر کے ہم اکثر خرابیٔ صحّت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔

قوم کو نوجوانوں سے توقع ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرے میں ایسے مرکزِ صحت قائم کریں گے جہاں سے انھیں علمِ غذا کے علاوہ

عضویّات کے مضمون پر ابتدائی معلومات عام کرنے کا موقع ملے گا۔ صحّت کے خواہش مند آدمی کے لیے دل ، جگر اور معدے کے وظائف کا مناسب حد تک سمجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح آنکھوں ، کانوں اور دانتوں کی حفاظت ایک اور اہم مضمون ہے جس پر نوجوان طلبہ قوم کو متوجہ کر سکتے ہیں۔ عامۃ الناس کو روزمرّہ کے عوارض کے اسباب و علامات سے آگاہ کرنے اور ان کے علاج کی تعلیم دینے کا حق بھی نوجوان طلبہ ہی ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے کچھ آگے طبیب کی منزل آتی ہے مگر طبیب کے دخل سے پہلے صحّتِ عامہ کو برقرار رکھنے کے لیے جس عام واقفیت کی ضرورت ہے ، وہ حفظانِ صحّت کے اصولوں کی تبلیغ سے حاصل ہوگی۔ اگر ہمارے نوجوان اس مقصد کے لیے صحیح طور سے حرکت میں آ جائیں تو قوم کا ہر فرد صحّت کے معاملے پر سنجیدگی سے سوچنے کا عادی ہو جائے گا۔ عوام الناس کو اس سنجیدہ سوچ بچار کے لیے بیدار کرنا ایک قومی خدمت ہے۔ صحّت کو نظر انداز کرنے کی روش فرد ہی کو نہیں ، ملّت کو بھی فنا کی طرف لے جاتی ہے۔

یاد رکھیے کہ زندہ قومیں کمزوری ، افسردگی اور شکست سے نہیں ، توانائی ، اُمنگ اور فتح مندی سے لَو لگا کر زندگی کا کاروبار کرتی ہیں۔ پاکستان کو اپنے نوجوان طلبہ سے توقع ہے کہ وہ اپنے قول و فعل سے یہ ظاہر کریں گے کہ قوم کی طاقت اور ہمّت اور فاتحانہ اندازِ کار اچھی صحّت سے وابستہ ہے اور اچھی صحّت پاکیزہ زندگی کا پہلا انعام ہے۔

☆ ☆ ☆

قومی زندگی میں تجارت کی اہمیّت

یہ مقالہ ہیلی کالج آف کامرس ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور کے سالانہ جلسہء عطائے اسناد و انعامات ، منعقدۂ ۲۷ اپریل ۱۹۷۳ میں بطور خطبہء صدارت پڑھا گیا ۔

جناب پرنسپل صاحب ، عزیز طلبہ ، خواتین و حضرات ،

چار برس کے وقفے سے ، بہت سی دور گردیوں کے بعد ، میں پھر ایک بار پنجاب یونیورسٹی کے دوستوں اور عزیزوں کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ اس دوران میں خود میں نے اپنی زبان پر جو تالے ڈال رکھے تھے ، اب اُن کے توڑنے کا وقت آن پہنچا تھا ۔ اِس موقع پر آپ نے جس محبّت سے مجھے یاد فرمایا وہ مجھے کشاں کشاں آپ کی انجمن میں لے آئی ۔

رکھیو ، یا رب ! یہ درِ گنجینہء گوہر کھلا

آج مجھے سات سال پہلے کا وہ دن یاد آتا ہے جب میرے رفیقِ کار اور اس کالج کے محترم پرنسپل اختر عالم ہاشمی ہمیں ناگہاں داغِ مفارقت دے گئے ۔ اس دن میرے دل کا عجب حال تھا ۔ ایک طرف ہاشمی مرحوم کی رحلت کا صدمہ اور دوسری طرف یہ اضطراب کہ میرے ڈیڑھ ہزار کے قریب عزیزوں کی شبانہ روز فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کا انتظام اب کیونکر ہو سکے گا ؟ یہ تھا وہ عالمِ یاس و قنوط جس میں پرنسپل صاحب ، آپ ''ہارون اخی'' بن کر میری مدد کو پہنچے اور اِس شان سے پہنچے کہ گویا معمارِ ہستی نے آپ کی ذاتِ گرامی کو

خاص یہی خلا پُر کرنے کے لیے وضع کیا تھا۔ میری دعا ہے کہ اب جو نازک ماہ و سال ہمارے ملک کے سامنے ہیں، اُن میں آپ کی دانش مندانہ رہبری نوجوانانِ قوم کو بدستور حاصل رہے۔

اس پُرشکوہ سالانہ تقریب میں حاضری کی دعوت قبول کرتے ہوئے مجھے یہ گمان ضرور ہؤا تھا کہ پرانے تعلقات کا لحاظ کر کے آپ کوئی نہ کوئی کلمۂ خیر میرے حق میں بھی ارشاد فرمائیں گے۔ اب جو کیفیت فی الواقع پیش آئی ہے، اُس میں اگر آپ سے اختلاف کروں تو کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہوں۔ ناچار یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ہیلی کالج آف کامرس کے پرنسپل نے غالباً منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اقتصادیات، حساب کتاب اور کاروباری نثر کے کڑے سانچے سے باہر قدم رکھا ہے اور یونیورسٹی میں میرے دورِ خدمت کو شاعرانہ بلند پروازیوں کا موضوع بنایا ہے۔

گزشتہ دس پندرہ برس، بلکہ سچ پوچھیے تو پورے پچیس برس، میں ہم طرح طرح کی مجبوریوں سے دوچار رہے۔ تعلیم کے میدان میں ہمیں کامیابیاں بھی ہوئیں اور ناکامیاں بھی۔ اس پس منظر پر مجھے اس کالج کی رفتارِ ترقی کی روداد سن کر خوشی ہوئی۔ اس ترقی پر کالج کے جفا کش اساتذہ اور طلبہ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خصوصیت سے مبارکباد اسناد و انعامات پانے والے نوجوانوں کو ملنی چاہیے جنھوں نے اپنی محنت و ریاضت سے ذہنی قابلیت یا جسمانی ورزش اور کھیلوں میں سبقت حاصل کی۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ پاکستان کا عام شہری قومی درسگاہوں کے اِس نوعیت کے جشن سے بالعموم بے نیاز رہتا ہے، حالانکہ اس قسم کی تمام تقریبات پوری قوم کے روشن مستقبل کا آئینہ ہوتی ہیں۔ ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کی ایک منتخب جماعت اپنی اعلٰی صلاحیتوں سے جو امتیازات حاصل کرتی ہے ان پر صرف بچوں کے والدین یا اساتذہ کا خوش ہونا دراصل ہماری سیاسی

بصیرت کی کمی اور ہماری قوم کے ذہنی حدود کی افسوسناک تنگی پر دلالت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں کی یہ سالانہ تقریبات پیمانہ ہیں ہماری آیندہ زندگی کے فلاحی ممکنات کا۔ ان کے ذریعے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والی نصف صدی میں (بلکہ مستقبلِ بعید میں بھی) قومی بقا و استحکام کی کشمکش کیا صورت اختیار کر سکے گی۔ اِن سالانہ جلسوں پر نظر رکھیے تو یہ سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے کہ آیندہ دس بیس برس میں شہر لاہور اور صوبۂ پنجاب کی اجتماعی زندگی اور خود پاکستان کی قومی قیادت کی بنا کن قوّتوں اور قابلیّتوں پر رکھی جائے گی۔ ہم توجہ کریں یا تغافل، گوشہ گیر معلّموں اور گمنام طالب علموں کی سرگرمیوں کو ملک و ملّت کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ اہلِ مدرسہ کی یہ خاموش اور بے نقارہ و نشان جدوجہد، جس کی داستان سنی ان سنی ایک کر دی جاتی ہے، تاریخ کی شاہراہوں کی یادگار منزلیں مقرر کرتی ہے۔ خواتین و حضرات، ہر وہ کوشش جو ایک ذہین اور لائق طالب علم یا چست اور مستعد کھلاڑی کو اس معیارِ کمال کے قریب لائے جو متعلقہ درس گاہ کا منتہاے مقصود ہے، ساتھ ہی ہماری قوم کو لازماً اپنے قائم کردہ نصب العین کی طرف قدم بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ مطالعے اور ورزش کے میدان کے انعامات دراصل زندگی کے عظیم تر انعامات کا پیش خیمہ ہیں۔

اس کالج کو یہ بڑا اعزاز حاصل ہے کہ یہ ہمارے نوجوانوں کو تجارتی کاروبار کی تنظیم بہتر اور بلند تر پیمانے پر کرنے کی تربیت دے رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ ''کامرس'' کے بجائے ''تجارت'' کہتے ہوئے کچھ ہچکچاتے ہیں۔ لیکن اگر ''تجارتی'' کا اسمِ صفت ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے تو یہ صورت انگریزی کے اسمِ صفت ''کمرشل'' کو بھی درپیش ہے۔ ''کامرس'' کے لاطینی الاصل لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے جو ''تجارت'' کا۔ اور مسلمانوں کے لیے تو تجارت چودہ صدیوں

سے ایک شریفانہ اور معزز پیشہ رہی ہے - خود حضور رسول اکرمؐ بلحاظِ پیشہ تاجر تھے - کسی مسلمان کے لیے اِس سے بڑی عزت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تجارت کو ذریعۂ معاش بنائے ، جسے ہادیٔ برحقؐ نے اپنے لیے بطور پیشے کے انتخاب فرمایا تھا؟ تجارت نام ہے انسانوں کے درمیان اسبابِ معیشت کے تبادلے کا ، خواہ یہ تبادلہ قومی پیمانے پر ہو یا بین‌الاقوامی پیمانے پر - بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کے روزِ اول سے تجارت و حکومت میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے - گزشتہ آٹھ دس ہزار برس کی تاریخ پر نظر دوڑائیے تو واضح ہوگا کہ موئن جو ڈیرو ، وادیٔ دجلہ و فرات اور وادیٔ نیل کے قدیم ترین دورِ تمدّن سے لےکر یونان و چین کے تمدّنی ظہور تک نسلِ انسانی اجتماعی تنظیم کی غرض سے ہمیشہ کاروبارِ تجارت اور کاروبارِ حکومت کے دو بنیادی ذریعے استعمال کرتی رہی - صنعت و حرفت کا عمل دخل بعد میں ہؤا - اور بالآخر یورپ میں اٹھارھویں صدی کا صنعتی انقلاب تو یوں کہیے کہ کل کی بات ہے -

خواتین و حضرات ، عام طور پر مشہور ہے ، یا کم از کم نصف صدی پہلے تک (جب میرا اپنا شمار نوجوان طالب علموں میں تھا) ہر شخص بلا تامّل یہ کہا کرتا تھا کہ تاریخ نگاری اور تاریخی تحقیقات مسلمانوں کا خاص مضمون ہے - لیکن گزشتہ پچیس تیس برس میں ہم نے بطور ایک قوم کے دنیا کو اپنے مؤرخانہ کمال کا کوئی خاص ثبوت بہم نہیں پہنچایا ، بلکہ اس قسم کے بڑے کارنامے ہم نے مجموعی طور پر شاید غیر مسلموں کے لیے چھوڑ دیے ہیں - با ایں ہمہ بے نیازی ، اس نازک وقت میں ہمارے لیے اس درسِ بصیرت سے مفر ممکن نہیں رہا جو تاریخِ انسانی کے صفحات سے پکار پکار کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے -

جناب پرنسپل صاحب ، میں آپ کی اجازت سے بہ صد ادب

اہلِ علم و فضل کے اس اجتماع کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسبابِ معیشت کی خرید و فروخت کا وہ کاروبار جس کی بلند ترین صورت تجارت ہے (اور جس کی تعلیم و تدریس کے لیے آپ کا کالج ممتاز و مشہور ہے) اس کے عطا کیے ہوئے شرف سے ہم کس طرح محروم ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ چار سو برس ہوئے سمندر پار کی مغربی قومیں برّ ِعظیم میں پہلے پہل وارد ہوئیں اور بہ تدریج ہماری تجارت کے بیشتر اور بہترین حصّے پر قابض ہوگئیں۔ ان غیر ملکی تاجروں میں جو قوم سب سے زیادہ زیرک تھی اس نے سو ڈیڑھ سو برس کے عرصے میں اپنے ہم نسل رقیبوں کو لڑ بھڑ کر مار بھگایا اور ساتھ ہی کچھ تو بذریعہ اپنی تجارتی چابکدستی کے اور کچھ اپنی ریشہ دوانیوں اور لوٹ کھسوٹ سے ہمیں اس طرح شکنجے میں جکڑ لیا کہ ملک کے مالک ہو کر بھی ہم برطانیہ سے آئے ہوئے تاجروں کے دست نگر ہو گئے۔ انگریز دو ڈھائی سو برس کی تجارت سے آخر کار تختِ حکومت تک پہنچے اور بقول ہمارے ایک فاضل مؤرخ کے "تاجری" "تاج وری" بن گئی۔ اس تاریخی عمل کی تفصیلات افسانے کی طرح دل چسپ ہیں اور متعدد اچھی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

خواتین و حضرات، میرا مقصود اس وقت صرف یہ ہے کہ تجارت میں اپنے قومی عروج و زوال کی کہانی آپ کو مختصر طور پر سنا دوں۔ اس کہانی کا مبارک آغاز، جیسا میں نے ابھی عرض کیا تھا، جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کی اپنی زندگی تجارتی کاروبار سے شروع ہوئی تھی اور ہجرت کے بعد "مدینے کی تجارتی جمہوریت کی فضا میں" حضورؐ نے بدستور تجارت کے پیشے کی ہمّت افزائی کی۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کون سی کمائی پاکیزہ ترین ہے؟ ارشاد ہوا: "مرد کا اپنے ہاتھ سے کام، اور ہر قسم کی نیک تجارت"۔ آپؐ کی ایک اور

حدیث ہے : ''قیامت کے دن دیانت دار ، سچّا ، مسلم سوداگر شہدا کے ساتھ اٹھایا جائے گا'' ۔ اِس حدیث کی روشنی میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں : ''سوداگر کی منڈی اس کے لیے میدانِ جہاد ہے جہاں وہ اپنے ہم جنسوں سے معاملہ کرتے وقت اپنے نفس کے خلاف جنگ میں مصروف ہوتا ہے[۱] ۔'' یہ ہے وہ اسلام جو خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم پر منکشف فرمایا اور جس کی شرح بزرگانِ سلف نے ہمارے لیے بار بار کی ۔ اِس ذکر سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ صرف ہماری تجارت کا زوال ہم پر حکومت کے زوال کی صورت میں ظاہر ہؤا ۔ کئی اور اسباب تھے جن میں زوالِ سیرت کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ مشرقِ قریب کے مسلمانوں نے تجارت پر توجہ کی مگر یہ مسلّم ہے کہ صرف صاحبِ تجارت ہونا انسان کو صاحبِ سیرت نہیں بناتا ۔ بہر کیف اس موقع پر ہمیں پورے عالمِ اسلام کے ہبوط و زوال کے اسباب سے بحث نہیں ہے ۔ اِس وقت مجھے صرف پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ سے سروکار ہے ۔ اِس تاریخ کا ایک نمایاں پہلو مجھے یوں نظر آتا ہے کہ ہم نے شروع ہی سے اپنے آپ کو ایک ایسی اونچی جاتی قرار دے لیا جو تجارتی کاروبار سے بلند و برتر تھی ۔ پاکستان و ہند کے مسلمانوں کا دربار داری اور جاگیر داری کے نظام سے بہ دل و جان وابستہ ہو جانا اور درباری یا فوجی ملازمت کو اپنا مطمح نظر بنا لینا اور کسی طرح سے سمجھ میں نہیں آتا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب تک ہم خوش حال اور آزاد دکان دار بننے پر وردی پوش سپاہی یا وردی پوش کانسٹبل یا وردی پوش چپراسی ہونے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ ہمارا دوسرا محبوب مشغلہ اپنی جاگیر یا زمینداری پر براجتے رہنا اور اپنے کسانوں سے کام لیتے رہنا تھا ۔ اس طرح کسان کا احترام تو

۱۔ ''اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ'' ، جلد ششم ۔

خود بخود برباد ہو گیا لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ ہم نے سارے کا سارا بیوپار بھی غیر مسلموں کے سپرد کر دیا - (''یارو ، لعنت بھیجو بنیے پن پر !'') -

الغرض ، خواتین و حضرات ، جس وقت انگریزوں نے اپنے تجارتی کارخانوں سے نکل کر حکومت کے کارخانے پر دھاوا بولا تو آپ اندازہ کیجیے کہ پاکستان و ہند کے مسلمانوں پر کیسی قیامت کی گھڑی آئی - ہمارا بنیادی پیشہ تھا شاہی دربار سے وابستہ رہنا - درباری ملازمت ، فوجی ملازمت ، جاگیر داری و زمینداری ، یہ تینوں مشغلے زوالِ حکومت کے ساتھ ایک دم ختم ہو گئے - ہمارے نئے آقاؤں نے بھی نئی درباری ملازمت ، نئی فوجی ملازمت ، نئی جاگیر اور نئی زمینداری کا نظام قائم کیا - لیکن اس نئے نظام سے پوری مسلمان قوم کا بھلا نہیں ہو سکتا تھا - نئی سرکاری ملازمتوں پر ہندو خود بخود قابض ہو گئے اور شروع شروع میں تو یہ حال رہا کہ انگریزی دفاتر کے اندر ہم میں سے کسی کے پاؤں جمنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا ، کیونکہ انگریزی سے ، جو دفتری زبان تھی ، ہم کورے تھے - جب یہ صورت پیش آئی تو ہم میں سے بعض کو اسلامی نظام کا اصولِ تجارت یاد آیا جس پر عمل پیرا ہونے کے لیے انگریزی دانی اشد ضروری معلوم نہیں ہوتی تھی - مگر تجارت پر ہمارے انگریز حکمران ، اور ان سے بھی پہلے ہمارے ہندو ہم وطن ، صدیوں سے قابض ہو چکے تھے - اس کے علاوہ نئی دنیا میں نئے اصولِ تجارت ایک تو اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب سے اور دوسرے ، بنکاری کے نئے طریقوں سے منسلک ہو گئے تھے اور یہ ہمارے بس کا روگ نہ تھا -

جناب والا ، خواتین و حضرات ، اس مہینے پاکستان کو ایک محکم اسلامی و جمہوری آئین نصیب ہوا جس میں زمانۂ حال کی مقتضیات کو پورا کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے - اب وقت آگیا

ہے کہ ہم قرونِ اولیٰ کے اسلام کے اصلِ اصول کو از سرِ نو زندہ کریں، اس طرح کہ دورِ حاضر نے معاش و معاشرت کے جو نئے مسائل پیدا کیے ہیں ان کا حل احکامِ قرآن مجید اور آسوۂ رسولِ اکرمؐ کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی لازم ہے کہ ہم تاریخ کا یہ سبق یاد رکھیں کہ آزاد اور مستحکم قومی حکومت کے قیام کا پہلا قدم لازماً یہ ہے کہ پوری قوم کو تجارت میں ہر سطح پر غلبہ حاصل ہو۔ یاد رکھیے کہ تجارتی اور صنعتی ترقی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ان دونوں شعبوں میں اپج، دن رات کی محنت، اصول و قواعد کی پابندی اور نیّت و عمل کی راستی میں سے ہر ایک بجائے خود ایک ناگزیر شرط ہے۔ چاروں مذکورہ عناصر میں سے کسی ایک کو غائب کیجیے تو صورتِ حال دگرگوں ہونے لگے گی۔ اپج نہ ہو تو محنت بےکار ہے اور اگر اپج کے ساتھ محنت ہے مگر پابندیٔ اصول و قواعد اور راستیٔ نیّت و عمل نہیں ہے تو بھی کامیابی امرِ محال رہے گی۔

جناب والا! آپ نے اپنے کالج اور طلبہ کی بہبود کے لیے متعدّد عمدہ تجاویز پیش فرمائی ہیں۔ ان میں سے اکثر مجھے بہت مفید اور قابلِ عمل معلوم ہوئی ہیں اور بعض کو عملی صورت دینے سے پہلے آپ اور آپ کے اہلِ فکر و نظر رفقا شاید مزید غور پسند فرمائیں تاکہ ان کی تمام تفصیلات بہتر سے بہتر طریقے پر مرتّب ہو سکیں۔ کالج کا نیو کیمپس میں منتقل ہونا ایک بنیادی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ وائس چانسلر صاحب اِس میں آپ کو پوری مدد دیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مالی مشکلات کے باعث نیو کیمپس میں یونیورسٹی کے مجوّزہ خاکے کے صرف چھٹے حصے کی تعمیر ابھی تک عمل میں آ سکی ہے۔ تاہم یہ اطلاع باعثِ اطمینان ہے کہ باقی ماندہ عمارتوں میں آپ کے کالج کی تعمیر کو اوّلیت دی جا رہی ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ

اہم کالج کے طلبہ کے روزگار کا مسئلہ ہے۔ تعلیم کا معیار ضرور بلند ہونا چاہیے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہ مسئلہ محض معیارِ تعلیم کی بلندی سے نہیں بلکہ ملک میں معیشت کا معیار بلند کرنے سے حل ہوگا۔ یہ صورتِ حال پیدا کرنے کے لیے مجھے اور آپ کو اور مزدور سے لے کر سرکاری افسر تک کو، دن رات کام کرنا اور ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگانا ہوگا۔

میرے آپ کے کام کرنے کی صورت تو وہی ہے جو آپ نے خود تجویز فرمائی، یعنی معیارِ تعلیم کی اصلاح و ترقی کی کوشش۔ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان میں ہم لوگ ایک تاریخی عمل کی مجبوریوں کے ماتحت گزشتہ چند صدیوں میں معاملات اور حقائق کی دنیا سے دور تر ہوتے چلے گئے اور تعلیم کے نظریاتی اور خیالی پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگے۔ حقیقی زندگی کا ایک ایسا نظام جس کی سائنسی ترتیب پر ہمیں بھی نئے انسان کی فاتحانہ بصیرت حاصل ہو، ہمارے لیے اِس عہد کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ نصف صدی پہلے خود علامہؒ اقبال نے، جن کی پینتیسویں برسی ہم اس مہینے منا رہے ہیں، ہمیں بار بار تنبیہ کی تھی کہ واقعات کی دنیا سے سائنسی تعلق پیدا کیے بغیر ہمارے مرض کا علاج ممکن نہیں رہا۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں ابلیس کی سازش مردِ مومن کے خلاف صرف یہ ہے کہ زندگی کی حقیقتیں اُس کی نظر سے چھپی رہیں، کیونکہ دنیا سے مسلمانوں کی اِسی علیٰحدگی میں طاغوتی قوّتوں کی فتح مضمر ہے:

ہے وہی شعر و تصوّف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اور

مست رکھّو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

میرے نوجوان دوستو اور عزیزو ، یہی غیر سائنسی طرزِ فکر ، جسے اقبال نے ''مزاجِ خانقاہی'' کہا ہے ، آپ کو اپنی ہمت و تدبیر سے بالکل بدل دینا ہے ۔ پاکستان کے پہلے پچیس برس بڑے کرب و عذاب میں بسر ہوئے ہیں ۔ اب بھی ہماری سب مشکلات حل نہیں ہو گئیں ۔ ہمارا مستقبل ہم سب سے عظیم اور عظیم تر قربانیوں کی طلب کرتا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ پرانی نسل کے لوگوں نے ملک و ملت کی راہ میں جان کی قربانی سے دریغ نہ کیا ۔ لیکن ایک بے کار اور فرسودہ جان کی قربانی کیا چیز ہے ؟ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ پاکستان پر اپنی جان نہیں ، جوانی نچھاور کر سکتے ہیں ۔ اب ہماری سب اُمیدیں نوجوان نسل کی صحیح حرکتِ حیات سے وابستہ ہیں ۔ ہماری قوم کی آیندہ زندگی آپ کی زندگی ہے ۔ اٹھیے اور اپنا کام شروع کیجیے ۔ خدا آپ کے بازوؤں میں قوت ، دماغوں میں روشنی ، اور دلوں میں ایمان کی وہ حرارت پیدا کرے جس کے ممکناتِ تعمیر مشیتِ الٰہی کے ممکناتِ تعمیر ثابت ہوں ۔

☆ ☆ ☆

centre—perhaps, to this very port town of Khulna—the old glory of Sunargaon from where, five centuries ago, ships laden with rich merchandise used to sail to Arabia and Egypt on the one side and to the islands of Indonesia on the other. Geography puts you at the centre of the world of Islam. Let me express a hope that with your diligence and constructive effort you win for the country the place of honour which geography has already bestowed on it. So go ahead. May your lives be worthy of the best and noblest traditions of our people !

☆ ☆ ☆

I have already mentioned in some detail the intrusions on university autonomy which must result from the coercive activities of militant student groups. I must here seek permission most respectfully to invite the attention of my friends of the university faculty that they, more than anybody else, should be the protectors of freedom of intellect and academic speech within the precincts of educational institutions. Their conduct should be at once an example and a guarantee of the autonomous position of an academy where men teach and learn.

Ladies and gentlemen, the educational process is a process of co-operation between the teacher and the taught. It is in fact a joint effort, both teacher and student striving to reach the same goal from different ends. Plato said that the ultimate aim of education is insight into the harmonious order of the whole world. This insight into a harmonious order never comes about unless a complete—and affectionate—understanding is established between him who teaches and him who learns. Unfortunately, students and teachers have openly drifted apart in recent times. This is a great tragedy, a negation of the educational process, and the introduction of a new caste system in the academic life of the country—the student caste ganging up against the teachers, and the teacher caste holding themselves aloof from the students. This is an unnatural situation. The educational process cannot take effect without mutual esteem between teacher and student. The responsibility to fill this great breach, if I may presume to say so, rests squarely with the teaching fraternity.

To those who have graduated today and to those who have been awarded prizes and medals I offer my congratulations, and my good wishes for many more, and greater, successes in future. Whatever position you occupy in life, you will have great opportunities to be of service to your country. As writers, you could recreate in words the loveliness of the green stretches of this beautiful landscape of yours. As scholars and teachers you could bring back the golden prime of your great *ulema* and saints and artists. As businessmen, you could restore to some new

what have *we* got? Our resort to militant disapproval only damages or destroys what little we possess.

May I submit, Mr Vice-Chancellor, that my only concern here is with the proprieties of educational life, not with the pros and cons of political and industrial issues. I am neither qualified to speak on those subjects, nor is such a reference relevant to my present thesis, which is to convince this enlightened assembly that the contagious use of Western methods of industrial protest in or around our own colleges and univerities is a *reductio ad absurdum* of our present position in history. We have suffered terribly for almost two centuries, ever since Clive established, after the battle of Plassey, his incredibly uncivilized "administration", to work the planned ruination of our people in the territories which had fallen under the sway of the East India Company. Hence the need to build, and build as well and as quickly as we can. And who will do this better than our intellectuals—our teachers and our university graduates, such as those who are going out of these portals today to make a worthy citizenry true to our highest ideals?

After national security and solidarity the most important objective for us now is to build up a suitable system of education. A lot more attention to this nation-building activity has become increasingly necessary with the passage of the years since Independence. More than ever before has it now become clear that it is futile to think of development without concentrating on educational effort and guarding education against inroads of a non-academic nature. In recent months there has been a great deal of talk on the subject of "university autonomy". It is generally assumed that the only threat worth consideration is bureaucratic interference. What is ignored is the possibility that the university community themselves may throw away the provisions of the charter which brought them together. For, unless teachers and students honour the provisions of this charter in word and deed, it is too much to expect that members of the public and the bureaucracy will treat these provisions with any more consideration.

elementary needs of life at home which, at least, are no handicap in Bonn or Los Angeles. Thus, our young men have a double commitment to moral duty, on the domestic as well as the international plane. Setting things right at home may look easy, but it is not really that easy, particularly when we mix this domestic exercise with a revolt of conscience against international immorality. The two evils call for very different remedies. No amount of confusing the one with the other will help. This confusion is the bane of student strategy in practically all Asian universities.

Ladies and gentlemen, I hope I give no offence if I say that in borrowing our academic methodology from the West, and borrowing it lock, stock and barrel, we have resorted to anticipatory use of certain sociological techniques which did not ripen even in the West except after more than two hundred years of industrial development and economic expansion. Trade union activities among university communities of the West are a natural consequence of historical processes already experienced by Europe and America. I mean to say that sit-in strikes, demonstrations of student power, and the like, are the logical aftermath of a capitalist organization of society. On our part, imitative action along these lines is, to say the least, inconsistent with the dialectic of history. Without having accumulated and exploited huge reservoirs of money, human energy and raw material *through individual enterprise*, we jump to a species of behaviour which only capitalist society at its peak asks for. Violent protest and sabotage might in that event act as a deterrent or a social restorative; capitalist society suffers these shocks and still retains its identity. Our case appears to me to be widely different. We have not traversed the various stages of development—technological and economic—which the Western nations have gone through for at least two hundred years. They have an overflowing abundance of academic resources—libraries, laboratories, printing presses and other equipment—and, what is more, relatively inexhaustible funds to maintain teachers and students. On the other hand,

an invitation and a challenge. Our social structure is infested with iniquities which cry for remedial action. We are face to face with ignorance and illiteracy, prejudice and egotism, a sad dearth of candour and integrity a most unfair distribution of wealth, and a host of other ills — each one of them a gross deviation from the path of Islam. I may add, however, that in spite of our many lapses we are not the worst offenders among the nations of the earth. The most disturbing feature of the contemporary human situation is the way injustice and wickedness have become world-wide phenomena, utter selfishness making itself manifest in international forums. For the younger generation this has meant disillusionment and unmitigated frustration. The universal indignation of youth is evidenced by world-wide demonstrations and a show of student power unknown to the history of civilization. There must be a good explanation for this unprecedented state of affairs. Possibly, the evolution of man's moral sense has not kept pace with development of the means of publicity and all-round intercommunication. The whole world washing its dirty linen in public is certainly not an inspiring sight—except in a negative sense.

Be that as it may, the unrest in the universities of the world has had its peculiar impact on students in our own universities. Thousands of our young men, no less sensitive than young men in the universities of America, of the United Kingdom, of France and of West Germany and West Berlin, are deeply disturbed. Their impatience of moral evil, of political injustice and of economic exploitation, is as genuine as that of any set of young men anywhere in the world. Notwithstanding this community of idealism, our own youth are at a disadvantage as compared to their Western counterparts. The student of the Western world is moved to a generous indignation against international wickedness; his own stake in the protest is not personal, but nobly idealistic and broadly human. So, indeed, is that of our young men. Our young men, however, shoulder a heavier burden inasmuch as they often lack the essential means to satisfy the

of Buddhism. Centuries later, when Islam appeared on the scene, these two ends of the sub-continent turned instinctively to the new light. The affirmation of Islam, all through the Middle Ages, by races so far separated as the people of Sind and Kashmir in the west and of Bengal in the east, has an especial significance for a comparative study of the functioning of the human mind. One could say, perhaps, that the people of Sind, and of the rest of West Pakistan, are Muslims partly because of proximity to the lands of Islam. But the conversion of such a large part of the population in remote Bengal could not have come about except through an intense spiritual preference. And when, early in the last century, Sayyid Ahmad Shahid led his *Mujahidin* against the oppressive rule of the Sikhs in the north-west frontier of the sub-continent, where do you think did massive support for the unhappy people of Peshawar region come from? Not from next-door Afghanistan but, willingly and in generous measure, from far-away Bengal. It is a fact of history that a very large number of volunteers, in spite of the intervening arduous and heart-breaking journey, came for *Jihad* from *this* part of Pakistan.

We are not, however, concerned at this time with an analysis of the past. This is an occasion when we look hopefully to the future. We have assembled today in a mood of joy and confidence to bid godspeed to a new generation of bright young men and women who go forth, fearless and unperplexed, to build a new life according to a new vision—to mend what is broken, cleanse what is impure, and straighten what has gone awry. A university convocation is always a moment of glory, for it is in the course of such a ceremony that all the strength of purpose in man—or woman—finds vent in noble conception and high resolve. I am, therefore, most grateful to have been granted the opportunity to be among you on this auspicious and forward-looking occasion.

Mr Vice-Chancellor, never before, I believe, have our youth found ampler scope for the exercise of moral and intellectual excellence. With all its glaring evils, the scene around is at once

Convocation Address
at the
University of Rajshahi

(Khulna, 25 January 1970)

Mr Vice-Chancellor,* Members of the University Faculty, Graduates of the Year, Ladies & Gentlemen,

May I begin by saying that the gracious terms in which I have been introduced at this function are visibly tilted towards affectionate exaggeration? But I see I must accept in profound humility and gratitude whatever has come from the pure goodness of your heart.

When your kind invitation to address this Convocation reached me on New-Year's day I accepted without a moment's hesitation, partly because it conferred an honour which I least expected after my retirement from the field of education. Mainly, however, I was impelled by a sheer thirst of the spirit to be with you—the other part of the family, who have always been the dearer for the intervening distance of hundreds and hundreds of miles. Please do not think that this talk of a family tie is fanciful or merely sentimental. Between the people of the eastern and western Wings of this country there exists a substantive psychological kinship whose roots lie deep in the past. Consider the wide-spread appeal of humanitarian and protestant ideas again and again in history to the population of these two—and particularly of these two—remote areas of our sub-continent. More than two thousand years ago we accepted as if by concerted action the world-view propounded by the Buddha, and both Wings of what is now Pakistan became strongholds

---

*Dr. Syed Sajjad Husain.

اشاریہ

Convocation Address
to the
University of Rajshahi

(Dacca, 22 January 1959)

Mr Vice-Chancellor,* Members of the University Faculty, Graduates of the Year, Ladies & Gentlemen,

May I begin by saying that the introductions [illegible] to which I have been introduced at this function are surely tilted towards affectionate exaggeration; but I say I must accept in profound humility and gratitude whatever has come from the kind goodness of your heart.

When you kind invitation to address this Convocation reached me on New Year's day I accepted without a moment's hesitation; partly because it conferred an honour which I have [illegible] of my retirement from the field of education. Mainly, because I was touched by a sweet thrill of the spirit to be with [illegible] of other part of the family, who have always been the [illegible] for the [illegible] of hundreds and hundreds of [illegible] this talk of a family [illegible] sentimental. Between the people of the eastern and western Wings of this country there exists a substantive psychological kinship whose roots lie deep in the past. Consider the [illegible] of [illegible] and [illegible] for the population of [illegible] two—and particularly of [illegible] remote areas of our sub-continent. More than two thousand years ago we accepted as if [illegible] by the [illegible], and both Wings of what is now Pakistan [illegible]

* By Syed [illegible]

الف

ب

ت

تاریخ :

تاریخِ انسانی :

ٹ

ث

ج

ڈ

ذ

ژ

س

ق

ک

☆ ☆ ☆